زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

جلد ۔ ۱۳ شمارہ ۔ ۳۵۔۳۸

جولائی ۲۰۲۵ء تا جون ۲۰۲۶ء

مدیر اعزازی
اقبال حسن آزاد

مدیر
ثالث آفاق صالح

نائب مدیرہ : نشاط پروین

تزئین کار: اعجاز رحمانی

سرورق: محمد نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003-8210498674
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

	اداریہ	اقبال حسن آزاد	۴
	حمد	ارشد عبدالحمید	۸
	نعت	//	۹
خـــــراج	یہ بشیر بدر کا شعر ہے	//	۱۰
عقیدت			
	بشیر بدر کی منتخب غزلیں	ادارہ	۱۴
غزلیں	سید انور جاوید ہاشمی، دلشاد نظمی، ڈاکٹر ذکی طارق		۱۶۔۲۱
نظمیں	شاہ دولہ کے چوہے	دلشاد نظمی	۲۲
	سن رہے ہو	//	۲۳
	پیر صاحب	//	۲۴
	انتظار	//	۲۶
	دخمہ	//	۲۸
دوہے	دوہے	شاہد جمیل	۲۹
افسانے	بے چہرگی کا نوحہ	یوسف عزیز زاہد	۳۲
	نیم کے سائے میں	ڈاکٹر خالدہ نسیم	۴۱
	دھن پریت ساڈے	سبین علی	۵۲
	سپریم لیڈر کا جوتا	اشعر نجمی	۵۹
	عبرت سرا	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی	۶۵
	آخری امید	نشاط پروین	۶۸
	بلڈوز رجسٹس	اقبال حسن آزاد	۷۰
مضامین	'بلڈوز رجسٹس' پانچ افسانچے ایک تجزیہ	پروفیسر علی رفاد فتیحی	۷۷
	انیس الرحمٰن: اردو شاعری کے انگریزی مترجم......	پروفیسر صفدر امام قادری	۸۶

ثالث

	سعادت حسن منٹو کی خاکہ نگاری	ڈاکٹر قسیم اختر	۱۰۵
	اقبال کا تصور امن	غلام علی اخضر	۱۱۲
	شاہد جمیل کی دوہا نگاری پر ایک نظر	منظور پروانہ	۱۱۹
	اقبال حسن آزاد کے افسانوں کا تخلیقی نظام	سلیم انصاری	۱۲۶
	اقبال حسن آزاد: ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت	نسترن احسن فتیحی	۱۳۲
	شبیر احمد کا ناول: جگ بانی	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی	۱۳۹
	احمد فراز کی غزل کلاسیکی رنگ میں جدید احساس	ڈاکٹر ریشا قمر	۱۴۴
گوشہ	مولانا منت اللہ رحمانیؒ: شخصیت و خدمات	شگفتہ جبیں	۱۵۰
ریسرچ اسکالر	اقبال مجید کی افسانہ نگاری	محمد جیمی	۱۵۵
	جوگندر پال کے افسانوں میں تہذیبی شناخت کی تلاش	بادل بھگت	۱۶۲
تبصرے	انوار عشق	مبصر: اقبال حسن آزاد	۱۷۳
	انجیر کا پھول	//	۱۷۵
	صدیوں کا رقص	//	۱۷۷
	شاہد جمیل: مکالمے اور بازگشت	//	۱۷۹
	زبان و بیان	//	۱۸۱
	سہ ماہی سیما	//	۱۸۳
	جہان اردو	//	۱۸۶
	صوتیات کے اصول	//	۱۸۸
	انداز سخن	//	۱۸۹
ثالث پر تبصرے	ثناءاللہ ثنا دوگھروی، کوثر تسنیم، طارق شبنم، عظیم اللہ ہاشمی، منصور خوشتر، شاذیہ تبسم، خورشید اکرم سوز، اسلم رحمانی، سیفی سرونجی،		۱۹۱۔ ۲۱۴
مکتوبات	عبدالصمد، غضنفر، ارشد عبدالحمید، رویندر جوگلیکر، عشرت ظہیر، سید محمد یحیٰ ابراہیم، نوشاد احمد کریمی، ڈاکٹر رونق شہری، اسحاق اثر، مرغوب اثر فاطمی، طارق شبنم، ریشا قمر، عین تابش، فخر الدین عارفی		۲۱۵ ۲۲۴

اداریہ

عالمی انتشار، زبان وادب اور اردو رسائل کی اہمیت وافادیت

عصرِ حاضر بے یقینی، فکری انتشار، تہذیبی تصادم اور اخلاقی بحران کی ایسی گہری دھند میں لپٹا ہوا ہے جہاں انسان ترقی کی حیرت انگیز بلندیوں کو چھونے کے باوجود روحانی سکون، باہمی اعتماد اور انسانی اقدار سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں جنگ، نفرت، تعصب، مادّہ پرستی اور بے حسی کے بڑھتے ہوئے مظاہر اس حقیقت کے غماز ہیں کہ انسانی تہذیب ایک نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ ایسے پرآشوب ماحول میں زبان وادب محض اظہارِ خیال کا وسیلہ نہیں رہتے بلکہ انسانی ضمیر کی آواز، تہذیبی حافظے کی امانت اور امید و آگہی کے روشن چراغ بن جاتے ہیں۔ بالخصوص اردو زبان، اس کا کلاسیکی و جدید ادب، اور اس کے معیاری رسائل و جرائد آج بھی فکری بالیدگی، تہذیبی شناخت اور اخلاقی بیداری کے مؤثر علم بردار ہیں۔

زبان کسی بھی قوم کی شناخت، اس کی تہذیبی روایت اور اجتماعی شعور کی محافظ ہوتی ہے، جبکہ ادب انسان کے باطن میں اتر کر اس کے جذبات، تجربات، خوابوں اور اجتماعی احساسات کو معنی عطا کرتا ہے۔ ادب، محبت، رواداری، انصاف، اخوت، برداشت اور احترامِ آدمیت کی وہ شمع ہے جو ظلمت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی بجھنے نہیں پاتی۔ جب معاشرے نفرت، تشدد، انتہا پسندی اور عدمِ برداشت کی آندھیوں میں گھر جائیں تو ادب ہی انسان کو انسان رہنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اردو ادب کی پوری روایت اسی انسانی عظمت کی امین رہی ہے۔ علامہ اقبال نے خودی، حریتِ فکر اور بیداری کا درس دیا، فیض احمد فیض نے ظلم و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور پریم چند نے معاشرتی حقیقتوں کو فن کا موضوع بنا کر انسان دوستی اور سماجی انصاف کی نئی راہیں روشن کیں۔

اردو کے ادبی رسائل و جرائد اسی درخشاں روایت کے سب سے معتبر امین ہیں۔ ان کا کردار محض تخلیقات کی اشاعت تک محدود نہیں بلکہ وہ فکری مکالمے، علمی تحقیق، ادبی تنقید، تخلیقی رجحانات کی تشکیل

اور نئی نسل کی ادبی تربیت میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ، ناول، غزل، نظم، تحقیق، تنقید، انشائیہ، سفرنامہ اور دیگر اصنافِ ادب کی آبیاری میں ان رسائل کی خدمات تاریخ کا روشن باب ہیں۔ کتنے ہی معتبر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی ادبی شناخت کا پہلا قدم انہی صفحات پر رکھا اور پھر اردو ادب کے افق پر روشن ستاروں کی صورت جگمگائے۔

ادبی رسائل دراصل معاشرے کے فکری درجۂ حرارت کا پیمانہ بھی ہوتے ہیں۔ ان کے اداریے، تحقیقی مقالات، تنقیدی مضامین، تبصرے اور مکالمے قارئین میں تجزیاتی بصیرت، تنقیدی شعور اور فکری وسعت پیدا کرتے ہیں۔ یہی صفحات قومی، سماجی اور عالمی مسائل پر سنجیدہ غور و فکر کی روایت کو زندہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے کسی بھی زبان کی ادبی تاریخ کا بڑا حصہ رسائل و جرائد کے اوراق میں محفوظ رہتا ہے، جہاں آنے والی نسلیں اپنے عہد کی فکری اور تہذیبی نبض کو محسوس کر سکتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بجا فرمایا تھا:

''اخبار اور رسائل قوم کی ذہنی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔''

شبلی نعمانی کے نزدیک:

''قلم کی خدمت دراصل قوم کی خدمت ہے۔''

شمس الرحمن فاروقی کا خیال تھا:

''ادبی رسالہ صرف تخلیقات کا مجموعہ نہیں بلکہ نئے ادبی شعور کی تشکیل کا مؤثر وسیلہ ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق:

''ادبی رسائل کسی زبان کی ادبی تاریخ اور اس کے فکری ارتقا کے معتبر دستاویز ہوتے ہیں۔''

گوپی چند نارنگ نے بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا:

''ادبی رسائل نئے رجحانات کو فروغ دیتے ہیں اور تخلیقی ادب کو زندگی بخشتے ہیں۔''

آج جب ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل میڈیا نے ابلاغ کی رفتار کو بے مثال بنا دیا ہے، اطلاعات کا سیلاب ہر لمحہ ہمارے سامنے اُمڈ رہا ہے، مگر اس تیز رفتار ماحول میں سنجیدہ مطالعہ، گہرا تفکر اور معیاری تحریر پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ غیر مصدقہ معلومات، سطحی اظہار اور فوری ردِعمل کے اس عہد میں معیاری اردو رسائل اپنی علمی وقعت، تحقیقی معیار اور ادبی سنجیدگی کے باعث ایک معتبر حوالہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ متعدد ادبی رسائل نے طباعت کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل اشاعت کو بھی اختیار کیا ہے، جس کے نتیجے میں دنیا بھر کے قارئین تک ان کی رسائی ممکن ہوئی ہے۔

’’ثالث‘‘ بھی انہی باوقار ادبی جرائد میں شامل ہے جو روایت اور جدت کے حسین امتزاج کے ساتھ ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

اگر کتابیں کسی تہذیب کی یادداشت ہیں تو ادبی رسائل اس کی زندہ دھڑکن ہیں۔ جب تک یہ دھڑکن قائم ہے، اردو زبان وادب کی تخلیقی توانائی، فکری تازگی اور تہذیبی وقار بھی برقرار رہیں گے۔ اس لیے موجودہ پرآشوب دور میں معیاری اردو رسائل کی اشاعت محض ایک ادبی سرگرمی نہیں بلکہ ایک تہذیبی، علمی اور ثقافتی فریضہ ہے۔ یہی رسائل ہماری فکری روایت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرتے، زبان کی لطافت کو محفوظ رکھتے اور معاشرے میں شعور، مکالمے اور انسان دوستی کی فضا کو فروغ دیتے ہیں۔

تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج اردو رسائل مالی دشواریوں، اشتہارات کی قلت، مطالعے کے زوال، محدود قارئین، اشاعتی اخراجات میں اضافے اور ڈیجیٹل ذرائع کے غیر متوازن اثرات جیسے متعدد مسائل سے دوچار ہیں۔ ان حالات میں اہلِ قلم، ناشرین، قارئین، جامعات، ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ معیاری رسائل کی سرپرستی کریں، انہیں عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنائیں، نوجوان نسل میں مطالعے کی عادت پروان چڑھائیں اور ادبی صحافت کے اس قیمتی ورثے کو محفوظ رکھنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

آیئے! ہم سب اس تہذیبی ذمہ داری کا احساس کریں، معیاری اردو رسائل کی حوصلہ افزائی کریں اور اس روشن روایت کے تسلسل کو یقینی بنائیں، کیونکہ زبان کی بقا صرف الفاظ کی بقا نہیں، بلکہ ایک پوری تہذیب، اس کی فکر، اس کے خواب، اس کی شناخت اور اس کے اجتماعی حافظے کی بقا ہے۔

☆☆☆

امید ہے کہ یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔ آپ کی گراں قدر آرا کا منتظر رہوں گا۔

’’ثالث‘‘ کی ویب سائٹ کو دمِ تحریر چونسٹھ ہزار نو سو بتیس (۶۵۳۲۸) سے زائد بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر رسالے کے تمام شماروں کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

www.salismagazine.in

اس شمارے کی قیمت مبلغ ۲۵۰ ؍ہندوستانی روپے ہے جسے درج ذیل کیو آر کو اسکین کر کے بھیجا جا سکتا ہے یا درج ذیل بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے۔

UPI Handle - 9430667003@ptyes
Eqbal Hasan Azad
Punjab National Bank
A/c No. 0508010126991
IFSC - PUNB0050820

اقبال حسن آزاد کی کتابیں

قطرہ قطرہ احساس (افسانے) مردم گزیدہ (افسانے)

پورٹریٹ (افسانے)

نثری اصنافِ ادب اور طنز و مزاح کی روایت (تحقیق)

زیر طبع

اوس کے موتی (افسانے)

● ارشد عبدالحمید

حمد

آنکھیں ہیں تری نیند تری خواب ہیں تیرے
ان خوابوں کی تکمیل کے اسباب ہیں تیرے

مجذوب ہو صوفی ہو کہ دنیا کا طلبگار
ہے عشق ترا عشق کے آداب ہیں تیرے

پروانے کے سینے میں نہاں تیرے ہی خورشید
شمعوں میں جو روشن ہیں وہ مہتاب ہیں تیرے

گلشن بھی ہے تخلیق تری آتش گل بھی
سرد آہ تری آہ کے برفاب ہیں تیرے

تلواروں کی ہر دھار تری تیرے گلے ہیں
ہے حق بھی ترا ظلم کے ارباب ہیں تیرے

دشمن کے لبوں پر جو لہو ہے وہ تری دین
جو نذر شہادت ہیں وہ احباب ہیں تیرے

جو ہار گئے ان کی ہزیمت تری مرضی
جو جیت کے آئے وہ ظفریاب ہیں تیرے

دنیا بھی عطا تیری ہے اور صبر بھی تیرا
اصحاب سکوں تیرے ہیں بیتاب ہیں تیرے

جو کچھ بھی ہے دنیا میں وہ نیکی کہ بدی ہو
ہر رخ تری جانب سے ہے سب باب ہیں تیرے

مطلوب تو بس تیری رضا تیری رضا ہے
سب تیری مشیت ہے سب احزاب ہیں تیرے

ارشدؔ بھی ترا بندہ ہے اور اس کے بڑے بھی
ارزاں بھی ترے لوگ ہیں نایاب ہیں تیرے

◀◀ ● ▶▶

● ارشد عبدالحمید

نعت

نقش ظفر میں خانۂ نسبت بنا ہوا
آقاؐ کا نام نامی ہے رحمت بنا ہوا
ہے اسوۂ رسول قیادت بنا ہوا
شوق عمل ہے شوق اطاعت بنا ہوا
پھرتا ہے اتباع شریعت کے شہر میں
مجھ سا غریب صاحب ثروت بنا ہوا
امید روز حشر کی ہے آخری دوا
دست شفا ہے دست شفاعت بنا ہوا
دستار فیض ہے مرے سر پر سجی ہوئی
حکم حضورؐ ہے مری خلعت بنا ہوا
عصیاں کے ساتھ ساتھ پشیمانیاں بھی ہیں
آنسو بھی ہے ندیم ندامت بنا ہوا
جس دن سے بس گئی ہے عقیدت رسولؐ کی
ارشدؔ کا دل بھی جیسے ہے جنت بنا ہوا

◄◄ ● ►►

Plot No: 64 to 67
Firdos Nagar
Near Rajban
Tonk-304001(Rajasthan)
Mob:9079863942

● خراج عقیدت

● ارشد عبدالحمید

یہ بشیر بدر کا شعر ہے
(اسے مسکرا کے پڑھا کرو)

عین عیدالاضحیٰ کے دن ڈاکٹر بشیر بدر کا انتقال ہوگیا۔ رہے نام اللہ کا۔ ان کی شاعری سب کی طرح مجھے بھی پسند ہے لیکن ان کے بارے میں تعزیت کے بہانے بہت سے حضرات نے بعض منفی باتیں بھی کہیں۔ سوال یہ نہیں کہ وہ باتیں درست ہیں یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ مرنے والے کی اچھائیوں کو یاد کرنا ہمارا شیوہ ہے یا مرنے والے کی برائیاں کرنا ہماری تہذیب؟ اور ادبی محاسبے میں تو صرف اور صرف متن سے سروکار ہونا چاہیے، ماورائے متن کی کوئی تنقیدی اہمیت نہیں۔ ماورائے متن انھوں نے جو کچھ بھی کہا اور کیا ہو لیکن جب وہ اپنے آپ کو پروموٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے اسی اثنا میں انھوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ:

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے　　　کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

اور اسی شاعر نے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ:

ہزاروں شعر میرے سو گئے کاغذ کی قبروں میں　　　عجب ماں ہوں کوئی بچہ مرا زندہ نہیں رہتا

پھر وہ یہ بھی تو کہہ گئے ہیں کہ:

شہرت کی بلندی تو پل بھر کا تماشا ہے　　　جس شاخ پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

اس کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ شاعری میں شاعر کا داخلی سچ بول رہا ہے اور شاعری سے باہر کے بیانات ایک ماہر مینوپلیٹر کے بیانات ہیں جو ایک پروفیشنل ضرورت کے تحت دیے گئے ہیں۔ یہ باہر والا معاملہ خالصتاً کاروباری ہے۔ تنقیدی محاسبے سے اسے الگ رکھنا چاہیے۔

بشیر بدر کی مقبولیت کا زمانہ گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی سے شروع ہو کر آٹھویں اور نویں دہائی تک کا زمانہ ہے۔ یاد کریں یہی زمانہ مشہور فلم رائٹر سلیم اور جاوید کا بھی ہے۔ انھوں نے کیا کیا؟ جب فلم

رائٹر کو نہ پیسے ملتے تھے نہ عزت، سلیم جاوید نے اپنا واجب محنتانہ بھی وصول کیا اور عزت بھی کمائی۔ بشیر بدر نے بھی تو یہی کیا۔ آج اگر مشاعروں میں شعرا کو ہزاروں/ لاکھوں روپے ملتے ہیں تو اس کا کریڈٹ بشیر بدر کی ان کوششوں کو دیا جانا چاہیے جنھیں آج غیر مہذب کہا جا رہا ہے۔ بشیر بدر نے اپنے حق کا معاوضہ کسی اور کا کلام پڑھ کر یا اسٹیج پرفارمینس کے ذریعے وصول نہیں کیا بلکہ اپنے کلام کی مقبولیت کے دم پر کیا اور یہ حق وصولنے کے لیے انھوں نے اچھے یا خراب، جیسے بھی اور جتنے بھی ٹوٹکے آزمائے وہ سب اس کھیل کا حصہ ہیں جس کھیل میں آج کے پروفیشنل شاعر بشیر بدر سے میلوں آگے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے بشیر بدر کی شاعری کے متن سے باہر کی چیزوں میں بالکل دلچسپی نہیں۔ متن کے بارے میں ضرور عرض کروں گا لیکن اس سے پہلے ایک اور اہم بات......کیا مشاعرے میں مقبول ہو جانے سے شاعری کی اہمیت کم ہو جاتی ہے؟ یہ درست ہے کہ متشاعروں اور ڈرامہ بازوں نے اخبار کی سرخیوں کو موضوع بنا کر ایک نوع کی سپاٹ اور فوری شاعری کے ذریعے سامعین کے جذباتی پہلو کا فائدہ اٹھایا ہے اور اس طرح شعری فنکاری کو پس پشت ڈال دیا ہے......لیکن کیا سبھی شعرا کا یہی حال ہے؟ کم از کم آٹھویں نویں دہائی میں ایسا نہ تھا۔ شہریار ہوں یا ندا فاضلی، مخمور سعیدی ہوں یا محمد علوی یا پھر بشیر بدر......ان کی شاعری جتنی مشاعروں میں پسند کی جاتی تھی، اتنی ہی کاغذ پر بھی دلکش اور مؤثر نظر آتی تھی اور نظر آتی ہے۔ ایسے شعرا کو ''مشاعرے کا شاعر'' کہہ کر ٹال دینا ہمارے اپنے افلاس کی نشانی ہے۔

خیر......! ادبی سطح پر بشیر بدر کا شعری ارتقا بہت سے ادوار میں منقسم ہے۔ ایک دوران کے اولین دو مجموعوں ''اکائی'' اور ''امیج'' پر مشتمل ہے۔ دوسرا دوران کے سب سے مقبول مجموعے ''آمد'' کو محیط ہے اور اس کے بعد باقی کے تمام مجموعوں کا نمبر آتا ہے۔ یہ تقسیم اس لیے کہ ''امیج'' تک ان کا کلام لسانی اور موضوعاتی تجربات کے لیے سازگار نظر آتا ہے جب کہ بعد کا کلام بھی بیشک پرکشش ہے لیکن اپنے آخری دور کے بشیر بدر ڈکشن اور موضوعات کی جدت طرازی کی جگہ یا تو ہر بات کو رومان پرور بنا رہے ہیں یا پھر ٹین ایجر/ نوجوانوں کے احساسات کو مرکز میں رکھے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی جرم نہیں۔ بس اتنا ضرور ہوا ہے کہ شاعر کا فکری اور تخلیقی ارتقا کمزور ہو گیا ہے۔ بشیر بدر کی تخلیقیت کا بنیادی کمال ''آمد'' سے بھی قبل ''اکائی'' اور ''امیج'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ''اکائی'' کی اشاعت نومبر، ۱۹۶۹ء میں ہوئی اور ''امیج'' جولائی، 1973ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ''کائی'' سے ماخوذ ان اشعار کو دیکھیں:

تا حد نظر شہر خموشاں کے نشاں ہیں　　　اللہ مسافر کی کہاں شام ہوئی ہے
جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادر اب　　　دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمہاری طرح

پھول دوا جیسے مہکے ہیں
کسی بیمار کی صبح ہوئی ہے

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

خوب صورت ، اداس ، خوف زدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

کیا زندگی ہماری گلی تک بھی آئی تھی
یہ گیسوؤں کے پھول یہ نقش قدم کا چاند

ہمارے بھی ہیں لوگ ایوان میں
مگر پھول کاغذ کے گلدان میں

اس کی اردو میں بھی اب کے مغربی لہجہ ملا
کالے بالوں کی بھی رنگت زعفرانی گئی

اب ذرا 'امیج' کے بھی چند اشعار دیکھ لیں:

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذات خود آواز کا صحرا ہے

وہ نہیں ہے تو اس کی آس رہے
ایک جائے تو ایک پاس رہے

بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام نے اٹھ کے بتی جلائی نہیں
روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا
گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

اپنے ہی مرچے پودینے سوکھ گئے
ورنہ دنیا میں ماش کی دال تو اب بھی ہے

اشعار بہت ہیں لیکن کسی مختصر سی تحریر کے لیے یہ بھی کافی ہیں۔ ان اشعار میں وہ بشیر بدر کم ہی نظر آئیں گے جو اس طرح کے اشعار کے ذریعے مقبول ہیں:

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

پڑھائی لکھائی کا موسم کہاں
کتابوں میں خط آنے جانے لگے

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑا دے شراب کم کر دے

یہاں ان اشعار کو نقل کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بعد کے دور میں انھوں نے خراب شاعری کی یا مقبولیت حاصل کر لینا کوئی عیب ہے۔ اصل بات وہ تخلیقی ارتقا ہے جو عمر اور مشق کے ساتھ آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بشیر بدر نے مشاعرے کی ڈیمانڈ کو اپنے طریقے سے پورا کیا۔ مثلاً ہر چیز کو

رومانیت کے قالب میں ڈھال دینا اسی ''اپنے طریقے'' کا ثبوت ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ رومانیت تو اور بہت سے شعرا کے کلام میں ہے۔ اصل میں بشیر بدر کی خصوصیت کیفیت سازی میں ہے اور اس کیفیت سازی میں پیکر نگاری یعنی امیجری ان کا سب سے کامیاب حربہ ہے۔ مشاعروں میں بہت مقبول ان کا یہ شعر دیکھیے:

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا ۔۔۔ یہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

دوسرا مصرع اس قدر قابل قبول اس لیے ہے کہ پہلے مصرع سے اس کی نہایت خوبصورت دلیل فراہم ہوتی ہے۔ پھول کا دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہونا......ایک ایسی امیج ہے جس کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ ایک اور شعر سے ان کی امیجری کا اندازہ کریں:

اجالوں کی پریاں نہانے لگیں ۔۔۔ ندی گنگنائی خیالات کی

کیفیت سازی کے لیے موضوعاتی سطح پر بشیر صاحب نے جس حربے کو بخوبی اپنایا وہ متوسط طبقے کی اخلاقیات ہے۔ وہ اقداری نظام جو متوسط گھرانوں کے لیے آدرش تو تھا لیکن جس کی دیواریں ہلنے لگی تھیں، اس کا استعمال انھوں نے خوب کیا:

اسی شہر میں کئی سال سے مرے کچھ قریبی عزیز ہیں ۔۔۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں انھیں میرا کوئی پتا نہیں

میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے ۔۔۔ چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے ۔۔۔ اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

سر پہ سایہ سا دست دعا یاد ہے ۔۔۔ اپنے آنگن میں اک پیڑ تھا یاد ہے

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں ۔۔۔ تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

شام تک کتنے ہاتھوں سے گزروں گا میں ۔۔۔ چائے خانے میں اردو کے اخبار سا

اسی طرح کے متعدد اشعار ہیں جو کیفیت سازی میں متوسط طبقے کی اخلاقیات اور معاشرتی صورت حال کو مرکز میں رکھ کر بنائے گئے ہیں۔

بشیر بدر مرحوم اپنی شاعری کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کی وہ شاعری جو 'اکائی' اور 'امیج' میں ہے، وہ یقیناً قابل قدر ہے اور اس میں بھی بہت سی اچھائیاں ہیں جو عوام وخواص میں یکساں اور بجا طور پر مقبول ہے۔ جدید غزلیہ لفظیات، رومانیت، متوسط طبقے کے جذباتی مسائل، پیکر نگاری اور کیفیت سازی کو اپنے طور پر برتنا وہ خصوصیات ہیں جو بشیر بدر کو ہمیشہ معروف ومقبول بنائے رکھیں گی۔

◄● ►

● بشیر بدر

غزل

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

یاروں کی محبت کا یقیں کر لیا میں نے
پھولوں میں چھپایا ہوا خنجر نہیں دیکھا

محبوب کا گھر ہو کہ بزرگوں کی زمینیں
جو چھوڑ دیا پھر اسے مڑ کر نہیں دیکھا

خط ایسا لکھا ہے کہ نگینے سے جڑے ہیں
وہ ہاتھ کہ جس نے کوئی زیور نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

یوں ہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر میں رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلہ سے ملا کرو

ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمہیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دعا کرو

مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو جو سنا نہیں وہ کہا کرو

کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں مرے ساتھ تم بھی چلا کرو

نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمیٔ شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو

یہ خزاں کی زرد سی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

● بشیر بدر

غزل

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

اجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی خیالات کی

میں چپ تھا تو چلتی ہوا رک گئی
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی

مقدر مری چشم پر آب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

غلامی کو برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

● سید انور جاوید ہاشمی

غزل

جو محوِ خواب تھے وہ بھی جگا لیے گئے ہیں
بجائے حسرتِ تعبیرِ دل چرا لیے گئے ہیں

اب انتظار فقط من کا اور سلویٰ کا ہے
نصیب وار نوالے تو کھا لیے گئے ہیں

نہ آہِ سر د کا فقدان ہے نہ تنگیٔ لب
پہ دلِ خراشی میں نالے دبا لیے گئے ہیں

زمینِ شعر پہ یاروں نے قبضہ خوب کیا
سو ہم بھی فن کے تناسب سے جائے لیے گئے ہیں

بتاؤ دوستو ترکیب اب ہمیں بھی نئی
سخن کے حربے سبھی آزما لیے گئے ہیں

دکان شہرِ ہنر میں ہے جس کی سب سے الگ
اسی حکیم سے ہم بھی دوا لیے گئے ہیں

◂◂ ● ▸▸

Flat No. : B-301
Al Amna Avenue, 7D/1
North Karanchi (Pakistan)

● دلشاد نظمی

غزل

پرانی تصویروں کی جوانی دکھا کے بیمار ہو رہے ہیں
بدن پہ رنگِ انا کو مل کر زوال آثار ہو رہے ہیں
میں خود کو گمنام رکھ کے چاہوں گا عمر بھر منفرد ہی رہنا
یہاں بہت سارے سستی شہرت کی چاہ میں خوار ہو رہے ہیں
انہیں خبر ہی نہیں ہے اس راہ میں ہیں قربانیاں ضروری
جو عشق کا چاہتے ہیں حاصل وہی گنہگار ہو رہے ہیں
ہر اک قبیلے پہ نا امیدی کی ایک جیسی ہے دھند طاری
یہاں سیاست کی شہہ پہ مشہور خسرے سردار ہو رہے ہیں
تمام تفریق مٹ چکی ہیں ضرورتیں بیچتی ہیں سودا
مکانوں کے آگے ہیں دکانیں، محلے بازار ہو رہے ہیں
میں اپنی حیرت زدہ نگاہوں سے ان کے اطوار دیکھتا ہوں
جنہوں نے آنکھیں بچھائی رستے میں، اب وہ دیوار ہو رہے ہیں
ہزار تقریریں سن کے راتوں کو کالا کرنے سے فائدہ کیا؟
عمل سے بھی واقعی یہ ثابت کریں کہ بیدار ہو رہے ہیں
امید جن سے تھی باندھی وہ رہنما صریحاً بدل چکے ہیں
مصاحبی والا طوق پہنے، رہینِ دربار ہو رہے ہیں
کدورتوں کو مٹاؤ دو دلشاد وقت یہ اتحاد کا ہے
سفر کرو قافلے کی صورت کہ رستے دشوار ہو رہے ہیں

● **دلشاد نظمی**

غزل

قسمیں کھا کھا کر سبھی بیعت کی حامی بھر رہے ہیں
پھر مجھے کوئی صفت کچھ لوگ مدعو کر رہے ہیں

بھیڑ کی تہذیب کو آتی نہیں ہے جاں نثاری
جو شہادت دیتے آئے ہیں وہ مٹھی بھر رہے ہیں

سانس لینے کا عمل ہی زندگی ہرگز نہیں ہے
ایک دن مرنا ہی ہے تو جیتے جی کیوں مر رہے ہیں

روشنی کی سمت رخ کر کے سفر جاری کریں اب
آپ تو اس وقت بھی سائے کا پیچھا کر رہے ہیں

پل بنا یا جا رہا اب قلم کی کوششوں سے
فاصلوں کی درمیانی کھائی بھی ہم بھر رہے ہیں

خوابِ سیرابی سیاست پھر دکھانے پر تلی ہے
یعنی پھر سوکھے کنویں سے لوگ پانی بھر رہے ہیں

ہے وبا دلشادؔ تنہائی کی کتنی جان لیوا
اس قدر ہے خوف طاری لوگ خود سے ڈر رہے ہیں

◄◄ ● ►►

بہت سے باہر کے چند گھر کے بنے ہوئے ہیں
عجیب دشمن مرے ہنر کے بنے ہوئے ہیں
دکھائیں سلطانی جا کے اوروں کی سلطنت میں
وہ صرف شہزادے اپنے گھر کے بنے ہوئے ہیں
ہے سب کی آنکھوں میں آشنائی کا رنگ لیکن
کشیدہ سے زاویے نظر کے بنے ہوئے ہیں
یوں لگ رہا ہے کوئی نہ آئے گا اب مقابل
یہاں تو حالات خوف و ڈر کے بنے ہوئے ہیں
بغیر رختِ سفر بھی چلنا محال ہوگا
مرے ارادے مگر سفر کے بنے ہوئے ہیں
وہاں پہ تصویر کا تبسم بھی زہر ہوگا
جہاں مناظر ہی چشمِ تر کے بنے ہوئے ہیں
لکیر کوئی بھی ختمِ منزل نشاں نہیں ہے
ثبوت نقشے میں رہگزر کے بنے ہوئے ہیں
ہمیں ہماری انا نے تنہا کیا ہے ورنہ
ہمارے دشمن تو دوست ہر کے بنے ہوئے ہیں
یہ لوگ شاطر بہت ہیں دلشادؔ جانتا ہوں
بہت ہی معصوم مجھ سے ڈر کے بنے ہوئے ہیں

◄◄ ● ►►

● دلشاد نظمی

غزل

آنکھیں پتھرا سی گئیں کوئی اشارہ جاگے
منتظر ہیں کہ کبھی بخت ہمارا جاگے
وصل تسکین کی منزل سے گزر کر سویا
لمس کی چاہ لیے ہجر کا مارا جاگے
حالتِ نزع میں آواز کی ترسیل کہاں
شہرِ نا پرساں میں کوئی تو پکارا جاگے
یہ تھپیڑے تو سلا دیں گے مجھے موت کی نیند
آخری وقت ہے دریا کا کنارہ جاگے
شب گزیدہ کوئی سڑکوں پہ نظر آتا نہیں
جشن برپا ہو تو پھر شہر یہ سارا جاگے
تیری دنیا تجھے مدہوش کیے رہتی ہے
کھول جزدان ذرا کوئی سپارہ جاگے
جاگنے والوں نے بیدار کیا ہوگا انہیں
چاہتا ہوں کہ ضمیر ان کا دوبارہ جاگے
دل کی رم جھم میں یہ ارمان لیے بیٹھے ہیں
ان کا دیدار ہو او ر رقص ہمارا جاگے
ٹوکتا ہی نہیں دلشاد کوئی لمحوں کو
وقت کے ہاتھ کا تھپڑ ہی کرارا جاگے

سراغ اپنا لگائیں خود اپنی ہستی سے
تباہ کیوں ہیں سبھی شخصیت پرستی سے
اسی زمیں پہ ہمیں مر کے دفن ہونا ہے
ہمیں نکال کے دیکھے تو کوئی بستی سے
بلندیوں میں بھی رکھا زمین سے رشتہ
بہت عروج ملا مجھ کو اپنی پستی سے
اناج ہوتے ہوئے رکھے صبر کے روزے
بنا کے رشتہ بھی رکھا ہے فاقہ مستی سے
مرا وجود بھی تنکے کی آس جیسا ہے
کہاں ا تارے گا ملاح مجھ کو کشتی سے؟
اسی کے حق میں جو نعرے لگا رہے تھے کل
وہ لوگ تنگ ہیں اب اس کی چیرہ دستی سے
کوئی بھی بھوک کبھی دیکھتی نہیں قیمت
اسے غرض نہیں مہنگی سے اور سستی سے
وہی جو اپنے توکل پہ ناز کرتے ہیں
پریشاں ہوتے نہیں اپنی تنگدستی سے
لگا ہے داؤ پہ دلشاد ان کا مستقبل
یہ لوگ باز نہ آئیں گے اپنی مستی سے

● ڈاکٹر ذکی طارق

غزل

جس دن سے میں ہوں اہل کرم کی امان میں
ہر لمحۂ حیات ہے اک امتحان میں

دل میں نہیں خلوص تو کیسے کوئی ملے
جب مال ہی نہ ہو تو بکے کیا دکان میں

جو سب قبیلے والوں کی قسمت سنوار دے
ایک ایسا فرد چاہیے ہر خاندان میں

میرا وجود سوز الم سے جھلس نہ جائے
موجود دھوپ پہلے سے ہے سائبان میں

غافل ہیں اپنے فرض سے حق مانگتے ہیں سب
پھیلا ہے انتشار ہر اک خاندان میں

اپنے ضمیر و ظرف سے وہ بے نیاز ہیں
پڑھتے ہیں جو قصیدہ امیروں کی شان میں

اس کی شبیہ آتی ہے ہر چیز میں نظر
جب سے بسا لیا ہے ذکیؔ اس کو دھیان میں

◄◄ ● ►►

نصیبِ خفتہ کو بیدار کر دیا جائے
زمینِ شوق کو ہموار کر دیا جائے

رہینِ پستی نخربت جو ہیں چلو ان کو
فرازِ زیست کا حقدار کر دیا جائے

جو مصلحت کے ہیں پردے ہٹا دئے جائیں
ہر ایک راز کو اخبار کر دیا جائے

منافرت کے جس ایواں میں ناگ پلتے ہوں
ضروری ہے اسے مسمار کر دیا جائے

ہر ایک سمت اندھیرا ہے راہِ ہستی میں
بلند نور کا مینار کر دیا جائے

جمود طاری ہے صدیوں سے ذہن انساں پر
کسی طرح اسے بیدار کر دیا جائے

چھپا کے رکھی نہ جائے دلوں میں چنگاری
زباں سے درد کا اظہار کر دیا جائے

ہر ایک موڑ پہ حق گوئی اس کا شیوہ ہے
ذکیؔ کو شمعِ رہِ دار کر دیا جائے

◄◄ ● ►►

● ذکی طارق

غزل

جہانِ ہوش سے بیزار رہنا چاہتا ہوں
خرد سے بر سرِ پیکار رہنا چاہئے ہوں

سنبھل سنبھل کے اٹھاتا ہوں ہر قدم اپنا
نئے زمانے سے ہشیار رہنا چاہتا ہوں

شریکِ محفلِ عشرت رہوں یہ شوق نہیں
نئے غموں کا طلب گار رہنا چاہتا ہوں

نہیں طلب کہ مرے فن کی ہو پذیرائی
میں آج بھی پسِ دیوار رہنا چاہتا ہوں

نہیں ملال جو بازو بھی میرے کٹ جائیں
بہر مقام علم دار رہنا چاہتا ہوں

میری طرف سے ہٹانا نہ تم نظر اپنی
تمہارے ذہن میں اس بار رہنا چاہتا ہوں

حقیقتوں کو ذکی کوئی کچھ سمجھ نہ سکے
میں بند آنکھوں سے بیدار رہنا چاہتا ہوں

◀◀ ● ▶▶

پیکرِ کرب و اضطراب ہے وہ
زندگی کا شکستہ خواب ہے وہ

دوسروں کے لیے ہے بارِ گراں
اپنی فطرت میں لاجواب ہے ہو

جس کو ہونا تھا نازشِ دوراں
اشرف الخلق محوِ خواب ہے وہ

سب جسے مہرباں سمجھتے ہیں
ایک دھوکا ہے اک سراب ہے وہ

قطرۂ منجمد تھا کل انساں
آج مصروفِ انقلاب ہے وہ

نغمگی اس کی عام تھی کل تک
اب تو ٹوٹا ہوا رباب ہے وہ

اے ذکی اس سے دور ہی رہنا
وجہہ عشرت نہیں شراب ہے وہ

◀◀ ● ▶▶

564 -Kela Road
Gaushala Phatak
Ghaziabad-201009(U.P),
Mob: 9818860029

● **دلشاد نظمی**

شاہ دولہ کے چوہے

سیاسی بازی گروں نے پالے ہوئے ہیں چوہے
حسین وعدے۔ سنہرے سپنے، پناہ کی پیشکش، دلاسے
بلوں سے اپنے اُبل اُبل کر نکل رہے ہیں
تمام چوہوں کے سر پہ ہے آہنی شکنجہ
عقیدتوں کا
اُٹھائے جھنڈا، دری بچھانے کی مشق کرتے
جلوس و جلسے میں نعرے بازی کے فن میں ماہر ہیں سارے چوہے
ہیں گاؤں، قصبوں سے، دُور افتادہ ہر علاقے سے آنے والے
یہ کچی عمروں کے سارے چوہے
ہے جن کے چھوٹے سروں پہ سپنوں کا اک خزانہ
عجب سی بے سمت بھیڑ منزل تلاش کرنے نکل پڑی ہے
مچل کے نا تجربہ کار قدموں سے چل پڑی ہے
سیاسی بازی گروں کے مقصد کی بازیابی
لو شاہ دولے کے چوہوں سے ہو گی اب مکمل

◀◀ ● ▶▶

● دلشاد نظمی

سن رہے ہو

منصبی کا رعب مت ڈالو میاں
اور نہ ہی عہدے کی تختی سامنے رکھ کر ملو
فن کوئی میراث تھوڑی ہے
جو وِرثے میں ملے
نثر اور شعر و سخن پہ بات کرتے ہو بہت
اور ہمیشہ چاہتے ہو
تم جسے چاہو گے اس پر بات ہو گی
ہیں بہت سارے جو تم سے معتبر لہجے کے مالک ہیں
حرفِ آخر تو نہیں لکھی ہوئی تحریر کوئی
ہیں زیادہ تم سے قابل۔ علم والے
جن کے فن پارے تمہاری پوتھیوں سے لاکھ بہتر ہیں
اصل میں خوش فہمیوں کی بھیڑ میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے
تم کو اور تم جیسے لوگوں کو
کم سخن لوگوں کی بھی ہر بات کھلتی ہے تمہیں
چاہتے ہو ہوں سبھی بس مدح خواں،،
منصبی کے نام کی تختی کے چلتے، اشتہاری بن گئے ہو
جس کا کچھ حاصل نہیں ہے
خامشی! تخلیق کی بنیاد ہوتی ہے میاں
تم ابھی تک شور کا گارا بنانے میں ہی الجھے ہو

◄● ►

● **دلشاد نظمی**

پیر صاحب

گلف دیش سے چھٹی پر، گھر آنے والے اک بندے کو
بابا نے حجرے میں بلایا۔ آؤ بھگت کی، صافہ باندھا۔ ہار پہنایا
شان میں بندے کے پل باندھے۔ بڑھا چڑھا کر
سب سے رئیس اور سب سے سخی ہیں سب کو بتایا
فوراً اس کے بعد شروع ہوئی قوالی
سارے عقیدت مند خوشی سے جھوم رہے تھے
پیسے دے کر پیر کے ہاتھ کو چوم رہے تھے
رقص بپا تھا
نوٹوں کی برسات ہوئی تھی
بابا اٹھتے تو قوال کا طائفہ اٹھتا

ہاتھوں کو باندھے سب لوگ کھڑے ہو جاتے
اک اک شعر میں بابا اور بڑے ہو جاتے
پھر بابا نے بندے کے دونوں ہاتھوں کو کس کر پکڑا
چکری والا رقص کیا اور
خوب دھمال مچا کر مانے
رشک سے دیکھتے تھے بندے کو سب دیوانے
ختم ہوئی پھر رقص و وجد و کیف کی محفل
بندے کو مدعو کرنے والے گرگے نے
چپکے سے پھر کان میں آ کر سرگوشی کی
یہ سنتے ہی

کان سے اپنے فون لگائے
حجرے سے باہر بندے نے
دوڑ لگائی
گرگے نے بابا کی جانب مڑ کر دیکھا
اور انکار میں سر کو ہلایا
گدّی نشیں بابا کا چہرہ سرخ ہو گیا ایک آن میں
بند لبوں کے اندر اپنے دانت پیستے
آدھا جملہ منھ سے نکلا
ما،،،د،،،،ر،،،،،چ،،،،،!!!!!

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: صدیوں کا رقص صنف: ناول مصنف: شائستہ یوسف سن اشاعت: ۲۰۲۵ صفحات: ۵۷۰ قیمت: ۷۹۹/روپئے مصنفہ کا پتہ: 201 Foardham House Harris Road, Benson Town Banglore- 560046 sharoshni@yahoo.co.in		نام کتاب: جگ بانی صنف: ناول مصنف: شبیر احمد سن اشاعت: ۲۰۲۵ء صفحات: ۷۳۶ قیمت: ۵۵۲/روپئے مصنف کا پتہ: 11B/1 K.B. Bose Lane Kolkata - 700033 Mob: 8961491731

● **دلشاد نظمی**

انتظار

میں نے جو لکھنا تھا سارا لکھ دیا ہے
سب تمہارے سامنے ہے
پڑھ رہے ہو؟ یا پڑھو گے؟؟
تم بڑے نقاد ہو ناں
وقت ملتا ہی کہاں ہوگا تمہیں اتنا زیادہ
ہم سے چھوٹے شہر کے فنکار اکثر
عمر بھر تسلیم کرنے والی آنکھوں کی طلب میں
منتظر رہتے ہیں بس اہلِ نظر کے
ان بڑے شہروں کے ہم اطوار سے واقف نہیں ہیں
مسندیں، عہدے، امارت اور جہاں اثر و رسوخ
کام آجاتے ہیں سب تشہیر میں
یخ زدہ کمرے۔ کسی آرام دہ مسند پہ کہنی ٹیک کر
میں یہ اپنے تجربے
تحریر میں لایا نہیں ہوں
اے بڑے ناقد
مجھے بھی زیب یہ دیتا نہیں ہے
من ترا حاجی بگویم تو مرا ملاّ بگو کی طرز پر
یوں ملتمس ہو کر گزارش میں کروں
ہے یقیں اس درجہ اپنے آپ پر
دھیان کوئی دے نہ دے تخلیق پر

میں نے جو لکھنا تھا۔ بہتر اور کھل کر لکھ دیا ہے
کوئی تو ہوگا جو چھوٹے شہر کے فنکاروں پر بھی
دھیان دے گا
اور لکھے گا تم سے بہتر،،،، دیکھنا
میں منتظر ہوں

نام کتاب: درد میں تیرتے پھول صنف: شاعری شاعر: پرویز مظفر سن اشاعت: ۲۰۲۵ء صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۹۹؍روپے ملنے کا پتہ: Namik Publication Okhla New Delhi - 25 Mob: 7428107304		نام کتاب: انشراح صنف: شاعری شاعر: رفیق راز سن اشاعت: ۲۰۲۶ء صفحات: ۱۹۲ قیمت: ۴۰۰؍روپے مصنف کا پتہ: I.G. Road, Baghaat Sringar Kashmir 190005 Mob: 7889968878
نام کتاب: قطرہ قطرہ احساس صنف: افسانہ (دوسرا ایڈیشن) مصنف: اقبال حسن آزاد سن اشاعت: ۲۰۲۴ء صفحات: ۱۶۰ قیمت: ۲۵۰؍روپے ملنے کا پتہ: Shah Colony Shah Zubair Road, Munger Mob: 9430667003		نام کتاب: سپریم لیڈر کا جوتا صنف: افسانہ مصنف: اشعر نجمی سن اشاعت: ۲۰۲۶ء صفحات: ۱۹۲ قیمت: ۴۴۹؍روپے ملنے کا پتہ: Esbaat Publications Delhi, Mumbai (India) Mob: 9372247833

● دلشاد نظمی

دخمہ

گدھ کم نہیں ہوئے ہیں
کون کہہ رہا ہے ان کی نسل ختم ہو رہی ہے
جھوٹ ہے یہ
اب گِدھوں کی صورتیں بدل گئیں ہیں
مذہبی، جنونی اور سیاسی خول پہنے گِدھ
ہر طرف بکھر گئے ہیں
اونچی چوٹیوں، پہاڑوں، جنگلوں میں رہنے والے
مذہبی ٹھکانوں، اور بلند بالا میڈیا کے دفتروں، سیاسی بلڈنگوں میں
بس گئے ہیں

ہر محکمے میں ہے قبضہ اب علامتی گِدھوں کا
معبدِ زرتشت میں ہے آگ روشن آج بھی،،، پر
آگ اپنی شکل بدلے، نفرتی شعلے لیے
اکثر دلوں میں جل رہی ہے
گِدھ جب انسانی شکلوں میں ملیں تو جان لیجے
عنقریب یہ زمین
دخمہ روپ دھار لے گی

◄◄ ● ►►

423/Hathikhana,Kalimandir Road,Doranda
Ranchi.834002,Jharkhand
Mob.8709966321
nazmi.dilshad@gmail.com

● شاهد جمیل

دوہے

رہ گئے کیا کیا چیختے، منبر اور محراب
اپنی اپنی نیند تھی، اپنے اپنے خواب

☆

محفل محفل عام ہے، مرض مرض مشہور
'مرہم مرہم' کھیلنا، زخموں کا دستور

☆

صبح سویرے بھاگنا، سڑک پہ خالی جیب
دوڑاتا ہے خواب میں، روز کوئی آسیب

☆

سانجھ سویرے گالیاں، رات گئے کہرام
'نِندک نیئرے راکھ کے'[1]، جینا کیا حرام

☆

اس پنساری کے لیے، کیا ہولی، کیا عید؟
اصلی روپیہ ڈال کر، نقلی مال خرید!

☆

جوکر، ویلن مل گئے، کرسی کرسی ٹھاٹ
ہیرو کی تقدیر میں، ٹوٹی پھوٹی کھاٹ

☆

ان محلوں میں ہر طرف، پاوَر[2] کا ہے روگ
اکڑی اکڑی کرسیاں، اکڑے اکڑے لوگ

☆

جنگل والے بھیڑیے، شہر میں ہیں آسین[3]
پہلے کھینچا ٹاٹ، اب، کھینچ رہے ہیں زمین!

☆

جن کو بخشیں کرسیاں، بدلی ان کی جون
ہم ہی سے ہیں پوچھتے، یارا، تو ہے کون؟

☆

'شیش محل' سے آئے ہیں پھر بھی شیش جھکائیں
پانچ برس تک پھر وہی، پتھر خوب چلائیں

☆

ہم سرکس کے جانور، ہم سے کرلے میل
جب جی چاہے، پاس آ، 'چابک چابک' کھیل!

☆

زہر میں اتنا زور تھا، لفظ رہے تھے کانپ
بھاشن سن کر کیچوا، بن گیا آخر سانپ

☆

عیاری کی رونقیں: شہرت راتوں رات
رہ گئے گھر پڑا پتے، کاغذ، قلم، دوات

☆

'مینڈک مینڈک' کھیلتا، ہوگیا اجگر بور
نکل پڑا ہے رینگتا، گھڑیالوں کی اور

آنکھ موبائل پر ٹکی، کان سے چمٹا شور
ٹھوکر نے ہنس کر کہا، میاں! ایمس[4] کی اور

☆

خوب مسائل حل کرے، سب کا کام عزیز
یار، موبائل فون ہے، یا 'ڈیجیٹل تعویذ'؟

☆

بھرے خزانے قیمتی، یار، موبائل کھول!
دو دوُ 'سِم' کو ڈال کر، ''کھل جا سِم سِم'' بول

☆

چھوڑ کے اَ،لہٰ دین کو، لیمپ ہوا روپوش
''گوگل گوگل'' چیختا، جنّ ہوا بے ہوش

☆

یار کبوتر! بھاگ جا، یہ چکّر ہے طویل
میل ہزاروں لانگھتی، 'وہاٹس ایَپ' کی چیل

☆

باغ ہے 'سوشل میڈیا'، یا کوڑے کی ٹال؟
اپنے سب جذبات کو، چوراہے پر ڈال!

◂◂ ● ▸▸

202 - R. D. Mansion,
Beside Yes Bank, Ashiana-Digha Road,
P.O.- B.V. College, Patna- 800014.
(94710-94149)

● یوسف عزیز زاھد

بے چہرگی کا نوحہ

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رفیق الدین کی سانس پھولنے لگی تھی۔ تیسری منزل پر پہلا قدم رکھتے ہی اس نے گہری سانس لے کر تازہ ہوا کو پھیپھڑوں تک رسائی دی، مگر سانسوں کو شانت ہونے میں کچھ وقت لگا۔ مکان کی بالائی منزل پر رات کے اس پہر ہوا میں خنکی قدرے بڑھ گئی تھی۔ کاتک کا مہینہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ رفیق الدین کا مکان شہر کے مضافات میں تھا اور ارد گرد کے مکانوں سے قدرے بلندی پر ہونے کی وجہ سے چاروں طرف آسمان پر جگمگاتے ستاروں نے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دی۔ مکان کی بالائی منزل اس نے خاص طور پر اس لیے بنوائی تھی کہ سردیوں میں چھٹی کے دن دھوپ سیکا کرے اور گرمیوں میں شام کے وقت بیوی بچوں کے ساتھ چائے یا کافی سے لطف اندوز ہو، مگر اب تین چار ماہ سے وہ اپنے کمرے تک محدود ہو گیا تھا۔ آج اس کمرے میں اسے گھٹن محسوس ہوئی تو وہ گراؤنڈ فلور سے بالائی منزل تک کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے خود کو بڑھاپے کی دہلیز پر محسوس کر رہا تھا۔

سانس بحال ہوئی تو تازہ ہوا کے جھونکے اس کے دل و دماغ کو تراوٹ پہنچانے لگے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ ٹہلنے لگا۔ مشرق سے مغرب کی سمت قدم اٹھاتا تو دور پرانے شہر کی روشنیاں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتیں، مغرب سے مشرق کی سمت قدم بڑھاتا تو تاروں کی چھاؤں میں سرمئی پہاڑیاں دکھائی دیتیں۔ ابھی اس نے تیسرا چکر ہی مکمل کیا تھا کہ پہاڑیوں کے پیچھے سے چاند طلوع ہونے لگا۔ رفیق الدین کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ مبہوت سا کھڑا چاند کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنے لگا۔ چاند اگرچہ پورا نہیں تھا، اٹھارہویں یا انیسویں رات کا چاند تھا، مگر رفیق الدین نے شاید پہلی بار یوں پہاڑیوں کی اوٹ سے ادھورا چاند طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ جوں جوں چاند پہاڑیوں کے اوپر آ رہا تھا، سرمئی پہاڑیوں کا حسن بھی نکھرتا جا رہا تھا۔ ہوا میں خنکی اب کچھ اور بڑھنے لگی تھی مگر رفیق الدین کو فرحت محسوس ہو رہی تھی، پھر بھی اس نے چھت پر بنے اسٹور سے ریشمی چادر نکالی اور خود کو چادر میں محفوظ کر لیا۔

''مگر میں اس چادر میں محفوظ رہ سکتا ہوں کیا؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور اچانک ہی وہ ناگوار سی بدبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی جس کا احساس اسے پچھلے چار ماہ سے دلایا جا رہا تھا۔

ساون اپنی پھوار برسا چکا تھا اور بھادوں کا حبس فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ رفیق الدین آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوارنے کی کوشش میں تھا کہ شاہانہ نے ڈبل بیڈ کی شیٹ کو درست کرتے ہوئے کہا:

''آفس سے واپسی پر کوئی اچھا سا ایئر فریشنر لیتے آنا۔ اس حبس نے تو ہر جگہ بدبو پھیلا دی ہے۔''

رفیق الدین نے جواب دینے کی بجائے سمارٹ پرفیوم کپڑوں پر چھڑکا، ٹائی کی ناٹ (knot) کو درست کیا اور کمرے سے نکلنے لگا۔

''سنا نہیں، میں نے کیا بکواس کی ہے؟'' اب کی بار شاہانہ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح جارحانہ تھا۔

''سنا بھی ہے اور آپ کے حکم کی تعمیل بھی ہوگی شاہانہ بیگم،'' اس نے حسبِ معمول مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شاہانہ بڑبڑاتے ہوئے ٹی وی لاؤنج کی طرف چلی گئی۔

رفیق الدین اپنی ہونڈا سٹی میں ایئر کنڈیشنر آن کر کے اطمینان سے ڈرائیو کرتا آفس پہنچا۔ اپنے روم تک آتے آتے حسبِ معمول اسے 'وعلیکم السلام، وعلیکم السلام' کی گردان کرنی پڑی۔ روم میں نائب قاصد نے صفائی کے ساتھ ایئر فریشنر بھی چھڑکا ہوا تھا، منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتل بھی سائیڈ ٹیبل پر آب خورے کے ساتھ دھری تھی۔ اس نے ٹائی کی ناٹ کو قدرے ڈھیلا کیا اور نائب قاصد کو بلانے کے لیے بیل کا بٹن دبا دیا۔

سارا دن آفس کی مصروفیات میں گزرا۔ آفس سے نکل کر اس نے شاپنگ مال کا رخ کیا۔ اپنے لیے سمارٹ پرفیوم، نکٹائی اور کچھ دوسری ضروری اشیاء کے ساتھ پرفیومڈ ایئر فریشنر بھی خریدا اور شام ڈھلے گھر واپس آیا۔ بیگم، پانچ سال کا بیٹا صدیق اور بیٹی روشانہ لان میں بیٹھے ٹھنڈے مشروب سے بڑھتے ہوئے حبس کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر اس نے ٹائی کی ناٹ کھول دی۔ شاہانہ نے اس کے سامنے رکھا خالی گلاس ٹھنڈے مشروب سے لبالب بھرتے ہوئے کہا:

''شاور لے کر کپڑے بھی بدل لیتے تو اچھا تھا۔''

''یار شاپنگ مال میں اتنا رش تھا اور پھر بھادوں کا حبس،'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک ہی سانس میں ٹھنڈے مشروب کا گلاس خالی کر دیا۔ شاہانہ کچھ سونگھنے کے انداز میں ناک کو سکوڑتے ہوئے کہنے لگی:

''بھادوں کے حبس کی بو کمروں سے نکل کر لان تک آ پہنچی ہے، مگر بھادوں کا مہینہ ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔''

رفیق الدین نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنے لیے مشروب کا دوسرا گلاس بھرا اور غٹاغٹ پی گیا۔

''یہ تم زیادہ میٹھا نہیں لینے لگے رفیق؟''

''ہاں پاپا! آپ چائے میں بھی شوگر زیادہ لیتے ہیں اور یہ کولڈ ڈرنک تو شوگر کی بیماری ہے آپ کی

عمر کے لوگوں کے لیے۔''بیٹی روشانہ نے ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اس نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی، پھر شاہانہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور گلاس کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

''آپی! تم نے پاپا کو ناراض کر دیا۔''صدیق نے روشانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"روشی، تم نے محسوس کیا کہ جب تمہارے پاپا آئے تھے تو یہ بدبو جواب معدوم ہوتی جا رہی ہے، اس وقت بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی؟"

روشانہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔"Yes,you are right mama!"

اتنے میں ملازمہ نسرین برآمدے سے اتر کر کار پورچ کی طرف جانے لگی تو شاہانہ نے آواز دے کر پوچھا:

''کہاں جا رہی ہو نسرین؟''

نسرین اس دوران کار کا بیک ڈور کھول کر گفٹ پیک نکال چکی تھی۔ وہ کار پورچ سے لان کی طرف آئی اور دھیمے لہجے میں کہا:''صاحب کچھ سامان لائے ہیں، وہ لینے آئی تھی۔''

شاہانہ نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا:''دکھاؤ تو اس گفٹ پیک میں کیا کیا ہے۔''نسرین نے گفٹ پیک شاہانہ کے حوالے کر دیا۔ اس نے سامان نکالے بغیر الٹ پلٹ کر دیکھا اور پیک نسرین کے حوالے کرتے ہوئے بڑبڑانے لگی:

''یہ آج کل رفیق پرفیوم اور شائننگ کلر کی نکٹائیاں بہت پسند کرنے لگا ہے۔''

اچانک اسے احساس ہوا کہ بیٹا اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی بیٹی بھی وہاں موجود ہیں، تو اس نے بلاوجہ نسرین کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

''تم یہاں کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو، اندر جاؤ اور تمام کمروں میں ایئر فریشنر چھڑک دو۔''

نسرین''جی اچھا''کہتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں پار کر گئی۔

رفیق الدین شاور لے رہا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا کوئی بچہ دبی دبی آواز میں چلا رہا ہے۔ اس نے شاور بند کیا اور غور سے سننے لگا۔ آواز کمرے کے اندر سے ہی آ رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ روم میں آ کر نائٹ سوٹ پہنا اور کمرے میں آ گیا، مگر کمرہ خالی تھا، البتہ ایئر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''تو یہ نسرین تھی جو ایئر فریشنر چھڑکنے آئی تھی، مگر مجھے کیوں لگا کہ کوئی بچہ......نہیں، غالباً کسی بچی کی چیخوں کی آواز تھی...... بچی کی چیخوں کی آواز......؟''اس نے دھیمے لہجے میں دہرایا اور اس کا پورا جسم

پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس نے کمرے کا اے سی آن کیا اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ چیخوں کی آواز تو اب نہیں آ رہی تھی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی بچی بلک بلک کر رو رہی ہے۔

اس کی آنکھیں بند تھیں کہ روشانہ کی آواز آئی: ''پاپا، ڈنر لگ گیا ہے، ماما آپ کو بلا رہی ہیں۔''
اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ کچھ دیر پہلے روشانہ چلا رہی تھی۔

''مگر روشانہ تو اب بچی نہیں، وہ چیخیں تو چھ سات سال کی بچی کی تھیں۔'' اس نے زیرِلب دہرایا۔

''پاپا پلیز! بہت بھوک لگی ہے۔ پتہ ہے وقت کیا ہوا ہے؟ دس بج رہے ہیں پاپا۔'' روشانہ نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

''اچھا بیٹا! میں آ رہا ہوں۔'' رفیق الدین نے بہت دھیمی آواز میں کہا اور ڈائننگ ٹیبل تک آ گیا۔ شاہانہ اور صدیق کھانا کھا رہے تھے، روشانہ بھی پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور خالی خالی نظروں سے بیوی اور بچوں کو تکتا رہا۔

''یہ کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے ہو، جیسے ہمیں ہی چبانے کا ارادہ ہے رفیق؟ کھانا کھاؤ۔'' شاہانہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا تو وہ چونک سا گیا۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا ہے شاہانہ؟''

''نہیں، میں دیواروں سے مخاطب ہوں۔'' اس نے چڑ کر جواب دیا اور کرسی سے اٹھ گئی۔

''پاپا مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' صدیق بھی کھانے کی میز چھوڑ گیا۔ روشانہ نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور اپنے روم میں چلی گئی۔ رفیق الدین کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا، پھر کھانا کھائے بغیر بیڈ روم میں آ گیا۔ شاہانہ آئینے کے سامنے بیٹھی ہاتھوں اور چہرے پر سکن کریم لگا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ نائٹ بلب آن کر کے شاہانہ نے باقی لائٹس آف کر دیں اور بیڈ پر آ گئی۔

رفیق الدین کو کس وقت نیند نے اپنی آغوش میں لیا، اسے نہیں معلوم، مگر جب آنکھ کھلی تو شاہانہ بیڈ پر نہیں تھی۔ اس نے سامنے لگے وال کلاک میں وقت دیکھا، صبح کے پانچ بجنے کو تھے۔

''لیکن شاہانہ تو گرمی سردی سات بجے سے پہلے کبھی نہیں جاگی، آج سورج کس طرف سے نکلا ہے؟'' اس نے اٹھ کر واش روم کی سن گن لی، ایک دو بار نام لے کر شاہانہ کو پکارا بھی، مگر وہ کمرے میں موجود ہوتی تو جواب دیتی۔ آہستگی سے واش روم کا دروازہ کھول کر اس نے ٹوتھ پیسٹ اور برش سنبھالا، پھر شاور لیا اور واش روم سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر ایک بار پھر وال کلاک پر پڑی۔ ابھی بریک فاسٹ میں بہت وقت تھا۔ رفیق الدین کمرے سے نکل کر لان میں چلا آیا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا مگر حبس بدستور پاؤں

پیارے بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے بادل ہوا کے دوش پر محوِ سفر تھے۔ اس نے سلیپر اتارے اور گھاس پر چہل قدمی کرنے لگا۔ گھاس کی ٹھنڈک پیروں کے تلووں سے ہم آغوش ہوئی تو اسے فرحت کا احساس ہوا۔ تین چار چکر لگائے تو اسے سانس لینے میں دشواری پیش آئی۔

''رفیق الدین! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے، پینتالیس برس، اور سانس یوں پھول رہا ہے گویا ساٹھ سال کا بوڑھا ہوں۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

''کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے، اب تو دو قدم چلنا بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے۔'' سانس بحال ہونے پر وہ اٹھ کر ناشتے کی میز تک آیا تو دیکھا نسرین ناشتہ لگا رہی تھی۔

''تمہاری مالکن کہاں ہے نسرین؟'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ اسی دوران شاہانہ، صدیق کا ہاتھ تھامے آتی دکھائی دی، روشانہ بھی ہمراہ تھی۔ رفیق الدین اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا تھا لیکن شاہانہ صدیق کو لے کر میز کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی۔ روشانہ نے بھی ماں کی تقلید کی۔

''نسرین! میرا اور بچوں کا ناشتہ اس طرف لگاؤ، صاحب کا ناشتہ ادھر ہی رہنے دو۔'' شاہانہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ نسرین نے ان تینوں کا ناشتہ ان کے سامنے چن دیا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ رفیق الدین کچھ دیر خاموشی سے جوس پیتا رہا، پھر شاہانہ کو مخاطب کیا:

''یہ کیا حرکت تھی شاہانہ بیگم؟''

''کچھ نہیں بس یونہی، یہ جگہ ذرا ہوادار ہے اور مجھے حبس نے پریشان کر رکھا ہے۔'' ناشتے کے بعد رفیق الدین آفس جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد شاہانہ کمرے میں آئی۔

''آج تم بہت جلدی جاگ گئی تھیں؟'' رفیق الدین نے آئینے میں اس کا عکس دیکھ کر پوچھا۔

''آدھی رات کو صدیق کے رونے کی آواز سے آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ بستر پر بیٹھا رو رہا تھا۔'' شاہانہ نے سرسری انداز میں کہا اور بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کرنے لگی۔ رفیق الدین نے محسوس کیا کہ شاہانہ کی زبان کا جھوٹ اس کے لہجے کے سچ کا ساتھ نہیں دے رہا۔

''سنو، ایئر فریشنر تو کل ہی سارا استعمال ہو گیا تھا۔ دو چار قسم کے ایئر فریشنر لے آنا، اس حبس نے تو جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ بدبو ہے کہ گھر سے نکلتی ہی نہیں۔''

رفیق الدین سنی ان سنی کر کے کمرے سے نکلا تو شاہانہ نے گہری سانس لی اور سمارٹ پرفیوم بیڈ پر چھڑک کر اے سی آن کر دیا۔

رفیق الدین اپنے آفس کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ آب خورہ کارپٹ پر اوندھے منہ گرا دو

حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس نے غصے میں بیل کے بٹن کو دبایا۔ نائب قاصد امین ڈرتے ڈرتے اندر آیا۔

''یہ آب خورہ کس نے توڑا ہے؟ تمہیں معلوم ہے میں آب خورے سے پانی پیتا ہوں، شیشے کے گلاس سے نہیں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''وہ جی، اس وقت تو آب خورہ سلامت تھا جی۔'' امین نے جھک کر ٹوٹا ہوا آب خورہ اٹھانے لگا۔

''ابھی جاؤ اور بازار سے نیا آب خورہ خرید کر لاؤ۔'' رفیق الدین نے پچاس روپے کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

لنچ کے بعد اس نے ماہرِ امراضِ قلب ڈاکٹر کاشف مجید سے رابطہ کیا۔ اٹینڈنٹ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب شام پانچ بجے کلینک آتے ہیں۔ چھ بجے کا وقت طے ہوا۔ پانچ بجے وہ آفس سے نکلا، ائیر فریشنر خریدے اور ڈاکٹر کے کلینک پہنچا۔ بلڈ پریشر چیک ہوا، پھر کاشف مجید نے اس کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر نے وزن کم کرنے، واک کرنے اور میٹھا کم کرنے کا مشورہ دیا اور ایک مہینے کی ادویات لکھ دیں۔

گھر پہنچتے ہوئے رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے نسرین سے کہا کہ گاڑی سے ادویات لے آئے۔ وہ تھکا تھکا سا صوفے میں دھنس گیا۔

''تمہاری مالکن اور بچے کہاں ہیں؟''

''جی صاحب جی! وہ مالکن اپنی امی کی طرف گئی ہیں، بچے بھی ساتھ گئے ہیں۔'' رفیق الدین نے گہری سانس لی۔

''آپ کے لیے ٹھنڈا مشروب لاؤں صاحب جی؟''

''نہیں، بس اس آب خورے میں ٹھنڈا پانی بھر دو۔''

نسرین روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالنے کے لیے مڑی تو رفیق الدین کی نظریں اس کی کمر پر جم گئیں اور جسم میں عجیب سا کھچاؤ محسوس ہوا۔ نسرین کب کمرے سے باہر نکلی، اسے کچھ خبر نہیں تھی، اس کا ذہن ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اسی دوران سیل فون بجا، شاہانہ کی کال تھی، مگر اس نے اٹینڈ نہیں کی۔ اس نے آب خورہ منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ اسے یوں لگا کسی نے دہکتے انگاروں پر پانی ڈال دیا ہو۔ واش روم جا کر شاور لینے لگا۔ پانی کی پھوار بدن پر پڑی تو جسم کا کھچاؤ کم ہوا۔ اچانک پھر کسی بچے کی چیخوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے شاور بند کر کے غور سے سننے کی کوشش کی تو اس کا خون منجمد ہو گیا۔

''یہ تو...... یہ تو اسی بچی کی چیخیں ہیں جس کا گلا گھونٹ کر میں نے شمس کے کہنے پر گندے نالے میں پھینک دیا تھا۔ کتنی گڑگڑائی تھی وہ......انکل پلیز مجھے چھوڑ دیں! آپ کو اللہ کا واسطہ! مگر اس وقت شمس کی آنکھوں

میں درندگی تھی اور میری آنکھوں میں شیطان کا سایہ تھا۔ ہم دونوں نے اس چھ سات سال کی بچی کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلا تھا اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر......اوہ میرے خدا! مگر وہ میرے کمرے میں کیسے آ گئی؟"

رفیق الدین نے نائٹ سوٹ پہنا اور کمرے میں آ گیا۔ نسرین ایئر فریشنر چھڑک رہی تھی۔

"صاحب جی! آپ کھانے کے لیے ڈنر ٹیبل پر آئیں گے یا کمرے میں لے آؤں؟"

"کیوں؟ تمہاری مالکن اور بچے ڈنر کر چکے ہیں کیا؟"

"جی وہ مالکن اور بچے تو وہیں ڈنر کر کے آئیں گے۔"

رفیق الدین نسرین کو دیکھ کر اپنے بدن کی آواز سن رہا تھا۔ نسرین کا خاوند چوکیدار تھا اور وہ دونوں پارکنگ شیڈ کے پاس ایک کمرے میں رہتے تھے۔

"تمہارا میاں بچوں کے ساتھ گیا ہے؟" اس نے پوچھا تو محسوس ہوا دھڑکن بے قابو ہو رہی ہے۔

"صاحب جی! وہ تو انہیں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا، کمرے میں آرام کر رہا ہے۔"

"اچھا تم جاؤ اب، مجھے بھوک نہیں۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ شاہانہ، نسرین اور وہ معصوم بچی، تینوں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔ بچی رو رہی تھی، شاہانہ مسکرا رہی تھی اور نسرین سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے ذہن کو جھٹکا۔ اچانک روشانہ کی آواز آئی:

"پاپا! آج آپ اتنی جلدی سو گئے ہیں؟" اس نے اٹھ کر دیکھا، کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیل بجا کر نسرین کو بلایا اور کہا:

"ساری لائٹس آف کر دو، صرف نائٹ بلب آن رہے۔"

گہری نیند میں تھا کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ وال کلاک پر بارہ بج رہے تھے۔ شاہانہ اور بچے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ آسمانی بجلی کڑکی۔ اسے لگا وہ بچی کہیں قریب ہی خوفزدہ ہو کر رو رہی ہے۔ وہ کمرے سے باہر نکلا تو صدیق کے رونے کی آواز آئی، شاہانہ اسے دلاسہ دے رہی تھی۔

"تو شاہانہ آج بھی بچوں کے ساتھ ہی سو جائے گی۔" اس نے سوچا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے کچھ کھایا، مگر ایک اور بھوک اسے پریشان کر رہی تھی۔

"مگر وہ بچی! برا کیا اس کا گلا گھونٹ کر......وہ تو......وہ تو......اچانک بجلی کوندی۔ بارش شروع ہو گئی۔ وہ بیڈ پر دراز ہو گیا اور نہ جانے کب نیند آ گئی۔ صبح ہوئی تو شاہانہ کمرے میں آئی، اس نے چہرے کو ماسک سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"سارے گھر میں عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی ہے، اور بدبو اس کمرے سے پھوٹ رہی ہے۔ لگتا

ہے کسی سیاہ ریچھ کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا ہے۔'' رفیق الدین کا بلڈ پریشر آسمان کو چھونے لگا۔ شادی کے بیس سال بعد پہلی بار اس نے سخت لہجے میں پوچھا:

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ وہ بدبو میرے جسم سے آتی ہے؟''

شاہانہ خوفزدہ ہو گئی: ''مجھے نہیں پتہ، مگر تمہیں بہت پسینہ آتا ہے۔''

''تم اپنے حواس میں تو ہو شاہانہ؟''

''واش روم سے فارغ ہو کر اسی کمرے تک محدود رہنا، نسرین ناشتہ یہیں لے آئے گی۔'' وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

رفیق الدین نے شاور لیا، خوشبودار صابن سے جسم ملا، مگر آئینے میں دیکھا تو اسے اپنا عکس نظر نہ آیا، بلکہ ایک گندگی میں لتھڑا سیاہ بالوں والا ریچھ نظر آیا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر آواز نہ نکلی۔ نسرین ناشتہ لے کر آئی۔ اس نے ناشتہ کیا، ادویات لیں اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور آفس چلا گیا۔ وہاں بھی اسے محسوس ہوا کہ عملہ اس سے فاصلے پر رہ رہا ہے۔ اس نے نائب قاصد کو ڈانٹا، مگر اسے لگا امین سانس روکے کھڑا ہے جیسے کوئی بدبو اسے پریشان کر رہی ہو۔

رات کو وہ دوبارہ مکان کی بالائی منزل پر تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر سیاہ بالوں کا جنگل اگ آیا ہے اور وہی بدبو دوبارہ نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ نیچے اترا، رائٹنگ پیڈ پر کچھ لکھا، سلیپنگ پلز جیب میں ڈالیں اور گاڑی لے کر باہر نکل گیا۔ وہ شہر کی مرکزی شاہراہ پر ڈرائیو کرتا ہوا ایک بڑے اخبار کے دفتر کی پارکنگ میں پہنچا، کار پارک کی جیب سے ماسک نکال کر چہرے پر لگایا اور کار سے اتر کر اخبار کے دفتر کے مرکزی دروازے تک آیا۔

''آپ کا آئی ڈی کارڈ سر؟'' سیکورٹی گارڈ نے سوال کیا مگر اس کے کانوں نے جو سنا وہ یوں تھا۔

''تم نے سیاہ ریچھ کا ماسک کیوں لگا رکھا ہے؟'' اس نے گھبرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا تو کاغذ اس کے ہاتھ میں آیا وہی نکال کر سیکورٹی گارڈ کو دکھایا۔

''سر میں آپ کا آئی ڈی کارڈ......'' اس نے اپنا آئی ڈی کارڈ تلاش کر کے سیکورٹی گارڈ کو تھماتے ہوئے کہا۔

''تم اسے رکھو، میں یہ خبر پہنچا کر آتا ہوں۔'' وہ دروازہ کھول کر اخبار کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا فرسٹ فلور پر اس کا مطلوبہ شخص میز پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا کرسی گھسٹنے کی آواز نے اسے چونکا دیا سر اٹھا کر اس صحافی نے اسے دیکھا تو خوف اس کی آنکھوں میں پھیل گیا تب رفیق الدین نے چہرے سے ماسک ہٹایا کاغذ میز پر رکھا اور کہنے لگا۔

''یہ خبر کل کے اخبار میں آسکتی ہے؟'' صحافی نے الجھن سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ رفیق الدین صاحب ہیں نا؟ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکریٹری؟'' جواب دینے کی بجائے اس نے ماسک چہرے پر لگایا اور سیڑھیاں اتر کر دفتر سے باہر آ گیا کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے سلیپنگ پلز کا پیکٹ جیب سے نکالا

''مگر پانی؟ سیکورٹی گارڈ سے پوچھوں؟ دیکھتا ہوں کوئی سٹور کھلا ہو تو سافٹ ڈرنک لے لوں گا۔'' اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے وہ شہر کی مرکزی شاہراہ پر آ گیا اسے یاد آیا پان سگریٹ اور کولڈ ڈرنک کی ایک شاپ رات گئے تک کھلی رہتی ہے اس نے کار ذیلی سڑک کی طرف موڑ لی۔

''اوہ، یہ تو وہی راستہ ہے جو گندے نالے کی طرف جاتا ہے۔'' اسے اچانک چھ سات سال کی بچی بیچ سڑک کے دوڑتی ہوئی نظر آئی اس نے غور سے دیکھا۔

''یہ...... یہ تو وہی بچی ہے جس کے ساتھ میں نے اور شمس نے شیطانی کھیل کھیلا تھا اور پھر میں نے گلا گھونٹ کر اسے گندے نالے میں پھینک دیا تھا۔'' بچی کو بچانے کے لئے اس نے فل بریکس لگائے تو اسٹیئرنگ گھوم گیا اور کار بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرائی اس کا سر ونڈ سکرین سے ٹکرایا، شیشہ ٹوٹ کر اس کے چہرے کو زخم بنا گیا دھماکے کی آواز سن کر پان سگریٹ شاپ والا بھاگتا ہوا آیا پولیس پٹرولنگ کار بھی اس سڑک پر ہی پٹرولنگ کر رہی تھی کچھ دیر میں ایمبولنس بھی آ گئی لیکن ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی رفیق الدین اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ صحافی کے موبائیل پر مقامی تھانے کا نمبر بلنک ہوا دوسری طرف ایس ایچ او تھا۔

''ایک اہم خبر نوٹ کرو یار ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکریٹری ایک ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے ہیں چہرہ تو اتنا زخمی تھا کہ پہچاننا مشکل تھا آئی ڈی کارڈ سے پہچانا گیا۔'' کال ختم ہوئی تو صحافی نے وہ کاغذ اٹھایا جو رفیق الدین اس کی میز پر چھوڑ گیا تھا۔ چند سطور شاید جلدی میں گھسیٹی گئی تھیں۔

''میں رفیق الدین اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے آپ کو موت کی سزا سناتا ہوں صبح کا اجالا ہونے سے پہلے میں خودکشی کر لوں گا ایک اور جرم، مگر میں نہیں چاہتا کہ میری لاش کی بدبو بھی میرے گھر میں پھیلے اس لئے یہ خبر صبح کے اخبار میں آ جائے کہ ڈپٹی سیکریٹری ہیلتھ نے خودکشی کر لی ہے۔

◄◄ ● ►►

Moon Cottage Al- Khair Street,
Jawed Town Lucky Dhiri Road
Gulbahar Colony No. : 4
Peshawar- 5000 (Pakistan)

● ڈاکٹر خالدہ نسیم

نیم کے سائے میں

گرمیوں کی وہ رات نیم کے درخت کی شاخوں میں رکی ہوئی لگتی تھی۔ صحن میں پڑی چارپائیوں، بند کمروں اور سوئے ہوئے جسموں پر ایک بوجھل سا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ صرف پنکھے کی چرچراہٹ تھی اور نیم کے پتوں کی مدھم سی سرسراہٹ۔

روزینہ جاگ رہی تھی۔ جمن اس کے برابر میں پسینے سے بھیگا سو رہا تھا، مگر روزینہ کی نیند جیسے کسی دور اندھیرے میں بھٹک گئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیم کی ٹیڑھی شاخوں کے سائے دیوار پر یوں سرک رہے تھے جیسے کوئی ان دیکھی چیز آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس نے چادر منہ تک کھینچ لی۔ فیروز کی یاد اس کے بدن میں دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں کا لمس، اس کی دھیمی سرگوشیاں، بانہوں میں سمٹ جانے کا وہ مانوس سکون......سب ایک ایک کر کے لوٹنے لگا تھا۔ پھر ایک خیال آ کر ٹھہر گیا......دو سال، پورے دو سال!

"لگتا ہے تم مجھے بھول گئے ہو فیروز" اس نے آہستہ سے اپنی باہیں اپنے گرد لپیٹ لیں، جیسے اپنے ہی وجود میں پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔ رات گہری ہوتی گئی۔ نہ جانے رات کے کس پہر نیند کو اس پر رحم آ گیا۔

روزینہ کی اکثر راتیں ایسی ہی گزرنے لگیں تھیں۔ گھر والے اچھے تھے۔ ساس، سسر، دیور سب اس کا خیال رکھتے تھے۔ دن بھر گھر کے کام کاج اسے مصروف رکھتے۔ لیکن رات کے وقت تنہائی کا احساس اداسی کی چادر بن کر اسکے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

فیروز پہلی بار باہر گیا تھا تو چھ ماہ بعد ہی بیقرار ہو کر واپس آ گیا تھا۔ پھر فون آتے رہے۔ خط آتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے تحفے، یادیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ سب کم ہونے لگا۔ پہلے فون کم ہوئے۔ پھر باتیں مختصر ہونے لگیں۔ پھر صرف پیسے آنے لگے۔ اور اب دو سال گزر چکے تھے۔

شہروز، فیروز کا چھوٹا بھائی ان دنوں بھابی کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ لمبا، ہنستا کھیلتا، ہر وقت گھر میں شور مچائے رکھنے واال شہروز......جمن کو کندھوں پر بٹھائے پورے صحن میں گھومتا رہتا۔

''بھابی، آج پھر کچھ نہیں کھایا آپ نے؟'' وہ ہنس کر ٹال دیتی۔
کبھی پنکھا ٹھیک کر دیتا۔ کبھی بازار سے چیزیں اٹھا لاتا۔ کبھی جمن کو نہلا دیتا۔
ایک دن جمن کو تیز بخار تھا۔ پوری رات روزینہ اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھتی رہی۔ فجر کے قریب دروازہ ہلکا سا کھلا اور شہروز خاموشی سے چائے رکھ گیا۔
''آپ بھی تھوڑی دیر سو جائیں......'' وہ کچھ کہنے لگی مگر تب تک وہ واپس جا چکا تھا۔
روزینہ، جسے وقت کے ساتھ محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے اس کا وجود ایک بھول بنتا جا رہا ہے، شہروز کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور توجہ محسوس کرنے لگی تھی۔ شام کو موٹر سائیکل کی آواز آتی تو وہ خوش ہو جاتی۔ بے اختیار دوپٹہ ٹھیک کر لیتی اور نگاہیں دروازے پر لگ جاتیں۔ چائے بناتے ہوئے ایک کپ زیادہ رکھ دیتی۔ پھر خود ہی چونک کر واپس اٹھا لیتی۔ کبھی جمن کو شہروز کی گود میں دیکھ کر خاموشی سے مسکراتی۔ اور پھر اچانک کچھ سوچ کر گھبرا جاتی۔
ایک رات بجلی چلی گئی۔ شدید گرمی تھی۔ کمرہ بھٹی بنا ہوا تھا۔ جمن پسینے میں بھیگا سو رہا تھا۔ روزینہ ہاتھ والا پنکھا جھلتے جھلتے تھک گئی، تو صحن میں آ گئی۔ نیم کے نیچے چارپائی پڑی تھی۔ شہروز وہیں بیٹھا تھا بنیان میں۔ ہاتھ میں پنکھا لیے۔
''نیند نہیں آ رہی آپ کو بھی؟'' اس نے روزینہ کو دیکھا تو پوچھا۔ روزینہ نے سر ہلا کر جواب دیا۔
''گرمی بہت ہے۔''
شہروز نے پنکھا ایک طرف رکھا۔
''جمن مجھے دے دیں، آپ تھوڑی دیر سو جائیں۔''
''سویا ہوا ہے۔''
''اچھا ہے۔ جاگتا ہوتا تو ابھی تک مجھے گھوڑا بنا چکا ہوتا'' شہروز نے مذاق میں کہا۔ روزینہ ہنس پڑی۔ اس وقت ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ نیم کے پتوں میں سے ایک پتہ ٹوٹ کر شہروز کے کندھے پر آ گرا۔ روزینہ نے بیاختیار ہاتھ بڑھا کر پتہ ہٹا دیا۔ شہروز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ روزینہ جھینپ سی گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس رات وہ دیر تک سو نہ سکی۔
وقت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان ایک انجان خاموشی کی زبان بولنے لگی تھی۔ اور انہی خاموشیوں میں آہستہ آہستہ کچھ جنم لے رہا تھا۔ ایک دن روزینہ نے کہا۔
''میرے سر میں درد ہے۔'' شہروز کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ آدھے

گھنٹے بعد واپس آیا تو ہاتھ میں دوا تھی۔

''اب اماں کو مت بتائیے گا......ورنہ کہیں گی میں نے آپ کو بیمار کردیا۔'' دوا دیتے ہوئے شہروز نے کہا۔ روزینہ نے اس کی طرف دیکھا۔ شہروز ہنس رہا تھا۔ وہ ساری شام اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

گرمی کی ایک ایسی ہی گرم رات تھی۔ روزینہ جاگ رہی تھی۔ اس کی آنکھ اچانک دروازے کی طرف اٹھی۔ جہاں ایک سایہ دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کون؟''

''میں ہوں......شہروز!''

پنکھا چرچرا رہا تھا۔ جمن گہری نیند میں تھا۔ روزینہ دوپٹہ سینے کے گرد کھینچ کر دروازے کے پاس گئی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' کچھ لمحے خاموشی رہی۔

''نیند نہیں آ رہی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو؟'' روزینہ نے سوال کیا۔ وہ ہلکا سا ہنسا، مگر اس کی ہنسی میں گھبراہٹ تھی۔

''دل چاہا آپ سے بات کرلوں۔'' اس نے جھینپ کر جواب دیا۔ روزینہ کے ہاتھ گھبراہٹ اور بے یقینی کے عالم میں ٹھنڈے پڑ گئے۔ شہروز ایک قدم آگے آیا۔

''بہت کوشش کی خود کو سمجھانے کی......'' اس کی آواز بھاری ہوگئی۔

''جب آپ اداس ہوتی ہیں نا......میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔'' شہروز نے یہ کہتے ہوئے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ روزینہ کے جسم میں لرزش سی دوڑ گئی۔ مگر اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ کمرے میں خاموشی گہری ہونے لگی۔

اس کے بعد ان کے درمیان ایک الگ جہان بس گیا۔ دبی دبی سی ہنسی، خاموش سرگوشیاں، ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرنا ان کے دن رات کا حصہ بن گئے۔ روزینہ کو پہلی بار مرد کی چاہت کا سچا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ فیروز کا انتظار بھول گئی۔ زندگی نے ایک عجیب سی کروٹ لے لی تھی۔

وقت اپنے نئے انداز میں آگے بڑھتا جا رہا تھا جب فیروز کے آنے کی خبر آئی۔ وہ خبر جس سے کبھی روزینہ کو اپنے پورے وجود میں بہار کی آمد محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ انتظار کی مشکل گھڑیاں گن گن کر گزارا کرتی تھی۔ لیکن اس بار......اس خبر نے اسے بے چین سا کردیا تھا۔ جیسے اس کے سر پر کوئی پہاڑ رکھ دیا گیا ہو۔ شہروز بھی خوش نہیں تھا۔

فیروز آیا تو گھر میں رونق ہوگئی۔ ماں بھی وارے وارے جا رہی تھی۔ ابا کی بھی جان میں جان آ

گئی تھی۔ وہ دیر تک اس کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں۔ جمن باپ سے لپٹا پھرتا۔ اور روزینہ......! وہ اسے دیکھ کر گھبرا جاتی۔ فیروز اس کے قریب آتا تو اس کا جسم تن جاتا۔ اسے اپنے ہی شوہر کا لمس اجنبی لگنے لگا تھا۔

ایک رات وہ آہستہ سے صحن میں آئی تو شہروز نیم کے درخت کے نیچے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ روزینہ اس کے پاس آئی۔

''میں تمہیں اس کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا۔'' شہروز نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آہستہ بولو۔'' روزینہ گھبرا گئی۔

''وہ واپس چلا جائے گا دو مہینے بعد......!''

روزینہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ شہزور نے بے بسی سے ہوا میں مکا لہرایا۔

''دو مہینے؟ اور اگر وہ......واپس نہ جائے تو؟'' روزینہ کا دل زور سے دھڑکا۔

''ایسی باتیں نہ کرو۔''

دوسری طرف فیروز روزینہ کی غیر دلچسپی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے ٹھنڈے جذبے اسے پریشان کرنے لگے تھے۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ دور رہ کر وہ روزینہ کی محبت کھونے لگا ہے۔ وہ روزینہ اور جمن پر اب زیادہ توجہ دینے لگا تھا۔ لیکن شہروز اور روزینہ کے دل میں ایک خوف سانس لینے لگا تھا۔ جو ادھورے جملوں میں اور کبھی خاموش نظروں میں اپنا اظہار کرتا رہتا۔ دونوں کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہروز نے جب بھی اس کا اظہار کیا روزینہ اسے تسلی دیتی۔

''بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔''

فیروز اس دن بہت خوش تھا۔ وہ جمن کے لیے کھلونے لایا تھا۔ اور روزینہ کے لیے ہلکے سبز رنگ کا سوٹ۔ رات کو اس کے قریب لیٹ کر مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا۔

''اس بار تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں چھوٹا سا گھر لیں گے۔''

فیروز کی باتوں کے ساتھ روزینہ کا دل عجیب مروڑ کھاتا جا رہا تھا۔ ایک طرف شہروز تھا۔ ایک طرف یہ آدمی...... جو شاید اپنے طریقے سے اس سے محبت کرتا تھا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

شہروز کو جب فیروز کے روزینہ کو ساتھ لے جانے کے خیال کا پتہ چلا تو اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ چلو ہم یہاں سے کہیں دور چلتے ہیں۔'' اس نے روزینہ کو اپنے ساتھ گھر سے بھاگ جانے پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن پھر خود ہی گاؤں میں بے عزتی اور خاندان کے نام پر حرف

آنے کا سوچ کر اپنے خیال سے دستبردار ہوگیا۔روزینہ کے پاس اسے تسلی دینے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

ایک شام شہروز نے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پڑیا تھمادی۔روزینہ نے ایسی پڑیا پہلے گھر میں دیکھی تھی۔کھیتوں اور گھر میں چوہوں اور نقصان پہنچانے والے جانوروں کو مارنے کے لیے استعمال ہونے والی دوا۔روزینہ کے ہاتھ برف ہو گئے۔

''یہ کیا......؟''اس سے بات پوری نہ ہو سکی۔حیرانی سے اسکی بڑی بڑی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔شہروز نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا......اس کے علاوہ مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔''روزینہ کو جیسے پورا کا پورا آسمان سر پر آ گرتا محسوس ہوا۔

''شہروز وہ میرے جمن کا باپ ہے۔تمہارا بھائی...... یہ تم کس راستے پر چل پڑے ہو؟" وہ گھبرا کر پڑیا ہاتھ میں ہی لیے وہاں سے بھاگ گئی۔باورچی خانے میں پہنچ کر اسے ہاتھ میں پڑیا کا احساس ہوا تو گھبراہٹ میں اوپر پڑے ایک پرانے مرتبان میں رکھ دی۔اس نے شہروز سے اگلے دو دن بات نہیں کی۔

وہ فیروز کو دیکھتی اور شہروز کا ارادہ یاد کرتی تو اس کے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی۔جمن کو اپنے باپ کے ساتھ الڈیاں کرتے دیکھتی تو ایک ناکردہ گناہ کے بوجھ تلے خود کو دبتا محسوس کرتی۔کئی بار اس کا واقعی فیروز کے ساتھ اس گھر سے چلے جانے کو دل کیا۔لیکن اگلے ہی لمحے خود اسکے دل میں پلتی شہروز کی محبت اس کی ہمت میں دراڑ ڈالتی۔اور وہ بے بسی کے عالم میں فیروز کے چلے جانے کی دعا مانگتی۔

ایک دن فیروز نے یہ خبر سنائی کہ اس نے روزینہ کو ساتھ لے جانے کی پوری تیاری کر لی ہے۔

''دو ہفتے بعد ہم ایک ساتھ سفر میں ہوں گے''فیروز نے اسے خوشخبری سناتے ہوئے کہا تھا۔اور روزینہ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

رات فیروز دن بھر کی تھکن کی وجہ سے گہری نیند سو چکا تھا۔گھر میں خاموشی تھی۔رات کے پچھلے پہر وہ شہروز کے ساتھ اندھیرے میں نیم کے درخت کے نیچے کھڑی اپنی محبت کے انجام کا سوگ منا رہی تھی۔شہروز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''اگر تم میری نہ ہوئی تو میں بھی نہیں رہوں گا روزینہ۔''اور روزینہ نے فوراً اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''پھر ایسے الفاظ کبھی منہ سے نہ نکالنا۔''اس لمحے دونوں نے ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے کی قسم پھر سے تازہ کی۔روزینہ اس رات سو نہ سکی۔کئی خیال اسے پریشان کرتے رہے۔

اگلے روز سارا دن وہ مرجھائی مرجھائی، الجھی سی اپنے آپ ہی میں گم رہی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ جب اس نے باورچی خانے میں اوپر کے خانے میں رکھے مرتبان کی طرف دیکھا۔ شہروز کا خیال اس کے دماغ میں بجلی کی مانند کوند گیا۔ وہ خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ اس نے اپنی نظریں مرتبان سے ہٹا کر کھانا نکالنے پر مرکوز کیں۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اور اسے اپنا آپ خواب کے عالم میں محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں معلق......وہ کھانا نکالتے ہوئے رک گئی۔ اس کے ہاتھ مرتبان کی طرف اٹھے۔ اسے اپنے ہاتھ اپنے وجود سے دور کوئی الگ جان محسوس ہو رہے تھے۔ جیسے وہ خود اپنی مرضی سے کام کر رہے ہوں۔ اور وہ دور کھڑی سب دیکھ رہی ہو۔ اس کی انگلیاں وہ پڑیا کھول رہی تھیں۔ فیروز کے ساتھ کیے وعدے اور شہروز کی محبت کے درمیان کھڑی وہ اپنا سانس گھٹتا محسوس کر رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے پڑیا میں سے اس نے نمک کی طرح کا کچھ پلیٹ میں سالن کے اوپر چھڑک دیا۔ اور باقی پڑیا بند کر کے گھبراہٹ میں واپس پرانے مرتبان میں چھپالی۔ اسے اپنا دل اچھل کر سینے سے باہر آتا محسوس ہو رہا تھا۔

فیروز کھانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرے میں سالن کی پلیٹ اور روٹی اٹھائے ایک لمحے کے لیے وہ رکی۔ اور پھر اس کے سامنے کھانے کی پلیٹ اور روٹی رکھ دی۔ فیروز اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''آج تم اتنی خاموش کیوں ہو؟'' روزینہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اس کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کھانے کے بعد فیروز حسبِ معمول چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''عجیب گھبراہٹ ہو رہی ہے روزینہ......!'' اس نے روزینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ روزینہ کو اپنی سانس رکتی محسوس ہو رہی تھی۔

''روزینہ......! نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔ دل پر بوجھ سا پڑنے لگا ہے۔'' فیروز کی آواز ٹوٹنے لگی۔ روزینہ آگے بڑھی۔ اور فیروز کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''کیا ہو رہا ہے مجھے......؟'' وہ ہانپ رہا تھا۔ روزینہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ فیروز نے دھندلائی نظروں سے اسے دیکھا۔

''رو کیوں رہی ہو......؟'' وہ جواب نہ دے سکی۔ گناہ کا احساس اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ فیروز کی سانس اکھڑتی گئی۔

''روز......ینہ......!'' اور پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

گھر میں شور مچ گیا۔ فیروز کی ماں چیختی کمرے کی طرف دوڑتی آئی۔ سسر ننگے پاؤں اس کے پیچھے دوڑتا آیا۔ وہ آوازیں دیتا اس کے جسم کو جھنجوڑ رہا تھا۔ جمن ڈر کر رونے لگا۔ شہروز باہر دیوار کے ساتھ لگا

کھڑا تھا۔اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ بھائی کے بچھڑنے اور اپنے گناہ کے احساس نے اس کی پوری کوشش کے باوجود اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔روزینہ اپنے آنسو نہ روک پا رہی تھی۔وہ فیروز کو دیکھے جا رہی تھی۔جیسے خاموشی کی زبان میں شکایت کر رہی ہو،

''کاش تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاتے۔''

فیروز کی قبر سے واپسی پر گھر میں گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔سب اپنی اپنی اداسی میں گھرے، رات کے اندھیرے میں پناہ تلاش کر رہے تھے۔شہروز صحن میں ساکت کھڑے نیم کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔اس نے جیب سے سگریٹ نکالی۔اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔روزینہ اپنے کمرے میں سوتے جمن کے پاس بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔پھر کچھ سوچ کر وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں گئی۔خوف اور گھبراہٹ سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔اس نے اوپر رکھا مرتبان اتارا۔ڈھکن اٹھا کر اس کے اندر دیکھا اور گھبرا کر جلدی سے بند کر دیا۔بالکل ایسے جیسے پڑیا سانپ بن کر ابھی مرتبان سے باہر آ جائے گی۔

''کل پھینک دوں گی۔''اس نے دل میں کہا۔اس نے مرتبان واپس رکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اگلے دن اس نے ایک بار پھر اوپر والے خانے میں رکھے مرتبان کو دیکھا۔اس کا دل دھڑکنے لگا۔وہ چند لمحے ساکت کھڑی اسے دیکھتی رہی۔اس نے مرتبان کی طرف ہاتھ بڑھائے اور واپس کھینچ لیے۔جیسے اسے چھونا کسی زہریلے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنا ہو۔اس کے بعد بھی اس نے کئی بار باورچی خانے کی صفائی کرتے ہوئے اوپر رکھے مرتبان کو دیکھا،لیکن اسے چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔

فیروز کی موت کے بعد گھر کئی مہینوں تک ماتم میں ڈوبا رہا۔صحن میں بچھی چارپائیاں، آنے جانے والی عورتیں،قرآن کی تلاوت کی آواز،ساس کی لمبی آہیں۔سب کچھ جیسے وقت کے اوپر رک گیا تھا۔روزینہ سفید دوپٹے میں خاموش بیٹھی سوچوں میں گم رہتی۔اور ہر آواز پر چونک جاتی۔دروازے پر دستک ہوتی تو دل دھک سے رہ جاتا۔رات کو آنکھ کھلتی تو لگتا فیروز چارپائی کے پاس کھڑا ہے۔اور شہروز؟ وہ بھی اب پہلے جیسا بےفکر نہیں رہا تھا۔اس کی ہنسی میں ایک کھوکھلا پن آ گیا تھا۔وہ دیر دیر تک سگریٹ پیتا رہتا۔کبھی جمن کو بے وجہ سینے سے لگا لیتا،کبھی اسے گھورتا رہتا۔

عدت ختم ہوئی تو گھر میں دبے لفظوں میں باتیں شروع ہوئیں۔

''لڑکی جوان ہے......بچہ بھی ہے......غیروں میں جائے گی تو جمن کا کیا ہوگا؟''

ایک شام ساس نے ہمت کر کے روزینہ کے ساتھ بات چھیڑی۔

''اگر تم چاہو تو......شہروز......'' روزینہ نے سر جھکا لیا۔اور پھر شادی سادگی سے ہوگئی۔

تمام دکھوں اور احساس گناہ کے باوجود روز ینہ کو لگتا تھا کہ جیسے اس نے دنیا جیت لی ہے۔ شہروز بھی کبھی دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا۔

''اب کوئی ہمیں الگ نہیں کرے گا'' روز ینہ اس کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی۔ شہروز کے وجود کا لمس اسے ہر دکھ سے آزاد کر دیتا۔ شہروز کا خیال رکھنے میں اسے زندگی کا مزہ آنے لگا تھا۔ اس کی مرضی کے کھانے بناتی۔ اس کے لیے بنتی سنورتی۔ کبھی شہروز کہتا۔

''تمہیں معلوم ہے؟ میں نے زندگی میں صرف ایک صحیح فیصلہ کیا تھا۔''

''کون سا؟'' روز ینہ دھیمی آواز میں پوچھتی۔

''تم سے محبت کرنا۔'' روز ینہ کو لگتا فیروز شاید ایک دھندلا خواب تھا۔ اصل زندگی تو یہ ہے۔

وقت گزرنے لگا۔ شہروز اور روز ینہ کی محبت نے انہیں ایک بیٹا اور بیٹی سے بھی نواز دیا تھا۔ جمن اب بڑا ہو رہا تھا۔ خاموش، کم بولنے والا۔ اس کی آنکھیں حیرت انگیز حد تک فیروز جیسی تھیں۔ وہ کبھی کبھی دیر تک شہروز کو خاموشی سے دیکھتا رہتا۔ اور شہروز اس کی نظر سے بے چین سا ہو جاتا۔

''یہ مجھے ایسے کیوں دیکھتا رہتا ہے؟''

روز ینہ ہنسنے کی کوشش کرتی۔

''بچہ ہے ابھی......''

''نہیں۔'' شہروز سگریٹ کا لمبا کش لیتا۔

''اس کی آنکھیں اچھی نہیں لگتیں مجھے۔''

روز ینہ چونک کر اسے دیکھتی۔ پھر خود کو سمجھانے لگتی۔ یہ صرف وہم ہے۔ وہ کوشش کرتی کہ دونوں قریب آ جائیں۔

''جمن، شہروز بابا کے ساتھ بازار چلے جاؤ۔''

''جمن، بابا کو پانی دو۔''

''جمن، دکھاؤ تو بابا کو کیا بنایا ہے تم نے۔'' اور چند لمحوں کیلئے واقعی سب ٹھیک لگتا۔ شہروز کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیتا۔ کبھی اسے ساتھ بٹھا لیتا۔ تب روز ینہ کے

اندر امید جاگتی۔ مگر پھر اچانک کچھ بدل جاتا۔ جمن کی نظر، ایک خاموشی، اور شاہروز کا چہرہ سخت ہو جاتا۔

ایک دن جمن نے غلطی سے دودھ کا گلاس گرا دیا۔ شہروز آپے سے باہر ہو گیا۔

''تم سے ایک کام بھی ٹھیک نہیں ہوتا؟'' تھپڑ کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔ جمن دیوار سے جا

لگا۔روزینہ چیخ پڑی۔

''پاگل ہوگئے ہو؟''

چند لمحے کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔جمن رخسار پکڑے کھڑا تھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔مگر وہ رو نہیں رہا تھا۔بس دیکھ رہا تھا۔ویسی ہی خاموش نظروں سے۔شہروز کو اپنے اندر گھبراہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔اور وہ باہر نکل گیا۔

اس رات روزینہ دیر تک جاگتی رہی۔اور برابر میں سوئے شہروز کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔وہی آدمی جس کے لیے اس نے سب کچھ جلا دیا تھا۔وہی آدمی جس کے بغیر زندگی ناممکن لگتی تھی۔اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو چھوا۔اور اس کا دل بھر آیا۔

''کاش......کاش یہ سب ایسے نہ ہوتا۔کاش فیروز واپس آتا ہی نہ۔کاش وہ رات نہ آتی۔''

وہ دکھ میں ڈوبی سوچ رہی تھی۔اسے فیروز یاد آیا۔اس کی نرم آواز۔جمن کو گود میں اٹھانے کا انداز۔وہ چھوٹے چھوٹے خواب۔

''اس بار تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔'' روزینہ کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔وہ ایک اچھا باپ بھی تھا۔یہ سوچ اس کے دل میں خنجر
کی طرح اتری۔

''جمن آج جس خوف میں جی رہا ہے،اس خوف میں دھکیلنے والوں میں ایک میں بھی ہوں۔''
اس کو اپنی سانس میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔

ایک رات روزینہ کی آنکھ اچانک کھلی تو شہروز بستر پر نہیں تھا۔وہ گھبرا کر اٹھی۔صحن میں ہلکی روشنی تھی۔جمن دیوار کے پاس کھڑا تھا۔اور شہروز اس کے سامنے کھڑا تھا۔اس کی انگلیاں جمن کے بازو میں سختی سے پیوست تھیں۔

''میں نے کہا نا مجھے اس طرح مت دیکھا کرو!'' جمن خوفزدہ تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''جھوٹ مت بولو!''

روزینہ فوراً آگے بڑھی۔

''شہروز چھوڑ و اسے!''

شہروز نے چونک کر ہاتھ چھوڑا۔ چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ

دھیرے سے بولا۔

''مجھے نہیں معلوم کیوں......مگر کبھی کبھی دل چاہتا ہے اسے کہیں دور چھوڑ آؤں......''

روزینہ کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ جمن اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے کپڑے پکڑ لیے۔ بالکل ویسے جیسے بچپن میں ڈر کر پکڑتا تھا۔ اس رات وہ جمن کے ساتھ رہی۔ جمن نے ڈرتے ڈرتے ماں سے سوال کیا۔

''امی......!''

''ہاں؟''

''اگر میں کہیں اور چلا جاؤں تو شہروز بابا خوش ہو جائیں گے؟'' روزینہ کو اپنے پورے جسم میں دکھ کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

''جمن؟ تم نے ایسا کیسے سوچ لیا؟''

''وہ کہتے ہیں......میری شکل انہیں اچھی نہیں لگتی۔'' جمن نے خوف بھرے لہجے میں جواب دیا۔ اور اس لمحے روزینہ کو واقعی خوف محسوس ہوا۔ حقیقی خوف۔ اس رات وہ جمن کو سینے سے لگائے دیر تک روتی رہی۔ اور ساری رات جاگتی رہی۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ تو فیروز کا چہرہ ابھر آیا۔ پھر جمن۔ پھر شہروز۔ پھر وہ رات اور وہ پڑیا۔ پھر اوپر والے خانے میں رکھا پرانا مرتبان۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہی مرتبان۔ برسوں سے اس اوپر کونے میں پڑا، اور پہلی بار......اسے اپنے اندر اس مرتبان کے خیال سے خوف کم، پناہ زیادہ محسوس ہوئی۔

اگلی شام شہروز گھر میں داخل ہوا تو کسی انجان وجہ سے خوش تھا۔ بچوں کے لیے مٹھائی لایا تھا۔ روزینہ کو بانہوں میں بھرتے ہوئے اس نے مٹھائی اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈالی اور کہا۔

'' روزینہ! جانتی ہو...... اگر مجھے دوبارہ زندگی ملے...... تو پھر بھی میں تمہیں ہی چنوں گا..........'' روزینہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

کھانا تیار کرتے وقت اس کے ہاتھ بری طرح سے کانپ رہے تھے۔ کئی بار اس نے مرتبان کی طرف دیکھا۔ اس کے اندر خیالات کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس نے مرتبان کا ڈھکن کھولا۔ پڑیا اندر تھی۔ خاموش، جیسے منتظر۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں آیا کہ مرتبان اٹھا کر باہر پھینک دے۔ اس نے ایک لمبا تھکن بھرا سانس لیا۔ اسے فیروز کی آخری لمحے ڈوبتی آنکھیں یاد آئیں۔ پھر جمن کا خوفزدہ چہرہ۔ اور پھر اس کے ہاتھ اسی پڑیا کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے شہروز کا کھانا تیار کیا ویسے ہی جیسے وہ برسوں پہلے فیروز کے

لیے تیار کر چکی تھی۔

کھانے کے کچھ دیر بعد شہروز نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''روزینہ......کیا ہو رہا ہے مجھے......'' وہ اس کے قریب آ گئی۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور ٹوٹ کر رونے لگی۔

''میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں شہروز......'' شہروز نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

''تو......پھر......؟''

''جمن......میری روح ہے......''

آہستہ آہستہ ساری سمجھ شہروز کی آنکھوں میں اترنے لگی۔ وہ الجھتی سانسوں کے درمیان اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ کسی سکون نے لے لی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بمشکل اس کے گال کو چھوا۔

''پاگل عورت......'' اس کے لب ہلے۔ اور سانس ٹوٹ گئی۔ روزینہ دیر تک اس کے بال سہلاتی رہی۔ بالکل ویسے ہی جیسے محبت کی پہلی رات، جب اُس نے اسے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ مگر آج اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

رات کے آخری پہر روزینہ صحن میں نکلی۔ نیم کا درخت ساکت کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی پرانا مرتبان تھا۔ اب خالی۔ مگر جیسے برسوں کی محبت، خوف اور گناہ اپنی خاموش تہہ میں سمیٹے ہوئے۔ وہ نیم کے نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ مٹی نرم تھی۔ جیسے برسوں سے کسی راز کے دفن ہونے کا انتظار کر رہی ہو۔ اس نے مرتبان گڑھے میں رکھا۔ چند لمحے اس نے نیم کے درخت کی ہلکی ہلکی لرزتی شاخوں کی طرف دیکھا۔ اسی نیم کے نیچے محبت کے آغاز کے لمحے اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ آنکھوں میں تیرتی نمی دو قطرے بن کر نرم مٹی میں جذب ہو گئی۔ پھر اس نے مرتبان کے اوپر مٹی ڈالنی شروع کی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دور کہیں فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اس لمحے اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ وہ چونک کر پلٹی۔ برآمدے کی تاریکی میں جمن کھڑا تھا۔ ننگے پاؤں۔ ویسی ہی خاموش نظروں سے دیکھتا ہوا۔ وہ کچھ نہیں بولا، بس دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بالکل اپنے باپ جیسی تھیں۔

216 Oakpark Boulevard,
Oakville, ON L6H 0K3,
Canada
Phone Number: +1-226-374-5776

● سبین علی

دھن پریت ساڈے

''اوئے میرا نکا ویر آیا ہے۔'' بھائی رب نواز مجھے دیکھ کر خوشی سے پکارا۔

''اوئے لڑکو جلدی سے چار پائی لاؤ۔ بشیرے بیلنے میں نرم اور میٹھے گنے لگاؤ۔ اپنے چاچے کے لیے تازہ روہ نکالو۔''

میں کھوری کے ڈھیر کے ساتھ بچھی چار پائی پہ بیٹھا ہوں۔ دل میں شکر گزاری ہی شکر گزاری ہے مگر رگوں کوئی کلبلاہٹ سی ہے۔ اسی کلبلاہٹ کو ختم کرنے کے لیے میں چار پائی سے اٹھ کر بھائی رب نواز کے پاس زمین پہ جا بیٹھتا ہوں جو وقفے وقفے سے کھوری کے ڈھیر سے کھینچ کر گنے کی خشک چھال دہکتے کڑاہ کے نیچے دھکیل رہا ہے۔ رب نواز میرا تایا زاد بھائی ہے۔ دیہاتی مزاج کا مخلص اور سادہ لوح شخص جس پر ڈھلتی عمر کے آثار ہویدا ہیں مگر دل بچوں کا سا معصوم ہے۔ آج رب نواز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس کا لڑکا بشیر نیم گرم پت کو ہلا ہلا کر ٹھنڈا کر رہا ہے اسے گڑ کی تیسیاں بنانا ہیں۔ جنوری کے سرد دن ہیں۔ ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی ہے جس میں میٹھی سی مہک رچی ہے۔ کماد کے کھیتوں کے ساتھ بیلنے چل رہے ہیں۔ کھلیانوں میں روہ، گڑ شکر اور شوگر ملوں میں کرشنگ کا موسم ہے۔

میں یہاں کسی فوتگی کی تعزیت کرنے آیا ہوں۔ مگر بھائی رب نواز مجھے ڈیرے پہ دیکھ کر اتنا خوش ہوا ہے کہ میں تعزیت کے الفاظ بھول گیا ہوں۔

میں گاؤں شاذ و نادر ہی جاتا ہوں۔ سرکاری ملازمت نے اتنا مصروف کر دیا تھا کہ دنیا کی سیاحت کر چکا مگر اپنے آبائی کھیت دیکھنے کا وقت نہیں نکلتا۔ کسی وقت انہیں کھیتوں اور مٹی سے مجھے بڑا لگاؤ تھا۔ اپنی بیوہ ماں سے ضد کر کے لائلپور کے زرعی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ وہ اکلوتے بیٹے کو شہر ہاسٹل میں بھیجنے پر راضی نہ تھی۔ مجھے یہ جنون تھا کہ جدید زرعی طریقے سیکھ کر وراثت میں ملے مربعے کو بہت اچھے سے سینچوں گا۔ کوئی باغ بھی لگاؤں گا۔

زرعی کالج جو پھر زرعی یونیورسٹی کا درجہ پا گیا۔ وہاں سے بی ایس ای آنرز کرنے کے بعد ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کی ضد ٹھان لی۔

پہلے پہل میں گاؤں جاتا تھا پھر ماں میرے پیچھے لائلپور آنے لگی اور آخر میں مستقل وہیں سکونت اختیار کر لی۔ کیونکہ مجھے زرعی تحقیقاتی ادارے میں نوکری مل گئی تھی۔

روہ کا دوسرا کلاس میرے ہاتھ میں ہے اور میں حسبِ عادت ایک محقق کی نظروں سے کھیتوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ وتر کی ہوئی کھیتیوں میں زمینی آلودگی کے آثار ہیں۔ رب نواز بھائی کھیتی باڑی میں محنت نہ کرتے ہوں یہ ممکن نہیں۔ زراعت صدیوں سے ہمارا پیشہ ہے۔ سخت جاں اور جفاکش کسان ہیں ہم لوگ۔ یہی سخت جانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہمارے کام آتی ہے۔

پھر بھی کہیں کوئی کمی ہے۔ نامیاتی کھاد بھی کم لگ رہی ہے۔ کماد کے کھیت کٹائی کے بعد دھیرے دھیرے خالی ہو رہے ہیں۔ کچھ کھیتوں میں سرسوں اُگی ہے جن میں سے کہیں کہیں پیلا پھول جھانکتا ہے۔ گندم بھی سر اٹھا رہی ہے۔ مگر جو توقع مجھے تھی ویسی فصل کے آثار نہیں ہیں۔

بطور زرعی سائنس دان دنیا کے کئی ممالک کے دورے میں سرکاری خرچ پہ کر چکا ہوں۔ یہ ریٹائرمنٹ کا دوسرا سال ہے۔ میں اب کئی بار سوچتا ہوں کہ ہالینڈ جیسے چھوٹے سے ملک میں گرین ہاوسز میں کنٹرول فارمنگ اور ڈرپ اریگیشن کے ذریعے اُگی سبزیاں جو ایک ہی کسان اُگا تا سنبھالتا اور کسی سپر مارکیٹ کو تازہ سبزیوں کی سپلائی بھی دیتا ہے۔ ہمارا کسان اس سے زیادہ محنت کر کے بھی اتنی فصل اُگا نہیں پاتا۔ اور وہ کیلیفورنیا میں کتنی شاندار زراعت ہے۔ میری بڑی خواہش رہی ہے کہ ہمارا کسان کبھی اس سطح پر آ سکے۔ رب نواز بھائی ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری باتیں سن رہے تھے کہنے لگے۔

''کھاد اور سپرے کا خرچہ بہت ہے اب۔''

کیمکل سے یاد آیا کینیڈا کے دورے پہ میں نے مظاہرین کو دیکھا جو پھلوں سبزیوں پر زہریلے سپرے کے خلاف جلوس نکالے ہوئے تھے۔ پلے کارڈ پر لکھا تھا ہم آدھا سیب سنڈی والا حصہ کاٹ کر کھا لیں گے مگر کیمکل سپرے والا منظور نہیں۔

جتنے لوگ جتنی قومیں اتنی سوچیں۔ پر ہماری مٹی اب ویسی زرخیز نہیں رہی۔ پچھلے دس پندرہ سالوں میں زمین میں بڑی تباہی مچی ہے۔ رب نواز بھائی نے کہا۔

''یہ تو نہیں کہ ہمارے کسان نے ترقی نہیں کی، کتنی نئی جنس کی فصلیں اور پھل سبزیاں اگنے لگی ہیں۔ ٹنل فارمنگ بھی عام ہوگئی ہے۔ ہمارا کنو اور سٹرس کتنا شاندار ہے۔ ہماری مٹی اور آب و ہوا کی تاثیر ہے۔ وہی پھل جو دوسرے ملک میں اُگ کر اتنا اچھا ذائقہ نہیں دے سکا جو اپنے میں اُگ کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہ بڑی ہی نعمت ہے۔ پھر مجھے یاد پڑتا ہے کہ کیلیفورنیا کے زرعی تحقیقی ادارے میں کنو کا پیرنٹ پلانٹ

میں اپنی انکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔اسی سے قلم لے کر دنیا بھر میں بہت جگہ اُ گایا گیا مگر جو رنگ ،خوشبو اور ذائقہ اس نے ہمارے دوآبوں کی مٹی میں اُگ کر دیا وہ دنیا میں کہیں نہیں۔

بشیر گُڑ کی تیسیاں بڑی مہارت سے لگا رہا ہے۔ہاتھ ہنر مند ہے لڑکوں کا......

''پائی جان آرائیوں کا لڑکا ہے۔کھیتی باڑی کے گُر تو خون میں شامل ہیں۔جیسے لوہار کا بیٹا ہتھوڑا چلانے میں خود بخود ماہر ہو جاتا ہے۔ترکھان کا بچہ جانتا ہے رندا کیا ہے آری کیا ہے۔ ہمارے سیانے جانتے ہل کیا ہے، گاہی بیجائی کیا ہے۔ہم بچپن سے جو کام باپ دادا کو کرتے دیکھتے ہیں وہ بنا سکھائے سیکھ جاتے ہیں۔جیسے آپ نے زرعی ادارے میں اتنی عزت کمائی۔آخر خون میں شامل ہے کھیتی باڑی۔''

میرے ذہن میں پرانی یادوں کا جھما کا ہوا۔

اسّی کی دہائی میں، میں نے کئی یورپی ممالک کے دورے کیے۔اٹلی تو ایسا ہی ہے ہمارے پرانے شہروں جیسا۔ وہی گنجلگ گلیاں مگر ہیں بہت صاف ستھری۔ موسم بھی وہاں کا کھلا ہے یورپ جیسی سردی نہیں۔اٹلی میں پیدل بہت گھوما ہوں۔سفر کے لیے ملا کچھ بجٹ بھی بچا لیتا تھا۔تب وفود کے تبادلے ہوتے تھے۔اسی سلسلے میں ہالینڈ میں ایک فیملی کا مہمان بنا۔کلچر ایکسچینج کا بہانہ تھا۔وہاں کے صحافی ہمارے ملک کی بڑی گھٹیا تصویر کشی کرتے ہیں۔غربت جہالت گندگی کے ڈھیر۔ننگ دھڑنگ بچے۔ ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں۔ میں ساتھ وڈیو ٹیپ لے کر گیا تھا جس میں پنجابی زمیندار گھر کی شادی کی عکس بندی تھی۔ گھوڑی کی باگ پکڑے بہنیں نیگ وصول کر رہی تھیں۔ ہماری شملہ والی پگڑی، کھسے، نائی کے پکائے شادی کے روایتی کھانوں کی دیگیں ، ماں باپ بچے ہمارا مشرقی خاندانی نظام سب ان تصاویر میں یکجا تھا۔وہ ڈچ ان تصاویر کو بغور دیکھتا رہا پھر کہنے لگا ہم نے اس نظام سے آزادی پا لی ہے، اسی لیے اتنی ترقی کی ہے۔ ہمارے بچے اپنی مرضی میں آزاد ہیں۔اپنی تعلیم اپنے پروفیشن میں آزاد ہیں۔کوئی روک ٹوک نہیں۔

''اتنی آزادی سے بگڑتے نہیں کیا۔ ہر آزادی......؟ پینے کی بھی؟

میں نے سوال داغا

''بھئی جس نے بگڑنا ہے وہی بگڑے گا اور جو محنت کرے گا اسے یہ ملک اور حکومت ہر سہولت دیتے ہیں آگے بڑھنے کی۔ وہ اپنے ہنر کے بل بوتے پر آگے آتا ہے اور ملک کو آگے لے جاتا ہے۔میری مانیں تو آپ بھی چھوڑیں یہ خاندانی پیشے اور وراثتی جبر۔ ماں باپ کی نگرانی، آپ کا مشترکہ خاندانی نظام مسائل کی جڑ ہے۔میں ہوں میری بیوی ہے، دو بچے ہیں جو اپنی مرضی میں آزاد ہیں۔ بالغ ہوں تو اپنی پسند سے رہیں کمائیں دوستیاں پالیں۔حتیٰ کہ مذہب کے انتخاب میں بھی آزاد ہیں وہ۔محبت اور شفقت کے نام

پر بندھن اور بیڑیاں بنا رکھی ہیں آپ کے سماج نے۔

کھانے کے دوران اس نے اپنی بیوی کہ دریافت کیا کہ روز ہپ جیم Rose Hip Jam کہاں ہے؟

اس نے جیم کا جار میز پر پہ لا دھرا۔ وہ پھر گویا ہوا۔ ہمارے پھول دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جیسے آپ کی نہریں مشہور ہیں یہ روز ہپ جیم میری ماں نے گھر پر بنایا اور بطور خاص میرے لیے بھیجا۔ آپ بھی چکھیے۔

میں نے شیشے کے جار میں سے ایک چمچ بھر کر اپنی پلیٹ میں نکالا۔ جیم خوش ذائقہ اور خوشبودار تھا۔

میں نے کہا۔

''اچھا اگر یہ خاندان یہ رشتے ناطے کچھ نہیں تو تمھاری ماں نے تمھارے لیے یہ روز ہپ جیم کیوں بنایا۔ تم اتنے اہتمام سے اسے کیوں کھاتے ہو۔''

وہ چپ ہو گیا۔

''کب ملے تھے ماں سے؟ کیا وہ قریب ہی رہتی ہیں بہت پیار ہوگا تم سے؟'' اس کے دل پر شاید ہلکا سا گھونسا پڑا تھا۔

مگر میرے دل پر بہت زور کا گھونسا پڑا ہے۔ ماں بہت اکیلی ہوگئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے...... بیوگی میں ماں جی نے کس طرح زمینیں سنبھالیں۔ مزارعوں کے سر پہ کھڑی ہو کے کام کرواتیں۔ پانی کی باری کا دھیان فصلوں کی بوائی کٹائی یہاں تک کہ گندم گاہنے کے وقت بھی موجود ہوتیں۔ مجھے انہوں نے پڑھائی کے لیے ہر طرح کی سہولت اور فراغت دی۔ میں بڑا شائستہ مزاج تھا مگر اپنی روایتوں اور اصولوں کا پکا۔ ماں اور میں جب گاؤں سے لاری میں بیٹھ کر لائلپور آتے تو میں بڑی سختی کہ کہتا کہ منہ ڈھانپ کر رکھیں۔ کئی بار گرمی ہوتی تو چادر نہ کھولنے دیتا۔ بڑھاپے میں ماں کی بھنوؤں کے بال بہت بڑھ گئے وہ اکثر مجھے کہتی اکبر پتر آنکھوں میں بال چبھ رہے ہیں۔ میں کچھ نہ کرتا۔ بھنوئیں منڈوانا ممنوع ہے بس یہ پتا تھا۔ اب میری وہی ماں والی عمر ہے حجام خط بناتا ہے۔ کانوں اور بھنوؤں میں سے فالتو بال قینچی سے کاٹ دیتا ہے بڑا سکون ملتا ہے۔ کاش میں ماں کی بھنوؤں کے بال کاٹ دیتا۔ اب تو ساری لڑکیاں پلکنگ کرواتی ہیں کوئی منع نہیں کر سکتا۔ پچھلے ماہ میرے منجھلے بیٹے کی شادی تھی۔ شادی کی اگلی صبح بہو بھرے گھر میں ننگے سر چہکتی پھر رہی تھی۔ میری بہن نے سخت اعتراض کیا تو بہو نے کورا سا جواب دیا کہ دوپٹہ تو آؤٹ آف فیشن ہے اب کون لیتا ہے۔

میں چپ چاپ وقت کی کروٹیں دیکھتا رہتا ہوں۔ اب اعتراض نہیں کرتا۔ مگر دل پر زور سے

گھونسا پڑا ہے۔

انڈیا کے لوگ بھی ورلڈ بنک یا اقوام متحدہ کے تعاون سے ایسے دوروں پر آتے تھے۔ زرعی سائنسدانوں سے اچھی گفت وشنید تھی۔ وہ بجٹ بڑی احتیاط بلکہ بخیلی سے استعمال کرتے۔ مجھے وہاں کے ایک سرکاری افسر نے بتایا کہ واپسی پہ اسکا آڈٹ ہوگا ساری رقم کا۔ یہ کیمرہ وہ ساتھ دہلی سے لایا تھا۔ ائیر پورٹ پر رکارڈ میں درج کروا دیا تھا۔ واپسی پر چیکنگ ہوگی۔ ہم نے جی کھول کر سرکاری بجٹ استعمال کیا۔ جو رقم بچی یا پیدل گھوم پھر کر بچائی جاتی اس سے سرخی پوڈر پرفیوم اور بچوں کی جیکٹیں خرید لی جاتیں۔ کہیں تو گڑ بڑ تھی ہماری نسل کے پڑھے لکھے سرکاری مراعات یافتہ طبقے میں۔ کہیں تو ہم سے کوتاہیاں ہوئی ہیں۔

دل پہ پھر ایک گھونسا پڑتا ہے۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے دنیا سے، زراعت میں بھی۔ کئی بار گندم تک درآمد کرنا پڑتی ہے۔ باغات سکڑتے جا رہے ہیں۔ جانے چند ماہ سے مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا ہے کہ جتنے کام اتنے علم اور عہدے کے ساتھ میں کر سکتا تھا وہ نہیں کر پایا۔ اب تو مقالوں اور تحقیق کے نام پر مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے۔ سارا زور فقط اچھی نوکری کے حصول پہ ہے۔ لیکن خرابی کی جڑ تو بہر حال کہیں پیچھے ہوگی۔ میں وقت اور روایات کو بدلنے سے نہیں روک سکا...... نہ روک سکتا تھا۔ تو پرانے وقت میں اپنی عورتوں کو وہ سہولت اور آزادی کیوں نہ دی جس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔ ترقی تبادلے دفتری نظام کی ریشہ دوانیاں اگلا گریڈ، بڑے عہدے کی الجھنوں نے بہت مصروف رکھا۔ کتنے ہی اہم کام رہ گئے جواب یاد آنے لگے ہیں۔

لوہڑی کا تہوار ہے۔ سخت سردی ہے۔ بیلنے چل رہے ہیں میں دہکتے کڑاہ کے مزید قریب ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔ گنے کا رس نکالنے کے بعد خشک چھال کڑاہ کے نیچے جل رہی ہے۔ دھوئیں میں مولیسز کی خوشبو رچی ہے۔

''بھائی رب نواز اتنا رس باقی رہ جاتا ہے گنے میں؟''

''ہاں......!''

رب نواز بھائی نے جواب دیا۔

''شوگر ملوں میں تو اتنا کرش کرتے ہیں کہ گنے کا بھوسا بن جاتا ہے بالکل۔ مگر شوگر ملوں میں چھوٹا کاشتکار بڑا خوار ہوتا ہے۔ رقم وقت پر نہیں ملتی۔ ہاں بڑے زمیندار یا جاگیر والوں کی بات اور ہے۔ ہمیں یہ گڑ شکر ہی ٹھیک ہے۔ اچھا بھاؤ مل جاتا ہے۔''

میں خشک چھال کڑاہ کے نیچے دھکیلتا ہوں......سوچتا ہوں کہ اس پروردگار نے کتنا نوازا ہے۔ مگر ہوں تو میں اسی مٹی کا انہیں کھیتیوں کھلیانوں کا۔ اپنی اصل نہیں بھولنی چاہیے۔

ایک درد بھری لہر سینے سے اٹھ کر حلق تک جاتی ہے۔

کونسی اصل؟

مجھے بڑا شوق تھا اپنی زمینوں میں جدید طریقے سے کاشت کاری کرواؤں۔نوکری اور دفتری الجھنوں نے فرصت نہ دی تو سوچا ریٹائرمنٹ کے بعد یہ شوق پورا کروں گا۔مگر ریٹائرمنٹ سے چند ماہ پہلے ہی پورا مربع زمین بیچ دی۔جسم میں اتنی توانائی نہ تھی کہ کاشت کاری کرتا۔چاروں بیٹے پڑھ لکھ کر بھاری تنخواہوں پر ملازمتیں کر رہے ہیں۔ایک سول انجینئر ہے امارات میں، دوسرا بینکر ہے، تیسرا ملٹی نیشنل ادارے میں ہے اور چوتھا ٹیکسٹائل اینڈ پاور گروپ آف انڈسٹریز میں منیجر ہے۔

شہر چاروں طرف سے ورم کی مانند پھیل رہے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ قومی شاہراہ پر بیسوں ٹیکسٹائل اور شوگر ملیں ہیں۔لاتعداد ہاؤسنگ سوسائٹیوں نے زرخیز زرعی زمینیں خرید کر پلاٹ بنا کر بیچے۔گاؤں کے گاؤں ختم ہو گئے ان سوسائٹیوں کے ملبے تلے۔میں کھیت بیچنے کے حق میں نہیں تھا۔زمین کسان کی ماں ہوتی ہے مگر بیٹوں نے باپ کو سمجھایا کہ وقت بدل چکا ہے۔مل والے مہنگے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔وہاں ورکرز کی رہائشی کالونی بنے گی۔ہم میں سے کوئی گاؤں جا کر بسنا نہیں چاہتا۔مزارعوں پہ زمین چھوڑے رکھیں تو کیا فائدہ۔

میں کیا کہتا بھلا۔جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے مگر اس ہونی کا بیج ہم زمین میں مدتوں پہلے بو چکے ہوتے ہیں جسے بالآخر ہمیں گاہنا پڑتا ہے۔

اپنی ملازمت میں میری بڑی کوشش رہی کہ کسی کسان کو جو رہنمائی چاہیے وہ اسے لازمی ملے۔اپنے گاؤں سے تو جس کسی کو نئی ورائٹی کا بیج درکار ہوتا یا زمین کا پانی ٹیسٹ کروانے آتا، ہر کام ترجیحی بنیاد پر کرواتا۔

مجھے لگ رہا ہے رب نواز بھائی کے کھیتوں میں دھیرے دھیرے کلر سر اٹھا رہا ہے۔مگر یہ کلر نہیں ہے کچھ اور ہے۔جیسے نہری پانی نہیں مل رہا اور ٹیوب ویل کا بھاری پانی زمین کو بوجھل بنا رہا ہے۔گاؤں کیگر داب اوڑیوں کی بجائے شاپروں سے اٹے کچرے کے ڈھیر نظر آئے۔ایک تو اس نامراد۔پولیتھین نے زمین کا بڑا ناس مارا ہے۔

انہیں سوچوں میں بھٹک رہا تھا کہ جاٹوں کا لڑکا چائے بسکٹ اور ابلے انڈے پلیٹ میں سجائے آن موجود ہوا۔شکر ہے مہمان نوازی کی روایت باقی رہ گئی ہے۔

''پائی رب نواز! میں نے سنا مل والے آپ سے زمینوں کی خریداری کی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں کر رہے تھے۔مگر ہم نہیں بیچ رہے۔اب تو ریٹ بھی بہت کم لگا رہے ہیں پھر فائدہ کیا۔گھر کا اناج تو آتا ہے نا یہاں سے۔بھلے زمین خراب ہوتی جا رہی ہے۔زرخیزی وہ نہیں رہی۔''

''ہاں...... میں جب سے آیا ہوں یہی تو دیکھ رہا ہوں۔ ٹیوب ویل کا پانی بوتل میں ڈال کر دینا۔ میں لیبارٹری سے ٹیسٹ کروادوں گا۔ مٹی کے سیمپل بھی ساتھ دینا۔ پتا تو چلے۔''

رب نواز خاموشی سے چائے پی رہا ہے۔

بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھ کر دور پرے سے سر اٹھاتی اس چھوٹی سی پہاڑی کی جانب غور سے دیکھتا ہوں۔ جب سے آیا ہوں دو تین بار ادھر دھیان گیا ہے مگر پوچھا نہیں۔ ہمارے گاؤں کی طرف نہ کوئی دریا ہے نہ ہی مٹی یا ریت کے ٹیلے۔ جانے یہ پہاڑی نما ٹیلہ کب اور کیسے بنا۔ چند سال قبل تو ایسا کوئی ٹیلہ کھیتوں کے بیچ موجود نہیں تھا۔

''بھائی رب نواز! یہ پہاڑی ٹیلہ کیسا ہے کب اور کیسے بنا۔ چند سال پہلے تو نہیں تھا؟''

''پہاڑی ٹیلہ......؟''

''یہ پہاڑی نہیں زہر کا پہاڑ ہے۔ مل والوں نے اپنی مل کے پیچھے جو کھیت کسانوں سے مہنگے ریٹ پر خریدے تھے وہاں نہ ملازموں کے رہائشی کواٹر بنے۔ نہ ہی کوئی مشین لگی۔ وہاں تو مل والے اپنا کچرا پھینکتے ہیں دھاگے ملا نمک...... وہ کیا کہتے برائین اور کپڑا رنگنے کے ویسٹ کیمیکلز۔''

''تو یہ پورا ٹیلہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنا صنعتی فضلہ ہے؟''

''ہاں اور کیا۔''

''اوہ میرے خدایا!''

میرے دل پر ایک شدید گھونسا پڑتا ہے۔ اسی ٹیکسٹائل مل والوں کی پاور انڈسٹری میں میرا بڑا لڑکا نوکری کرتا ہے۔

آگے جا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شاید یہ وہی مربع ہے۔ میں ایک زرعی سائنسدان ہوں۔ کیلیفورنیا پیرنٹ پلانٹ روز ہپ جیم، ہارٹی کلچر نمک کا پہاڑ

حق ہا...... یہ میرے ہی کھیت ہیں۔

◄◄ ● ►►

Al-Safa, Dist- Jaddah
Saudi Arabia (U.A.E)
Mob: 00966564274322

● اشعر نجمی

سپریم لیڈر کا جوتا

امین کے لیے یہ دن رنگوں کا نہیں، بلکہ جوتوں کا تھا۔

وہ ایک ایسے جنگل میں تھا جہاں درختوں کی جگہ مردوں کی ٹانگیں تھیں اور پودوں کی جگہ ان کے جوتے۔ کالی شلواروں کے نیچے سے جھانکتے ہوئے چمڑے کے چمکدار بوٹ، خاکستری پتلونوں کے نیچے دھول بھرے اسنیکرز، اور کہیں کہیں ننگے پیر جن کی ایڑیاں تارکول کی گرمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔

امین کو اپنی ناک کے قریب پسینے اور گلاب کے عرق کی ایک ایسی بو محسوس ہو رہی تھی جو اتنی گاڑھی تھی کہ اسے لگتا تھا وہ اسے چھو سکتا ہے۔

''امین، میرا ہاتھ مت چھوڑنا!'' ابا کی آواز ہجوم کے شور میں دبی ہوئی تھی۔

ابا کا ہاتھ گیلا اور سخت تھا۔ امین کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہجوم کا دباؤ اسے کسی ربر کی گیند کی طرح ادھر سے اُدھر پچکا رہا ہے۔ اسے اوپر کا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، نہ وہ کالی جھنڈیاں جن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے سنائی دے رہی تھی، اور نہ وہ بلند و بالا تصویریں جن کے بارے میں ابا کہہ رہے تھے کہ وہ عظیم سپریم لیڈر ہیں۔

امین کو عظمت کا اندازہ ان پتلونوں کے کپڑے سے ہو رہا تھا جو اس کے چہرے سے رگڑ کھا رہے تھے۔ کچھ کپڑے کھردری جینز کے تھے، کچھ نرم سوتی، اور کچھ اتنے مہنگے اور ملائم کہ امین کا جی چاہا وہ اپنا گال ان سے ٹکا دے۔

اچانک ایک تال بند آواز ابھری۔ دھپ......دھپ......دھپ!

ہزاروں ہاتھ ایک ساتھ سینوں پر گر رہے تھے۔ امین کو یہ آواز کسی بڑے انجن کے پسٹن جیسی لگی۔ ہر دھپ کے ساتھ زمین کے اندر سے ایک تھرتھراہٹ اُٹھتی اور امین کے جوتوں کے تلووں سے ٹکراتی۔ اسے لگا کہ یہ سڑک نہیں ہے، بلکہ کسی بڑے دیو کا سینہ ہے جو دھڑک رہا ہے۔

''وہ آ گئے! وہ آ گئے!''

ہجوم میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ ٹانگوں کا وہ جنگل اب ایک طرف کو جھکنے لگا۔ امین کو ایک جھٹکا لگا

اور وہ ابا کے گھٹنوں سے جاٹکرایا۔

اوپر کی طرف ایک اونچالکڑی کا تختہ گزر رہا تھا، جس پر سبز مخمل کا کپڑا پڑا تھا۔ امین نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسے لیڈر کا چہرہ نظر نہیں آیا، اسے صرف وہ جگہ نظر آئی جہاں سے تختہ ختم ہو رہا تھا۔

وہاں دو پاؤں تھے۔

وہ پاؤں ساکت تھے، بالکل ویسے ہی جیسے امین کے ان پلاسٹک کے سپاہیوں کے ہوتے ہیں جنھیں جوڑنے والے بلاکس (Lego) کے اوپر کھڑا کیا جاتا ہے۔ ان پیروں میں ہوتے سیاہ رنگ کے چمڑے کے جوتے تھے۔

امین کی آنکھیں وہیں جم گئیں۔ وہ جوتے بالکل ویسے ہی تھے جیسے ابا دفتر جاتے وقت پہنتے ہیں۔ ان پر تسموں کی گانٹھ اتنی صفائی سے لگی تھی جیسے کسی نے ریاضی کا کوئی مشکل سوال حل کر دیا ہو۔ لیکن ان جوتوں پر تہران کی سڑکوں کی خاک کی ایک باریک، میالی تہ جمی تھی۔

''اتنے بڑے آدمی کا جوتا گندا کیوں ہے؟'' امین نے سوچا۔

اس کے ذہن میں یہ سوال ایک عجیب سی لرزش پیدا کر رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ سپریم لیڈر بادلوں کے اوپر رہتے ہیں اور فرشتے ان کے خادم ہیں۔ اگر ایسا ہے، تو کیا فرشتوں کے پاس جوتا پالش کرنے والا برش نہیں ہوتا؟ یا کیا لیڈر پیدل چل کر اس تختے تک آئے تھے؟

ہجوم اب دیوانہ وار نعرے لگا رہا تھا۔ امین نے دیکھا کہ ایک آدمی جو اس کے بالکل پاس کھڑا تھا، زار و قطار رو رہا تھا اور اس کے آنسو اس کے مہنگے جوتے پر گر رہے تھے۔ امین کو دکھ ہوا کہ آنسوؤں سے جوتے کی پالش خراب ہو رہی ہے۔

اس نے دوبارہ اوپر ان ساکت جوتوں کو دیکھا۔ وہ جوتے اب آہستہ آہستہ دور جا رہے تھے۔ امین کو لگا کہ وہ جوتے اب کبھی نہیں چلیں گے۔ ان کا سفر ختم ہو گیا تھا لیکن وہ اب بھی ان پیروں سے چمٹے ہوئے تھے، جیسے انھیں ڈر ہو کہ اگر وہ الگ ہوئے تو راستہ بھول جائیں گے۔

''ابا......!'' امین نے ابا کی قمیص کھینچی۔

''کیا وہاں نیچے بھی سڑکیں ہیں؟'' ابا نے نہیں سنا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں تھے، جہاں صرف نعرے تھے اور آنسو۔

امین نے اپنا پیر زمین پر رگڑا۔ اس نے سوچا، اگر وہ مر گیا تو کیا اسے بھی اپنے جوتے ساتھ لے جانے ہوں گے؟ یا کیا وہ اپنے پسندیدہ روئیں والے جوتے (Nap) وہیں چھوڑ دے گا تاکہ کوئی دوسرا بچہ

ان سے کھیل سکے؟

اسے ان کالے جوتوں کی خاموشی بہت ڈراؤنی لگی۔

جیسے جیسے جنازہ آگے بڑھ رہا تھا، زمین سے اُٹھنے والی دھول امین کے حلق میں خشک مٹی کا ذائقہ بھر رہی تھی۔ اب ٹانگوں کا وہ جنگل پہلے سے زیادہ گنجان ہو گیا تھا۔ امین نے دیکھا کہ لوگوں کے جوتے اب ایک دوسرے پر چڑھ رہے تھے۔ ایک بھاری چمڑے کا بوٹ ایک نیلے اسنیکر کی ایڑی کو کچل رہا تھا، اور ایک ٹوٹی ہوئی چپل سڑک کے گرم تارکول پر کسی مردہ مچھلی کی طرح پڑی تھی۔

اوپر تختے پر موجود وہ سیاہ جوتے اب بھی ساکت تھے۔

امین نے سوچا کہ اگر یہ جوتے زندہ ہوتے تو کیا یہ اس ہجوم کے دباؤ سے ڈر کر بھاگنے کی کوشش کرتے؟ لیکن وہ تو ایسے پڑے تھے جیسے انھیں معلوم ہو کہ اب انھیں کہیں نہیں پہنچنا۔

وہ چلایا۔

''پاپا، کیا سپریم لیڈر کے پیروں میں جان ہے؟'' امین شور کے درمیان پاپا نے اس کا ہاتھ مزید سختی سے بھینچ لیا۔ ان کا چہرہ آنسوؤں اور دھول سے اٹا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ امین کو پہچان میں نہیں آ رہے تھے۔

''وہ اب خدا کے پاس جا رہے ہیں امین! خاموش رہو۔''

امین کو خدا کے پاس جانے کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے سنا تھا کہ خدا بہت دور آسمان پر رہتا ہے۔ اگر راستہ اتنا لمبا ہے، تو کیا یہ پرانے جوتے وہاں تک پہنچ پائیں گے؟ اسے یاد آیا کہ پچھلے سال جب وہ پہاڑ پر ہائیکنگ کے لیے گئے تھے، تو اس کے جوتے کا تلا (Sole) آدھے راستے میں ہی الگ ہو گیا تھا۔

اس نے غور سے ان سیاہ جوتوں کی ساخت کو دیکھا۔ ان کے چمڑے پر وہ باریک جھریاں تھیں جو بہت زیادہ چلنے سے پڑتی ہیں۔

''یہ جوتے تھک گئے ہیں۔'' امین نے سوچا۔

اچانک ہجوم میں ایک لہر اٹھی۔ لوگ جنازے کے تختے کو چھونے کے لیے ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔ امین کو محسوس ہوا کہ اس کے پیر زمین سے اُکھڑ گئے ہیں۔ وہ اب ابا کے ہاتھ اور ہجوم کے دباؤ کے درمیان ایک لٹکتا ہوا کھلونا تھا۔ اس کی نظر نیچے پڑی۔ زمین پر ایک کالا برش پڑا تھا، جو شاید کسی جوتا پالش کرنے والے کے تھیلے سے گرا تھا۔ اس برش کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس پر پالش کی سیاہی جمی تھیں۔ امین کو ایک عجیب سا خیال آیا۔ اسے لگا کہ اگر وہ کسی طرح اس تختے تک پہنچ جائے اور اس برش سے ان جوتوں کو ایک بار چمکا دے، تو شاید لیڈر دوبارہ چلنے لگیں۔ اسے یقین تھا کہ جوتے کی چمک ہی وہ

طاقت ہے جو پیروں کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

''دھپ......دھپ......دھپ!''

سینہ کوبی کی آواز اب امین کے سر کے اندر ہتھوڑوں کی طرح بج رہی تھی۔ وہ آواز اسے کہہ رہی تھی کہ اب وقت ختم ہو رہا ہے۔

ایک آدمی، جس نے کالی واسکٹ پہن رکھی تھی، ہجوم کو چیرتا ہوا جنازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنا رومال نکالا اور اسے لیڈر کے ان ساکت جوتوں سے رگڑنے لگا۔ وہ اس رومال کو تبرک بنانا چاہتا تھا۔ لیکن امین نے دیکھا کہ رومال رگڑنے سے جوتے کی دھول ختم نہیں ہوئی، بلکہ وہ مزید پھیل گئی تھی۔

''وہ اسے گندا کر رہا ہے!'' امین نے غصے سے سوچا۔

اسے ان لوگوں پر بھی غصہ آ رہا تھا جو رو رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے لیکن کسی کو یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ لیڈر کے جوتے اب اپنی چمک کھو چکے ہیں۔ امین کے لیے اس وقت پوری کائنات کا سب سے بڑا مسئلہ ان جوتوں کی پالش تھی۔

تختہ اب قبرستان کے گیٹ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہاں کی مٹی سفید اور باریک تھی جو ہوا میں اُڑ کر لوگوں کے کپڑوں کو خاکستری کر رہی تھی۔ امین نے دیکھا کہ ابا نے اپنا سر جھکا لیا ہے اور وہ ہچکیوں سے رو رہے ہیں۔ امین نے ابا کے جوتوں کو دیکھا۔ وہ بالکل صاف تھے۔ صبح گھر سے نکلتے وقت ابا نے انھیں بہت محنت سے چمکایا تھا۔

''ابا کے جوتے زندہ ہیں، اس لیے چمک رہے ہیں۔''

امین نے منطق لگائی۔

''لیڈر کے جوتے مر گئے ہیں، اس لیے وہ مٹیالے ہو گئے ہیں۔''

اس نے سوچا، کیا موت ایک ایسی چیز ہے جو جوتوں کی پالش کھا جاتی ہے؟ یا کیا مٹی انسان سے پہلے جوتوں کو اپنی طرف بلاتی ہے؟

جنازہ اب ایک گڑھے کے قریب رک گیا تھا۔ امین کو وہاں سے صرف وہ لکڑی کا تختہ نظر آ رہا تھا جو اب آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جھک رہا تھا۔ سیاہ جوتوں کی نوکیں اب آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، جیسے وہ آخری بار ستاروں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

قبرستان کی مٹی کا رنگ تہران کی سڑکوں کے تارکول سے بالکل مختلف تھا۔ یہ مٹی پیلی، خشک اور کچھ زیادہ ہی خاموش تھی۔ امین نے دیکھا کہ ہجوم اب ایک دیوار کی طرح ساکت ہو گیا ہے۔ اب کوئی نعرہ

نہیں تھا، صرف اجتماعی سسکیاں تھیں جو ہوا میں اُڑتی ہوئی دھول کے ساتھ مل کر فضا کو بوجھل کر رہی تھیں۔تختہ اب قبر کے دہانے پر تھا۔امین ابا کی ٹانگوں کے درمیان سے جھانک رہا تھا۔اس کی پوری کائنات اب ان دو سیاہ جوتوں تک محدود تھی جو تختے کے کنارے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔اسے حیرت ہوئی کہ جوتے گر کیوں نہیں رہے؟ کیا انھیں پیروں نے اب بھی اتنی ہی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے جتنا وہ زندہ ہوتے وقت پکڑتے تھے؟

''بسم اللہ وفی سبیل اللہ......''

جب تختے کو جھکایا گیا، تو امین نے دیکھا کہ جوتوں کی نوکیں ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف سیدھی ہوئیں، جیسے وہ اوپر کی طرف اُڑنے والے جہازوں کا رخ دیکھ رہی ہوں۔ پھر، وہ آہستہ آہستہ اندھیرے گڑھے میں اترنے لگے۔

پہلا جوتا غائب ہوا۔ پھر دوسرا۔

امین کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی پسندیدہ فلم کا آخری سین کاٹ دیا ہو۔ وہ جوتے اب وہاں نہیں تھے جہاں انھیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اب اس نیچے والی دنیا کا حصہ بن چکے تھے جہاں کوئی فٹ پاتھ نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی ٹریفک سگنل۔

''دھپ!''

مٹی کا پہلا بوجھل ریلا نیچے گرا۔امین نے غور سے سنا۔ یہ آواز ویسی نہیں تھی جیسی مٹی زمین پر گرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز چمڑے پر مٹی گرنے کی آواز تھی۔ ایک ایسی آواز جس میں کوئی بازگشت نہیں ہوتی۔امین نے سوچا، کیا مٹی لگنے سے جوتے کا چمڑا خراب ہو جائے گا؟ کیا وہاں نیچے کوئی موچی ہوتا ہے جو ہر صبح لیڈر کے جوتوں کو دوبارہ چمکاتا ہے؟ اسے یاد آیا کہ ابا کہتے تھے کہ وہاں صرف اعمال دیکھے جاتے ہیں۔

''اگر وہاں صرف اعمال دیکھے جاتے ہیں، تو پھر جوتے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟''

امین نے اپنی ٹھوڑی ابا کے گھٹنے پر ٹکا دی۔

قبر اب بھرتی جا رہی تھی۔ مٹی اب جوتوں کے تسموں تک پہنچ گئی ہوگی۔امین کے ذہن میں ایک تصویر ابھری: وہ سیاہ جوتے اب مٹی کے اندر دبے ہوئے ہیں، ان کے تسمے اب کبھی نہیں کھلیں گے، اور ان کی پالش اب ہمیشہ کے لیے اس پیلی مٹی کے نیچے چھپ گئی ہے۔

ہجوم اب دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ ابا نے امین کا ہاتھ پکڑا اور اسے مڑنے کا اشارہ کیا۔

''چلو امین، دعا مانگو'' ابا نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔امین نے مڑ کر ایک آخری بار

اس ڈھیر کو دیکھا جہاں اب صرف مٹی کا ایک اُبھار تھا۔ اسے لگا کہ وہ اُبھار کسی جوتے کے تلوے جیسا ہے۔

واپسی کے راستے میں امین بالکل خاموش تھا۔ وہ اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا جو چلتے وقت قبرستان کی مٹی میں لت پت ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی قمیض کے دامن سے اپنے جوتے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

''تم کیا کر رہے ہو؟'' ابا نے پوچھا۔

''میں انھیں پالش کر رہا ہوں۔'' امین نے کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ جب میں سو جاؤں، تو میرے جوتے اتنے گندے ہوں جتنے سپریم لیڈر کے تھے۔''

ابا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا، وہ امین کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔

◄◄ ● ►►

B-403, Saubhagya Park,
N.H. Road, Opp. Asmita College,
Mira Road East,
Dist. Thane- 401107
Mob. 9372247833

نام کتاب: نثری اصناف ادب اور طنز و مزاح کی روایت صنف: تنقید مصنف: اقبال حسن آزاد سن اشاعت: ۲۰۲۵ صفحات: ۲۶۳ قیمت: ۵۰۰/روپے مصنف کا پتہ: Shah Colony Shah Zubair Road, Munger Bihar 811201		نام کتاب: رانگ نمبر صنف: افسانہ مصنفہ: نشاط پروین سن اشاعت: ۲۰۲۴ء صفحات: ۱۴۴ قیمت: ۲۵۰/روپے مصنفہ کا پتہ: Shah Colony Shah Zubair Road, Munger Bihar 811201

● ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

عبرت سرا

بچوں کی باتیں سن کر ماسٹر جی نے عینک ٹھیک کی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔

سامنے کی جھونپڑی میں ٹمنا ہریجن کی زندگی آج بھی ویسی ہی ہے جیسے پریم چند نے دیکھی تھی۔ ٹمنا شراب پی کر گھر کے دروازے پر دائیں کروٹ اجگر کی طرح کنڈلی مارے سویا ہے اور اول فول بک رہا ہے۔ منہ سے شراب کی بدبو آ رہی ہے۔ کلّے پر ایک ایک انچ کی بے ترتیب سیاہ و سفید داڑھی، جھولے کی طرح لٹکتی ہوئی کالے اور لال دھاری والی ٹی شرٹ جس کے ایک کو چھوڑ کر باقی سب بٹن کھلے ہوئے ہیں...... گھٹنے تک خاکی نیکر، پچکے گال، دھنسی ہوئی آنکھیں، اکا دکا ابرو بھی سفید ہو گئے ہیں۔ سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو لگاتار گندی اور بھدی گالیاں دے رہا ہے اور وہ بالٹی میں کپڑا ڈبو ڈبو کر فرش پونچھتی جا رہی ہے۔ اپنی بگلے جیسی لمبی ٹانگ اٹھا کر فرش پونچھتے ہوئے اُس نے کہا:

''چل ہٹ! ماں باپ کا جیسا سنسکار ہوگا ویسی اُس کی اولاد ہوگی۔ دن بھر گلاس ڈھالتا رہتا ہے اور بک بک کرتا رہتا ہے۔''

وہ نشے کی حالت میں پلٹ کر بولا:

''یہ سنسکار میرے ماں باپ نے نہیں بنایا۔ اسے تو بھگوان نے بنایا ہے۔ تم کو نہیں معلوم؟ اس دن کتھا سناتے ہوئے پنڈت جی کہہ رہے تھے کہ اس سنسار کو چلانے کے لیے برہما نے اپنے جسم سے چار دانوں کو جنم دیا۔ ان کے مطابق وشنو کے منہ سے برہمن، بازو سے چھتری، جانگھ سے ویشیے اور پیر سے شودر پیدا ہوئے۔ اگر ہمارا جنم بھی بھگوان پیر سے نہیں، منہ سے کرتا تو ہم بھی آج مندر میں بیٹھ کر ٹھاٹھ سے شنکھ بجاتے۔ پر بھاگ کا لکھا کون کاٹ سکتا ہے، سوائے وشنو کے!''

اتنا کہہ کر وہ کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن قدم ڈگمگائے اور فرش پر دھڑام سے منہ کے بل گر پڑا۔ ہونٹ کٹ گئے، خون بہنے لگا۔ بیوی نے بالٹی پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

''لے، دیکھ لے بھگوان پر اُلجھن لگانے کا پھل!''

پھر رونی صورت بنا کر اس کے ہاتھ اور منہ کو پانی سے صاف کیا، ایک کروٹ کونے میں سلا دیا

اوراس کے لیے روٹی پکائی۔ رات کی بچی ہوئی آلو کی بھاجی اور گرم روٹی پلیٹ میں رکھ کر اسے کھانے کے لیے جگایا۔ پہلے تو اس نے بھدی گالی دی، پھر کانپتے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر بولا:

''تو میری سیتا، میں تیرا رام!''

وہ تیکھی نگاہ سے دیکھ کر بولی: ''چل ہٹ! تو میرا رام نہیں، راون ہے۔''

وہ زور سے ہنسا اور بولا: ''نہیں نہیں، میں نے تیرا چیر ہرن نہیں کیا، رانی! اگنی کے سات پھیرے گھوم کر تیرے باپ نے میرا کنیادان کیا ہے۔''

جب اس کی غنودگی کم ہوئی تو شرمندگی کا احساس ہوا۔ دوسرے دن اپنے بیٹے بٹّو کو گود میں لے کر گاؤں کے پاٹھ شالہ پہنچا اور دور سے آواز لگائی:

''ماسٹر جی، ڈنڈوت! آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''بول ٹمنا!''

''کہنا یہی ہے مہاراج، آپ جانتے ہیں کہ نجاست صاف کرنا اور سور چرانا ہمارا پشتینی پیشہ ہے، لیکن جب سے سرکار نے سینیٹری سسٹم شروع کیا ہے، ہماری روزی روٹی پر اثر پڑا ہے۔ اور ہم بھی نہیں چاہتے کہ ہماری اولاد یہی کام کرے۔ اس لیے بٹّو کو اسکول میں بھرتی کرانا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر سور کون چرائے گا؟''

ٹمنا کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا:

''سور چرانے والے چرائیں گے۔''

ماسٹر جی نے پس وپیش کے بعد رجسٹر کھولا، داخلہ فارم دیا اور کہا:

''دیکھ ٹمنا، سب کتے کاشی نہیں جاتے!''

ٹمنا نے پیلے دانت نکالے اور بیٹے کو پیر چھونے کا اشارہ کیا۔ ماسٹر جی نے پیر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

''رام رام! کیسی بات کرتے ہو؟''

اگلے دن ٹمنا کپڑے کے تھیلے میں ایک پتھر کی سلیٹ، گیان بھارتی، بال بھارتی، سولبھ گنیت اور کھری مٹی کی پنسل رکھ کر بٹّو کو اسکول چھوڑنے آیا۔ گیٹ پر پہنچ کر بولا:

''دیکھ بٹّو، اس سے آگے میں نہیں جا سکتا۔ میری کامنا ہے کہ تو یہاں سے بہت آگے جا...... اتنا آگے کہ دکھائی نہ دے۔''

درجہ سوم میں ایک دن بٹّو نے چاہا کہ رام اوتار کی باؤلی سے پانی لا کر ماسٹر جی کو دے۔ اس نے

گھڑا اور گلاس اٹھایا ہی تھا کہ شور مچ گیا۔ دربان دینا ناتھ نے شکایت کی۔ ماسٹر جی نے ڈانٹ کر کہا:

''ارے بٹّو! یہی سب کرنے اسکول آئے ہو؟ ہمارا دھرم بھرسٹ کرو گے؟ آئندہ یہ سب مت کرنا!''

پھر بولے:

''تم ہمارے کھانے پینے کے سامان کو نہیں چھو سکتے۔ جا، اس گھڑے کو کچرے میں پھینک آ!''

اور خود گلاس کو کھڑکی سے باہر نالے میں پھینک دیا۔ گلاس کے ساتھ بٹّو کا دل بھی ڈوب گیا۔

مگر وہ پڑھتا رہا۔ اسکول فائنل پاس کیا، یونیورسٹی پہنچا، مقابلہ جاتی امتحان پاس کیا اور آخر کار ضلع کلکٹر بن گیا۔ لیکن اس کا باپ ٹمنا آج بھی گیٹ کے باہر ہی کھڑا رہا۔

خبر پھیلنے پر ماسٹر جی مبارک دینے آئے۔ نیم کے نیچے بیٹھے، تعریفیں کیں اور بچوں سے کہا:

''یہ تم سب کے لیے پریرنا شروت ہے۔ آج یہ ضلع کلکٹر ہے۔ ہمیں ایسے ودیارتھی پر گورو ہے۔''

بٹّو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے پیتل کا نیا گلاس منگوا کر لسّی پیش کی۔ ماسٹر جی نے بڑے شوق سے پی اور کہا:

''بٹّو، اس سفر میں اور آگے جا...... ستاروں سے آگے...... جہاں تمہیں کوئی چھو نہ سکے!''

کچھ دن بعد ایک بچے نے کلاس میں کہا:

''ماسٹر جی، جس کرسی پر آپ بیٹھے تھے، اب اس پر کوئی نہیں بیٹھتا۔ روز پرندے بیٹ کر جاتے ہیں۔''

ماسٹر جی نے کہا:

''بیٹے، اسی کو شردھا کہتے ہیں!''

پیچھے سے آواز آئی:

''اور جس گلاس میں آپ نے لسّی پی تھی، آپ کے جانے کے بعد اسے آگ پر جلا کر کنویں کے پانی میں ٹھنڈا کیا گیا۔ اب اس گلاس میں ان کے یہاں سور کے بچے دودھ پیتے ہیں!''

اچانک ''ڈب'' کی آواز آئی—

معلوم ہوا، اس بار گلاس نہیں، ماسٹر جی ڈوب گئے!

◄◄ ● ►►

H. No. 1-A B.L No. 23
Kela Bagan, Jagatdal
North 24 Pargana (W.B)
Pin :743125 Mob: 9339327323

● نشاط پروین

آخری امید

کچی بستی کی تنگ گلی میں واقع ٹین کی چھت والا چھوٹا سا گھر ہر صبح اندھیرے ہی میں جاگ جاتا تھا۔ ساجدہ دو گھروں میں برتن مانجھتی، تین گھروں میں جھاڑو پونچھا کرتی اور شام کو ایک بنگلے میں کھانا بنانے چلی جاتی۔ اس کا شوہر سلیم دن بھر رکشہ چلاتا، مگر شام تک اتنی ہی کمائی ہوتی کہ آٹا، نمک اور کبھی کبھار سبزی آجاتی۔

چھ بچے تھے۔ پانچ بیٹیاں اور ایک اکلوتا بیٹا...... پندرہ سالہ آصف۔

ساجدہ کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔ وہ سوچتی تھی کہ ایک دن یہی بڑا ہو کر اس کے ہاتھوں کی کھردری لکیروں کو آرام دے گا۔ مگر آصف نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ پہلے آوارہ لڑکوں کی صحبت اختیار کی، پھر سگریٹ، پھر جیبیں کاٹنے کا ہنر سیکھ لیا۔

''امّاں! میں اب بڑا ہو گیا ہوں، پیسے کما کر لاؤں گا۔''

وہ واقعی پیسے لاتا تھا، مگر ساجدہ ہر بار پوچھتی، ''بیٹا! یہ پیسے کہاں سے آئے؟''

اور ہر بار جواب بدل جاتا۔

ایک دن بازار میں لوگوں نے اسے ایک بوڑھے آدمی کی جیب کاٹتے ہوئے پکڑ لیا۔ خوب مار پڑی۔ پولیس آئی اور اسے لے گئی۔

چونکہ وہ نابالغ تھا، اس لیے اسے ریمانڈ ہوم بھیج دیا گیا۔

ساجدہ پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔

وہ صبح کام کرتی، دوپہر میں وکیل کے دفتر کے چکر لگاتی، شام کو تھانے میں منتیں کرتی۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنی دو چوڑیاں بیچ دیں، پھر کانوں کی بالیاں، پھر محلے کی عورتوں سے قرض لیا۔

وکیل ہر بار کہتا، ''بس تھوڑا سا اور خرچ ہوگا، پھر لڑکا باہر آجائے گا۔''

تھانیدار کی زبان بھی خاموشی سے رشوت مانگتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ساجدہ عدالت، تھانے اور ریمانڈ ہوم کے درمیان دھکے کھاتی رہی۔ آخر کار کافی رقم خرچ کرنے کے بعد آصف رہا ہو گیا۔

اس دن ساجدہ نے اسے سینے سے لگا کر اتنا روئی کہ اس کے آنسو آصف کی گردن تک بہہ گئے۔

''بیٹا! خدا کے لیے اب سیدھی راہ پر آجا۔میرے پاس اب کچھ نہیں بچا۔''

آصف خاموش رہا۔

چند دن واقعی وہ گھر میں رہا۔سلیم نے اسے رکشہ چلانا سکھانے کی کوشش کی،مگر وہ جلد ہی پرانے دوستوں کے ساتھ نکلنے لگا۔

اور پھر ایک شام......

دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔دو پولیس والے کھڑے تھے۔

''تمہارا لڑکا پھر پاکیٹ ماری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔''

ساجدہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے پولیس والوں کو دیکھا،پھر آسمان کی طرف۔

اس کے ہونٹ ہلے،مگر آواز نہ نکلی۔

پولیس والے آصف کو لے گئے۔گلی میں پھر خاموشی چھا گئی۔

سلیم چارپائی پر بیٹھا سر پکڑے رہا۔ساجدہ کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔

اس کے ذہن میں وہ تمام چہرے گھوم رہے تھے جن سے اس نے قرض لیا تھا،وہ زیور جو بک چکے تھے،وہ وکیل جس نے فیس لی تھی،وہ تھانیدار جس کی جیب گرم کی تھی۔

اب نہ زیور باقی تھے،نہ قرض دینے والا کوئی،نہ ہمت۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جیسے ختم ہو چکے تھے۔

اس نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا،

''میں نے اسے ایک بار قانون سے چھڑا لیا تھا......مگر اسے اس راستے سے نہ چھڑا سکی جس نے اسے مجرم بنا دیا۔''

باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔اور ساجدہ سوچ رہی تھی...اب وہ بے چاری کیا کرے؟

◄◄ ● ►►

Shah Colony
Shah Zubair Road,
Munger Bihar 811201
Mob: 8210489478

● اقبال حسن آزاد

بلڈوزر جسٹس

ایک عنوان............ پانچ افسانچے

(۱)

گرمی کی دوپہر میں اچانک دھرتی لرز اٹھی۔ جیسے زمین نے کسی دکھ سے ہچکی لی ہو۔ محلے کے تنگ گلی کوچوں میں پیلے جبڑوں والا بلڈوزر داخل ہوا تو گھروں کی کھڑکیاں خوف سے کانپنے لگیں۔

''نام بتاؤ؟''

''پرچہ دکھاؤ؟''

''کس کا حکم ہے؟''

ہر سوال کا جواب صرف ایک دھماکہ تھا...... چھت گرنے کا...... دیواریں ٹوٹنے کا...... بنیادیں اکھڑنے کا۔

ایک گھر کے سامنے بلڈوزر رک گیا۔ دروازے سے ایک عمر رسیدہ خاتون لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں برسوں کی محنت کے بسیرا ٹوٹنے کا رونا بھرا تھا۔

''بیٹا...... اندر میرا بیمار پوتا ہے۔ دوا ابھی لائی تھی......''

ڈرائیور کے کانوں تک آواز پہنچی ضرور، مگر شاید حکم نامے میں رحم لکھا ہی نہیں تھا۔

بوم......!

دیوار دھڑام سے گری۔ دوا کی بوتل ٹوٹنے کی آواز اندر کہیں دب کر رہ گئی۔ بیمار بچہ چیخ بھی نہ پایا، صرف آنکھوں کے کناروں سے ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ گھر اجڑتے گئے، دھول اڑتی گئی، اور آسمان پر چڑھتا سورج اس تماشے کو بے بسی سے دیکھتا رہا...... جیسے اس کی روشنی بھی اس ظلم دھونہ سکنے پر شرمندہ ہو۔

بلڈوزر کے پیچھے ایک سرکاری جیپ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے اندر بیٹھے افسر نے رپورٹ میں لکھا:

''کارروائی کامیاب۔ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔''

مگر زمین کے نیچے کہیں، گرے ہوئے مکانوں کی اینٹوں کے بیچ، ایک سسکی اب بھی دبی ہوئی تھی...... یہ انصاف کے نام پر برپا کیا گیا وہ شور تھا جسے تاریخ آنے والی صدیوں تک بلڈوزر جسٹس کے نام سے یاد کرے گی۔

(۲)

شہر کے بیچوں بیچ ایک چوراہا تھا جہاں کبھی لوگ بیٹھ کر شام میں گزارا کرتے تھے۔ اب وہاں صرف ایک پتھر کا تراشا ہوا بلڈوزر کھڑا تھا......سیاہ، بے حس، اور عجیب طرح سے زندہ معلوم ہوتا ہوا۔ لوگ اسے ''انصاف کا مجسمہ'' کہتے تھے، مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ مجسمہ کب بنایا گیا، کس نے نصب کیا، اور کیوں......

کہانی اس رات کی ہے جب چوراہے کے قریب رہنے والے ایک کمزور دل نوجوان نے خواب میں دیکھا کہ مجسمہ حرکت کر رہا ہے۔ بلڈوزر نے اپنی دھاتی آنکھیں کھولیں، جن میں روشنی نہیں بلکہ ایک ایسی اندھیرا ابھری چمک تھی جس سے سوال کرنا بھی جرم لگتا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو......؟''

بلڈوزر نے دھیمی آواز میں کہا،

''میرا کام صرف گرانا نہیں۔ میرا کام سب سے پہلے ڈرانا ہے۔''

نوجوان کے قدم زمین سے جڑ گئے۔

''کیسے؟'' وہ بمشکل پوچھ سکا۔

''اُن سب کو جو سوچنے کی کوشش کریں۔ جو سوال اٹھائیں۔ جو انصاف مانگیں۔''

بلڈوزر کے دھاتی جبڑے آہستہ آہستہ کھل کر بند ہوئے، جیسے کسی نادیدہ ہڈی کو چبا رہے ہوں۔

اچانک مجسمہ حقیقت بن گیا......

پہیے چلنے لگے، بلیڈ اوپر نیچے ہونے لگا۔ لیکن یہ گھر نہیں گرا رہا تھا۔ یہ آوازیں گرا رہا تھا۔ جن گھروں میں سچ بولا جاتا تھا، وہاں سناٹا بس جاتا۔ جن گلیوں میں لوگ حق کی بات کرتے، وہاں خاموشی کی دھول بیٹھ جاتی۔

اوپر آسمان پر روشنی کا دائرہ گھوم رہا تھا، مگر زمین پر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ فکر اور آزادی کی اینٹیں ٹوٹتی جا رہی تھیں۔

نوجوان نے چیخ کر کہا،

''رک جاؤ! انصاف تو سب کے لیے ہوتا ہے!''

بلڈوزر ہنسا......ایک کھوکھلی دھاتی ہنسی۔

''میں انصاف نہیں ہوں...... میں انصاف کی جگہ کھڑا کیا گیا خوف ہوں۔''

''اور جب خوف کو قانون سمجھ لیا جائے تو پھر شہر کی سب سے مضبوط عمارت انسانی ضمیر ہوتی ہے جسے سب سے پہلے گرانا پڑتا ہے۔''

صبح کو وہ نوجوان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چوراہے پر مجسمہ اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔

مگر اس کے قدموں کے پاس ایک تازہ نشان کھدا ہوا تھا، جیسے کسی بھاری چیز نے رات کے اندھیرے میں واقعی حرکت کی ہو۔

لوگوں نے پوچھا،

''یہ نشان کیسے بنا؟''

نوجوان نے جواب نہ دیا۔

اسے معلوم تھا کہ کبھی کبھی بلڈوزر حقیقی نہیں ہوتا...... بلڈوزر ذہنوں میں چلتا ہے۔اور اس کی تباہی سب سے زیادہ خونچکاں ہوتی ہے۔

(۳)

شہر میں ایک انوکھا مقابلہ شروع کیا گیا:

''سال کا بہترین انصاف!''

لوگ حیران تھے......انصاف کا بھی کوئی مقابلہ ہوتا ہے؟

مگر حکام نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ فیصلہ ووٹوں سے نہیں ہوگا، بلکہ تباہ شدہ مکانات کی تعداد سے ہوگا۔ جو جتنی زیادہ عمارتیں گرائے گا، اسے اتنا ہی ''منصف'' سمجھا جائے گا۔

شہر کے میدان میں تین امیدوار کھڑے تھے......تاش کے پتوں کے بادشاہوں کی طرح:

۱۔قانون کا

۲۔انتظامیہ

۳۔بلڈوزر

ہجوم چیخا۔''تیسرا امیدوار کہاں سے آ گیا؟''

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھے، بلڈوزر نے اپنی بتی آن کی، ہارن بجایا، اور دھاتی آواز میں بولا:

''میری کارکردگی تم سب سے زیادہ ہے۔ میں ہی فاتح ہوں!''

منصفوں نے ہچکچاتے ہوئے فائلیں دیکھیں۔

واقعی......کاغذوں میں سب سے زیادہ کارروائیاں اسی کے نام تھیں۔

بے گھر کیے گئے خاندانوں کی سب سے موٹی فہرست اسی کے کھاتے میں تھی۔

لہٰذا اعلان ہوا:

''سال کا بہترین انصاف...... بلڈوزر!''

لوگ تالیاں بجانے لگے، مگر تالیاں تھوڑی عجیب تھیں...... جیسے مجبور ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔

انعام کے طور پر بلڈوزر کو سنہری رنگ سے رنگا گیا۔

اس کے آگے سرخ ربن باندھا گیا۔

اور شہر کے چوک میں اس کی تاجپوشی کی گئی۔

تاج اس کے جبڑے پر رکھا گیا تو وہ اور بھی چمکنے لگا۔ اب وہ صرف مشین نہیں تھا...... وہ انصاف کا استعارہ بن چکا تھا۔

پہلے دن ہی اس نے تقریب میں اعلان کیا:

''میرا منشور سادہ ہے...... جو کمزور ہے، وہ پہلے گرے گا۔ جو بے آواز ہے، وہ آخری جھاڑو میں بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور جو سوال کرے گا اسے میں خود جواب بن کر پیش آؤں گا۔''

شہر میں قہقہے گونجے...... طنز کے، بے بسی کے، یا شاید پاگل پن کے۔

لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے:

''یہ کیسا انصاف ہے؟''

کسی بزرگ نے دھیرے سے کہا:

یہ وہ انصاف ہے...... جب عدالت بند ہو جائے، اور تخت پر بلڈوزر بیٹھ جائے۔''

اس رات سب نے دیکھا...... بلڈوزر تاج پہنے، چوک میں کھڑا تھا۔ اور دور کہیں ایک خستہ حال محلے کی طرف اس کی بتی دھیرے سے جھپک رہی تھی...... جیسے اگلے ''فیصلے'' کا اشارہ ہو۔

(۴)

ریگستان کے بیچوں بیچ ایک غیر معمولی عدالت تھی...... نہ دیواریں، نہ چھت، نہ دروازے۔

صرف ریت، ہوا اور خاموشی۔

کہیں دور سے سورج کی گرم کرنیں اس عدالت کو آگ کی لکیروں کی طرح روشن کیے رکھتی تھیں۔

عدالت کے عین وسط میں ایک عجیب و غریب مخلوق کھڑی تھی...... آدھا انسان، آدھی

مشین۔جسم گوشت کا،مگر دل لوہے کا۔چہرہ سپاہی کا،مگر آنکھیں بلڈوزر کی ہیڈ لائٹ جیسی......اسے لوگ قاضیِ ریت کہتے تھے۔مگر صحرا کی سرگوشیوں میں وہ بلڈوزرِعدل کے نام سے دوڑا پھرتا تھا۔وہ بولتا کم تھا، سنتا بھی نہیں تھا۔لیکن اس کے قدم جہاں پڑتے،وہاں زمین کی تہہ تک لرزش دوڑ جاتی۔

اس کے فیصلے ایک ہی تھے:

جو کمزور ہے،اس کی بنیاد کھود دو۔

جو بے آسرا ہے،اس کی چھت گرا دو۔

اور جو سوال کرے......اس کی زبان ریت میں دفن کر دو۔

ایک دن صحرا کے کنارے رہنے والا ایک درویش عدالت میں آیا۔

چولا پھٹا ہوا تھا، ہاتھ خالی تھے،مگر نگاہیں سمندر جیسے سکون سے بھری ہوئی۔قاضیِ ریت نے اسے دیکھا اور دھاڑا:

''تم کون ہو؟اور کیا مانگتے ہو؟''

درویش مسکرایا......ایک ایسی مسکراہٹ جو دھوپ میں پڑے پانی کے بلبلے کی طرح شفاف تھی۔

''میں انصاف مانگنے نہیں آیا......میں صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ انصاف کو یہاں دفن کر دیا گیا ہے یا ابھی یہ سانس لے رہا ہے۔''

بلڈوزر کی آنکھوں میں لوہے کی چمک تیز ہوئی۔

''میں انصاف ہوں!میں سچ کا محافظ ہوں!''

درویش نے ریت کی ایک چٹکی اٹھائی،ہاتھ پر رکھ کر کہا:

''نہیں،تم صرف فیصلوں کا شور ہو،سچ تو خاموشی میں چھپا ہوتا ہے۔ریگستان کبھی شور مچانے والوں کا نہیں ہوتا۔یہ وقت کے ساتھ صرف انہیں رکھتا ہے جن کے اندر ریت کی مانند صبر ہو،اور پتھروں کی طرح مضبوط سچائی ہو۔''

بلڈوزر آگ بگولا ہو گیا۔

اس نے ریت کو چیرتے ہوئے درویش کی طرف بڑھنا چاہا،مگر جیسے ہی اس کا دھاتی بلیڈ زمین سے ٹکرایا ریت ایک طوفان بن گئی۔آنکھ جھپکتے میں صحرا نے فیصلہ سنا دیا۔

دھول کے بھنور نے قاضیِ ریت کو نگل لیا۔اس کا لوہے کا جسم ریت میں تحلیل ہونے لگا۔جو کبھی دوسروں کی بنیادیں اکھاڑتا تھا،اب خود بنیاد سے بے بنیاد ہو چکا تھا۔جب گرد بیٹھ گئی تو درویش تنہا کھڑا تھا۔

دور افق پر سورج ڈوب رہا تھا، اور ریت میں کہیں ایک نرم سا نشان تھا۔۔۔۔۔جیسے انصاف نے پہلی بار سانس لی ہو۔

درویش نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

''جس انصاف کو بلڈوزر مان لیا جائے وہ ہمیشہ ریت میں دفن ہو جاتا ہے۔اور جس انصاف کو دل میں جگہ دی جائے وہ کبھی مٹتا نہیں۔''

(۵)

ملک میں انتخابات قریب تھے، اور امیدواروں نے حسبِ روایت عوام سے زیادہ کیمرے کو مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔

مگر اس بار ایک نیا کھلاڑی میدان میں اترا تھا......وہ انسان نہیں تھا بلکہ ایک بلڈوزر تھا......جی ہاں، پیلا، دھاتی، تیل آلود بلڈوزر...... جسے پارٹی نے اپنا ''مخصوص انصاف مشین'' قرار دیا تھا۔

پارٹی کا نعرہ تھا:

''جہاں مسئلہ، وہاں بلڈوزر......''

اور چونکہ اس ملک میں مسئلے بہت تھے، لہٰذا بلڈوزر کی مصروفیت دیدنی تھی۔

پہلے دن اس نے ایک محض شک کی بنیاد پر گھر گرا دیا۔دوسرے دن ایک دکاندار کی دکان اڑا دی......کیونکہ اس نے جلسے میں تالیاں زور سے نہیں بجائی تھیں۔تیسرے دن وہ مخالف پارٹی کے دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔

رپورٹ میں لکھا:

''یہ عمارت رشوت کے پیسوں سے بنی ہے۔''

حالانکہ دفتر کے تاریخ دان کہتے تھے:

''یہ تو ۱۹۷۲ میں بنائی گئی تھی......تب رشوت کا پورا نظام ہی الگ تھا!''

جیسے جیسے بلڈوزر کا چرچا بڑھا، اس کی طاقت بھی بڑھتی گئی۔یہاں تک کہ ایک دن وہ پریس کانفرنس میں خود ہی مائیک کے پاس آ گیا۔صحافی ہکا بکا رہ گئے۔بلڈوزر نے دھات بجتی آواز میں کہا:

''میں صرف غیر قانونی ڈھانچے گراتا ہوں......لیکن 'غیر قانونی' کی تعریف مجھے خود طے کرنے کی آزادی ہے۔یعنی جو مجھے پسند ہو وہ قانونی اور جو ناپسند ہو وہ غیر قانونی ہے۔''

پریس کے کچھ جری صحافیوں نے سوال کیے:

''اگر غلطی ہو جائے تو کون ذمہ دار ہوگا؟''

بلڈوزر نے حیرت سے پوچھا:

''غلطی؟ غلطی تو انسان کرتے ہیں۔ میری تمام حرکتیں ضرورت ہوتی ہیں!''

حیرت انگیز طور پر اس بیان پر تالیاں بھی بجیں...... کیونکہ تالی نہ بجانے والوں کے گھروں کے سامنے وہ خود پہنچ جاتا تھا۔

انتخابات کے دن قریب آئے۔ پارٹی نے اعلان کر دیا:

''یہ ہمارا انتخابی نشان ہوگا!''

ایک صحافی نے سوال کیا:

''اگر یہ نشان ہار گیا تو؟''

پارٹی رہنما نے مسکرا کر جواب دیا:

''پھر ہم نتائج کے مرکز تک بھی اسے بھیج دیں گے..... شاید بیلٹ باکسوں کی بنیاد بھی غیر قانونی نکل آئے!''

الیکشن والے دن حیرانی کی بات یہ ہوئی کہ ووٹ ڈالنے جانے والے بہت سے لوگ اپنے گھر ہی نہ پا سکے۔ وہاں خالی ملبہ پڑا تھا، اور ملبے پر سرخ رنگ سے لکھا تھا:

''آپ کا ووٹ ڈال دیا گیا ہے۔''

نتیجہ آیا۔

بلڈوزر بھاری اکثریت سے جیت گیا...... کچھ ووٹوں سے نہیں...... بلکہ کئی گھروں سے جیتا۔

فیصلے کے بعد شہر کی مرکزی سڑک پر جشن منایا گیا۔

بلڈوزر تاج پہنے، گھومتا رہا۔

لوگوں نے نعرے لگائے، مگر چہروں پر خوف ایسا تھا جیسے ہر شخص اپنا گھر ذہنی طور پر الوداع کہہ چکا ہو۔

رات کے آخری پہر ایک بزرگ نے دھیرے سے کہا:

''یہ حکومت نہیں...... یہ شورِ حکومت ہے۔ اور جب شور کو انصاف مان لیا جائے تو خاموشی سب سے بڑا جرم بن جاتی ہے۔''

دور کہیں بلڈوزر کی بتی جھپکی...... جیسے اس نے بزرگ کی بات سن لی ہو۔ اور اگلے دورے کی فہرست میں ایک اور نام شامل کر لیا گیا۔

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر علی رفاد فتیحی

''بلڈوزر جسٹس'' پانچ افسانچے ایک تجزیہ

اقبال حسن آزاد کے یہ پانچ افسانچے ''بلڈوزر جسٹس'' کے عنوان کے تحت عصرِ حاضر کی ایک تلخ سماجی اور سیاسی حقیقت کو مختلف زاویوں سے بے نقاب کرتے ہیں۔ ان افسانچوں کا مجموعی تاثر شدید احتجاج، گہرے دکھ اور کاٹ دار طنز کا حامل ہے۔ اقبال حسن آزاد نے 'بلڈوزر' کو محض ایک مشین کے طور پر نہیں، بلکہ ریاستی جبر، بے حسی اور فوری (مگر ناانصاف) فیصلے کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ پہلے افسانچے میں یہ بلڈوزر ایک بے رحم شکاری ہے جس کے ''پیلے جبڑے'' ہیں۔ دوسرے افسانچے میں یہ خوف کا استعارہ ہے جو اینٹوں سے زیادہ انسانی ضمیر کو گرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تیسرے افسانچے میں یہ نظامِ عدل کا متبادل بن کر تخت نشین ہوتا ہے۔

پہلا افسانچہ (انسانی المیہ کو پیش کرتا ہے۔ یہ افسانچہ 'بلڈوزر جسٹس' کی سفاکی کو ایک بیمار بچے اور بے بس خاتون کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ اردو افسانوی ادب میں، خاص طور پر جدید اور علامتی (symbolic) افسانچوں میں، رنگوں اور اشیاء کو گہرے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مفہوم دینا عام ہے۔ ''بلڈوزر جسٹس'' (جو ایک سیاسی/سماجی تنقیدی افسانہ ہے، اور اس کا پہلے افسانچے میں بلڈوزر کو پیلے رنگ کی مشین کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ پیلا رنگ محض ایک بصری تفصیل نہیں بلکہ ایک طاقتور علامت (symbol) ہے جس کی افسانوی افادیت (symbolic significance) کئی سطحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ پیلا رنگ اکثر ''ڈینجر'' یا ''احتیاط'' کی علامت ہوتا ہے (جیسے ٹریفک لائٹس میں، وارننگ سائنز میں)۔ بلڈوزر جیسی طاقتور مشین کو پیلا رنگ دینا اسے ایک ''خطرناک ہتھیار'' کی طرح پیش کرتا ہے جو کسی بھی وقت تباہی مچا سکتا ہے۔ جدید جنوبی ایشیائی سیاسی تناظر میں ''بلڈوزر'' اکثر حکومتی جبر، غیر قانونی انہدام (Demolitions)، سیاسی انتقام اور 'بلڈوزر پالیسی' (جیسے مخالفین کے گھروں/ دفاتر کو تباہ کرنے) کی علامت بن چکا ہے۔ پیلا رنگ اسے مزید نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایک 'چمکدار'، 'نظر آنے والا' جبر ہے جو چھپا نہیں بلکہ کھلے عام دکھایا جاتا ہے۔ پیلا رنگ بعض اوقات ''جھوٹی چمک'' یا ''دھوکے'' کی طرف اشارہ کرتا

ہے یعنی ''انصاف'' کا دعویٰ کرتے ہوئے ناانصافی کرنا۔ پیلا رنگ اس جھوٹے انصاف کی چمک کو ظاہر کرتا ہے جو اصل میں ظلم ہے۔ پہلے افسانچے میں بلڈوزر کو پیلے رنگ کی مشین کے طور پر پیش کرنا ایک دانستہ تکنیکی انتخاب ہے جو نہ صرف سیاسی تنقید کو گہرا کرتا ہے بلکہ ''بلڈوزر جسٹس'' کو ایک سیاسی استعارہ (Political Metaphor) بناتا ہے جہاں پیلا رنگ حکومتی طاقت کی ''چمکدار'' لیکن خطرناک شکل کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ ''جسٹس'' ہے جو رنگ برنگی پروپیگنڈا کے ساتھ آتا ہے مگر اندر سے تباہ کن ہے۔ خلاصہ یہ کہ پہلے افسانچے میں پیلے رنگ کی بلڈوزر ایک کثیر الجہتی علامت ہے جو خطرے اور تباہی کو، جھوٹے انصاف اور سیاسی جبر کو، چمکدار مگر تباہ کن طاقت کو اور سماجی/سیاسی تنقید کو بیک وقت بیان کرتی ہے۔ یہ علامت افسانے کو محض ایک کہانی سے بلند کر کے ایک طاقتور سیاسی بیان (Political Allegory) بنا دیتی ہے، جہاں رنگ کی چھوٹی سی تفصیل پورے افسانے کا مرکزی پیغام اٹھا لیتی ہے۔ اس افسانچے میں افسر کی رپورٹ ('کارروائی کامیاب') اور زمینی حقیقت (بچے کی سسکی اور ٹوٹی ہوئی دوا کی بوتل) کے درمیان تضاد بیورو کریسی کی مردہ دلی کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسرا افسانچہ (نفسیاتی خوف): یہاں مصنف نے بہت گہری بات کی ہے کہ 'بلڈوزر اصل میں ذہنوں میں چلتا ہے۔' یہ افسانچہ بتاتا ہے کہ اس قسم کے اقدامات کا اصل مقصد مکان گرانا نہیں بلکہ حق کی آواز اور سوچنے کی صلاحیت کو مفلوج کرنا ہے۔

تیسرا افسانچہ (طنزِ وحشی): یہ افسانچہ سماج کی اس ذہنیت پر طنز ہے جو تباہی کو 'بہترین انصاف' قرار دے کر اس کی تاجپوشی کرتی ہے۔ 'جب عدالت بند ہو جائے اور تخت پر بلڈوزر بیٹھ جائے' کا جملہ موجودہ دور کے عدالتی بحران کی عکاسی کرتا ہے۔

چوتھا افسانچہ (مابعد الطبیعیاتی انصاف): یہ افسانچہ ایک امید فراہم کرتا ہے۔ درویش اور ریت کے طوفان کے ذریعے مصنف نے یہ پیغام دیا ہے کہ مصنوعی اور جبری انصاف (بلڈوزر) کبھی مستقل نہیں ہوتا، وہ آخر کار وقت کی ریت میں دفن ہو جاتا ہے، جبکہ سچا انصاف دلوں میں زندہ رہتا ہے۔

پانچواں افسانچہ (سیاسی استحصال): یہ موجودہ سیاسی نظام پر براہِ راست طنز ہے۔ بلڈوزر کا انتخابی نشان بننا اور ووٹروں کے گھروں کا ملبہ بن جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب جمہوریت میں 'قوت' کو 'قانون' پر ترجیح دی جائے تو پھر عوام نہیں، بلکہ خوف جیتتا ہے۔

ان افسانچوں میں اقبال حسن آزاد کا اسلوب بیانیہ بھی ہے اور ڈرامائی بھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں نے تحریر میں ایسی کاٹ پیدا کر دی ہے کہ قاری کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح چوٹ لگتی ہے۔ ان

افسانچوں میں بیانیہ اسلوب (narrative style) اور ڈرامائی شدت (dramatic intensity) کا امتزاج بہت نمایاں ہے۔ وہ معاصر اردو افسانہ نگاری میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ تکنیکی جدت (ہیئت اور اسلوب میں) لانے والے اہم ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اسلوب مختصر، کاٹ دار اور براہ راست ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کر کے وہ نہ صرف بیانیہ کو تیز رفتار بناتے ہیں بلکہ قاری پر جذباتی اور فکری چوٹ لگاتے ہیں۔ یہ جملے اکثر ڈرامائی ہوتے ہیں کیونکہ وہ اچانک آتے ہیں، سوال اٹھاتے ہیں، تضاد پیدا کرتے ہیں یا منظر کو ایک دم تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ تکنیک افسانے کو تھرلر یا ٹریجک ڈراما کی طرح محسوس ہونے دیتی ہے، جہاں قاری کا ذہن مسلسل جھنجھوڑا جاتا ہے۔ یہ جملے اکثر ایک لفظی یا دو لفظی ہوتے ہیں، جو تاثر کو شدید بناتے ہیں۔ یہ منٹو کی طرح کی شدت رکھتے ہیں مگر آزاد کا اپنا منفرد لہجہ ہے۔

''وہ آیا۔ دیکھا۔ کچلا۔ چلا گیا۔'' (یہ چھوٹے جملے منظر کی تباہی کو فوری اور ہتھوڑے کی طرح پیش کرتے ہیں—ڈرامائی شدت پیدا ہوتی ہے۔)

'کیوں؟ آخر کیوں؟ صرف اس لیے؟' (سوالوں کی شکل میں— قاری کے ذہن میں فوری چوٹ، تنہائی اور استحصال کا احساس جگاتے ہیں۔)

''گھر تھا۔ اب نہیں۔ بس ملبہ۔ اور خاموشی۔'' (یہ 'بلڈوزر جسٹس' جیسے موضوع میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے—تباہی کی فوری تصویر، ڈرامائی طور پر۔)

''انصاف؟ ہنس پڑا۔ بلڈوزر چل پڑا۔'' (یہاں کاٹ اور تضاد— ''انصاف'' کا لفظ اور پھر بلڈوزر کی حرکت— قاری پر شدید اثر انداز ہوتا ہے۔)

یہ چھوٹے جملے افسانے کو شعری نثر کی طرح بناتے ہیں، جہاں ہر جملہ ایک ضرب ہے۔ یہ اسلوب ہمنگ وے (Hemingway) کے 'آئس برگ تھیوری' سے ملتے جلتے ہیں— سطح پر کم، مگر نیچے گہرا مطلب پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ تکنیک قاری کو بے چین کر دیتی ہے، کیونکہ جملے اچانک ختم ہوتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ ڈرامائی ہے کیونکہ یہ تھیٹر کی طرح ہے— ڈائلاگ، سائلنس، اور اچانک ایکشن۔

ان پانچوں افسانچوں کا لب لباب یہ ہے کہ 'بلڈوزر جسٹس' دراصل انصاف کی موت ہے۔ یہ عمل محض عمارتوں کو نہیں گراتا بلکہ یہ قانون کی بالادستی، انسانی حقوق، اور معاشرتی امن کی بنیادوں کو اکھاڑ دیتا ہے۔ اقبال حسن آزاد نے بہت مہارت سے یہ دکھایا ہے کہ جس سماج میں 'شور کو انصاف' مان لیا جائے، وہاں خاموشی سب سے بڑا جرم بن جاتی ہے۔ مجموعی طور پر، یہ افسانچے اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت

جرات مندانہ اور اسلوب کے لحاظ سے پختہ ہیں، جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کے 'انصاف' کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہالی ڈے اور رقیہ حسن کے ماڈل کے مطابق ان افسانچوں کو درج ذیل تین سطحوں پر پرکھا جا سکتا ہے:

ا۔ ٹیکسچوئل میٹا فنکشن (Textual Metafunction) اور انسجام (Cohesion)

ہالی ڈے اور رقیہ حسن کے نزدیک متن (Text) وہ ہے جس میں 'انسجام' ہو۔ ان پانچ افسانچوں میں 'ربط' (Coherence) ہے جسے یہ ماڈل لسانی کڑیوں کے ذریعے ثابت کرتا ہے:

• لسانی تکرار (Lexical Cohesion): پانچوں افسانچوں میں 'بلڈوزر'، 'انصاف'، 'گرانا'، 'بنیاد' اور 'خوف' جیسے الفاظ کی تکرار پورے متن کو ایک اکائی بنا دیتی ہے۔ رقیہ حسن کے مطابق یہ 'Chain Cohesion' پیدا کرتی ہے۔

• اشاریت (Reference): ان افسانچوں میں ضمیر (Pronouns) کا استعمال (مثلاً بلڈوزر کے لیے 'وہ'، 'اس کے جبڑے') مشین کو ایک 'کردار' کے طور پر مستحکم کرتا ہے۔

• تلازمہ (Collocation): 'بلڈوزر' کے ساتھ 'ملبہ'، 'دھول'، 'چیخ' اور 'عدالت' جیسے الفاظ کا ساتھ آنا ایک خاص سماجی و سیاسی منظرنامہ (Context) تخلیق کرتا ہے۔

۲ . آئیڈیشنل میٹا فنکشن (Ideational Metafunction) یہ پہلو اس بات پر غور کرتا ہے کہ زبان حقیقت کو کیسے پیش کر رہی ہے۔

• عملیاتی نظام (Transitivity System): ہالی ڈے کے مطابق جملوں میں 'فاعل' (Actor) اور 'مفعول' (Goal) کی پوزیشن اہم ہوتی ہے۔ ان افسانچوں میں بلڈوزر مسلسل 'Actor' (کرنے والا) ہے، جبکہ انسان اور مکان 'Goal' (جس پر عمل ہو رہا ہے) ہیں۔ یہ لسانی ساخت واضح کرتی ہے کہ طاقت کا توازن کس طرف ہے۔

• تجسیم (Personification): بلڈوزر کو 'بات کرتے' اور 'تاج پہنتے' دکھانا لسانی سطح پر مادی عمل (Material Process) کو ذہنی یا کلامی عمل (Verbal Process/Mental) میں بدلنے کا تجربہ ہے۔

۳ . سیاقِ حال (Context of Situation) رقیہ حسن نے Field (میدان)، Tenor (انداز) اور Mode (صورت) کا جو تصور دیا ہے، وہ یہاں پوری طرح صادق آتا ہے:

• Field (موضوع): سیاسی جبر اور فوری انصاف کا ڈھونگ۔

• Tenor (شرکاء کا رشتہ): حاکم (بلڈوزر/افسر) اور محکوم (عوام/درویش) کے درمیان ایک غیر مساوی رشتہ۔ زبان کا لہجہ آمرانہ (Authoritative) اور طنزیہ (Satirical) ہے۔

• Mode (ذریعہ): یہ تحریری بیانیہ ہے جو علامتی اور تمثیلی رنگ لیے ہوئے ہے۔

کیا ان میں ربط کا فقدان ہے؟ (ہالی ڈے کے تناظر میں)

ہالی ڈے اور رقیہ حسن کے ماڈل پر پرکھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ربط کا فقدان ہرگز نہیں ہے۔ رقیہ حسن کے مطابق ایک متن میں "Cohesive Harmony" ہونی چاہیے۔ ان افسانچوں میں اگرچہ کہانیاں بظاہر الگ ہیں، مگر ان کا 'لسانی تانا بانا' (Texture) ایک ہی ہے کیونکہ:

۱۔ ان کا رجسٹر (Register) ایک ہی ہے۔

۲۔ ان کے لسانی اشارے (Cohesive Ties) ایک ہی مرکز (بلڈوزر) کی طرف لوٹتے ہیں۔

ہالی ڈے اور رقیہ حسن کے ماڈل پر پرکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال حسن آزاد نے شعوری یا لاشعوری طور پر ایک ایسا لسانی ڈھانچہ تیار کیا ہے جو بکھرا ہوا ہونے کے باوجود معنوی طور پر ایک ٹھوس اکائی ہے۔ یہ 'بیانوی تجربہ' اردو افسانچے میں لسانیاتی سطح پر ایک اہم مطالعہ بن سکتا ہے۔

ہالی ڈے (Halliday) کے ٹرانزیٹیوٹی (Transitivity) ماڈل کو سمجھنے کے لیے عملی تجزیہ سب سے بہترین طریقہ ہے۔ ٹرانزیٹیوٹی کا بنیادی مقصد یہ دیکھنا ہے کہ زبان میں 'فاعل' (Actor)، 'عمل' (Process) اور 'شرکاء' (Participants) کے ذریعے حقیقت کو کیسے پیش کیا گیا ہے۔

آیئے پہلے افسانچے کے اس اقتباس کا تجزیہ کرتے ہیں جو بلڈوزر کی آمد کو بیان کرتا ہے:

''محلے کے تنگ گلی کوچوں میں پیلے جبڑوں والا بلڈوزر داخل ہوا تو گھروں کی کھڑکیاں خوف سے کانپنے لگیں۔''

اس جملے کو ہم ہالی ڈے کے ماڈل کے مطابق درج ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1. جملے کا پہلا حصہ: ''پیلے جبڑوں والا بلڈوزر داخل ہوا۔''

لفظ/جز	ہالی ڈے کا زمرہ (Category)	وضاحت

پیلے جبڑوں والا بلڈوزر	Actor (فاعل/شریک)	یہ عمل کرنے والا ہے (مادی وجود)
داخل ہوا	Material Process (مادی عمل)	یہ ایک 'کرنے' (Doing) کا عمل ہے، جو طاقت کو ظاہر کرتا ہے
محلے کے تنگ گلی کوچوں میں	Circumstance (سیاق/حالات)	یہ مقام (Location) کی نشاندہی کررہا ہے

۲۔ جملے کا دوسرا حصہ: 'گھروں کی کھڑکیاں خوف سے کانپنے لگیں۔'

لفظ/جز	ہالی ڈے کا زمرہ (Category)	وضاحت
گھروں کی کھڑکیاں خوف سے کانپنے لگیں	Actor/Senser	یہاں بے جان چیز کو جاندار (Personified) بنادیا گیا ہے۔
خوف سے	Behavioral Process (رویاتی عمل)	یہ خوف کے جسمانی اظہار کو ظاہر کرتا ہے
خوف سے	Circumstance (وجہ/انداز)	یہ عمل کی کیفیت یا وجہ (Cause) بیان کررہا ہے

تجزیاتی بحث (Critical Discussion):

ہالی ڈے کے ماڈل کی روشنی میں اس بیانوی تجربے سے تین اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

* طاقت کا توازن (Power Dynamics): مادی عمل (Material Process) یعنی ''داخل ہونا'' اور ''گرانا'' ہمیشہ بلڈوزر یا انتظامیہ کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام 'طاقت' اور 'حرکت' (Agency) انہی کے پاس ہے۔

* تجسیم (Personification): ''پیلے جبڑے'' اور ''کھڑکیوں کا کانپنا'' ظاہر کرتا ہے کہ مصنف نے مادی اشیاء کو سماجی اداکاروں (Social Actors) میں بدل دیا ہے۔ ہالی ڈے کے نزدیک جب ہم مادی اشیاء کو جانداروں کے افعال دیتے ہیں، تو ہم اس کے ذریعے ایک گہرا نفسیاتی اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

* غیر فعالی (Passivity): پورے افسانے میں مظلوم (بوڑھی عورت، بیمار بچہ) کبھی بھی کسی 'مادی عمل' کے فاعل (Actor) نہیں بنتے۔ وہ یا تو 'ذہنی عمل' (Mental Process) میں ہیں (رونا، سسکی لینا) یا پھر 'مفعول' (Target) ہیں۔ یہ لسانیاتی ساخت ان کی بے بسی کو سائنسی بنیادوں پر ثابت کرتی ہے۔

رقیہ حسن کا 'انسجام' (Cohesive Harmony):

اگر ہم رقیہ حسن کے ماڈل کو دیکھیں تو 'بلڈوزر' (فاعل) اور 'تباہی' (عمل) کے درمیان جو لسانیاتی کڑیاں ہیں، وہ پورے متن میں ایک Identity Chain بناتی ہیں۔ یہ زنجیر قاری کے ذہن میں بلڈوزر کو 'انصاف کے علمبردار' کے بجائے 'تباہی کے نمائندے' کے طور پر نقش کر دیتی ہے۔

پانچویں افسانچے کا تجزیہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہاں بلڈوزر محض ایک مادی مشین سے بڑھ کر ایک سیاسی اور قانونی ادارہ بن چکا ہے۔ ہالی ڈے کے ٹرانزیٹیوٹی (Transitivity) ماڈل میں یہ تبدیلی 'عمل' (Process) کی نوعیت بدلنے سے ظاہر ہوتی ہے۔

آیئے اس کے اہم اقتباسات کا لسانیاتی تجزیہ کرتے ہیں:

'بلڈوزر نے دھات بجتی آواز میں کہا: ''میں صرف غیر قانونی ڈھانچے گراتا ہوں۔''

ا . کلامی عمل (Verbal Process): بلڈوزر بطورِ متکلم

لفظ/ جز	ہالی ڈے کا زمرہ (Category)	لسانی وضاحت
بلڈوزر | Sayer (بات کہنے والا) | اسے 'انسانی شعور دیا گیا ہے۔ اب یہ مشین نہیں پالیسی ساز ہے۔	کہا | Verbal Process (کلامی عمل)	یہ عمل اسے اقتدار اور قانونی حیثیت (Legitimacy) فراہم کرتا ہے۔
غیر قانونی ڈھانچے | Target (نشانہ)	یہاں 'غیر قانونی' کی تعریف خود متکلم (بلڈوزر) کے ہاتھ میں ہے۔	مادی عمل مفعول کی گمشدگی (Material Process & (Passive Voice

''آپ کا ووٹ ڈال دیا گیا ہے۔''

یہاں مصنف نے مجہول (Passive Voice) کا استعمال کیا ہے، جو ہالی ڈے کے ماڈل میں بہت معنی خیز ہے:

Goal (مفعول):	Process (عمل):	Actor (فاعل):
آپ کا ووٹ۔	ڈال دیا گیا ہے (Material Process)	غائب (Deleted)۔

سیاست میں جب فاعل (Actor) کو چھپایا جاتا ہے، تو اس کا مقصد ذمہ داری سے بچنا یا کسی نادیدہ طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں ''ووٹ ڈال دیا گیا ہے۔'' کے پیچھے کون ہے؟ بلڈوزر یا انتظامیہ؟ فاعل کی یہ گمشدگی نظام کی شفافیت کے خاتمے اور جبر کی انتہا کو ظاہر کرتی ہے۔

سیاسی تمثیل اور رقیہ حسن کا ماڈل (Identity Chain)

رقیہ حسن کے مطابق، متن میں 'انسجام' (Cohesion) تب پیدا ہوتا ہے جب مرکزی کردار کی ایک پہچان (Identity) مستقل رہے۔ اس افسانچے میں مصنف نے ایک Lexical Chain (لفظی زنجیر) بنائی ہے:

☆ بلڈوزر > امیدوار > فاتح > تاجدار > منصف۔

یہ زنجیر ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح ایک آلۂ قتل (Weapon) بتدریج آلۂ حکومت (Instrument of Governance) میں تبدیل ہو رہا ہے۔

ہالی ڈے اور رقیہ حسن کے ماڈل پر پرکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال حسن آزاد کے ہاں بیانوی تجربہ نہایت گہرا ہے۔

☆ انہوں نے فاعل (Actor) کی پوزیشن بدل کر مشین کو خدا بنا دیا ہے۔

☆ انہوں نے مجہول (Passive) جملوں کے ذریعے عوام کی بے بسی (less-Agency) کو واضح کیا ہے۔

☆ انہوں نے سیاقِ حال (Context of Situation) کو ایسا ترتیب دیا ہے جہاں 'قانون' اب کتابوں میں نہیں بلکہ 'لوہے اور پیٹرول' (بلڈوزر) میں بستا ہے۔

اقبال حسن آزاد کے افسانچے ''بلڈوزر جسٹس'' کے لسانیاتی تجزیے کا ہالی ڈے کے سیسٹمیٹک فنکشنل لنگوسٹکس (SFL) ماڈل اور رقیہ حسن کے انسجام (Cohesion) ماڈل کی روشنی میں خلاصہ یہ ہے کہ یہ افسانے سیاسی جبر، طاقت کے عدم توازن اور عوامی بے بسی کو لسانیاتی ساخت کے ذریعے ننگا کرتے ہیں۔

ٹرانزیٹیوٹی (Transitivity) کا استعمال: ہالی ڈے کے ماڈل میں بلڈوزر کو مادی عمل (Material Process) کا مرکزی فاعل (Actor) بنا کر پیش کیا گیا ہے، جو ''داخل ہونا''، ''گرانا'' اور ''کہنا'' جیسے افعال کے ذریعے طاقت کی علامت بنتا ہے۔ اس کے برعکس، مظلوم کردار (جیسے بوڑھی عورت یا بچہ) یا تو غیر فعال (Passive) رہتے ہیں یا ذہنی/کرداری عمل (Behavioral Processes/ Mental) میں محدود، جو ان کی بے اختیاری کو

ظاہر کرتا ہے۔ تجسیم (Personification) کے ذریعے مادی اشیاء (جیسے بلڈوزر یا کھڑکیاں) کوانسانی صفات دے کرنفسیاتی اور سیاسی شدت پیدا کی گئی ہے۔

مجہول ساخت (Passive Voice): مجہول جملوں (جیسے ''ووٹ ڈال دیا گیا ہے۔'') میں فاعل کی گمشدگی نظام کی غیر شفافیت اور نادیدہ جبر کو نمایاں کرتی ہے، جو ذمہ داری سے بچنے کا لسانیاتی ہتھیار ہے۔

انسجام اور شناخت کی زنجیر (Identity ChainCohesive Harmony &): رقیہ حسن کے ماڈل کے مطابق، متن میں بلڈوزر کی لفظی زنجیر (Lexical Chain) اسے محض مشین سے سیاسی ادارہ (امیدوار، فاتح، منصف) میں تبدیل کرتی ہے، جو ''انصاف'' کے نام پر تباہی کی زنجیر بناتی ہے۔ یہ انسجام قاری کے ذہن میں بلڈوزر کو جبر کی مستقل علامت کے طور پر نقش کر دیتا ہے۔

مجموعی طور پر، یہ تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ آزاد کا بیانوی اسلوب نہ صرف سماجی تنقید ہے بلکہ لسانیاتی سطح پر ایک منظم احتجاج، جہاں ''قانون'' اور ''طاقت'' کی حقیقت لوہے اور مشینری میں پوشیدہ ہے، اور عوام کی آواز کو سیاقی حالات (Circumstances) میں دبا دیا جاتا ہے۔ یہ افسانے ادبی اور سیاسی دونوں سطحوں پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں، جو ہالی ڈے اور حسن کے ماڈلز سے سائنسی اعتبار سے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ افسانچے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک سیاسی بیانیے کا پوسٹ مارٹم ہیں۔

◄● ►

M-43 2nd Floor Near Shane Ilahi Masjid
Abdul Fazal Enclave New Dilhi, 25
Mob: No. 9411414398

اقبال حسن آزاد

کا

چوتھا

افسانوی مجموعہ

اوس کے موتی

(زیر طبع)

● پروفیسر صفدر امام قادری

انیس الرحمان: اردو شاعری کے انگریزی مترجم کی حیثیت سے

اردو اپنے آغاز کے دور سے ہی اُن خوش نصیب زبانوں میں سے ایک ہے جس کے بولنے والے اکثر و بیش تر کثیر لسانی ماحول کے پروردہ نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر آج تک کے ادبا و شعرا کی فہرست پر نگاہ دوڑائیں تو بہت کم ایسے اردو ادیب اور فن کار ملیں گے جو صرف زبانِ اردو کی معلومات کی بنیاد پر اپنے ادبی اور علمی کاروبار میں منہمک ہیں۔ ابتدا میں اردو کے ادیبوں کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کا دوستانہ رشتہ رہا۔ عہدِ جدید میں انگریزی اور ہندی زبانوں نے کم و بیش عربی و فارسی کی جگہ لے لی۔ ہر علاقے کی زبانوں سے وہاں کے اردو ادیب اور شاعر نہ صرف آشنا پائے جاتے ہیں بلکہ ان زبانوں میں کچھ نہ کچھ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس طرح سے علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ ہر دور میں قائم رہا، اسی طرح عربی اور فارسی زبانوں سے بھی ایک علمی دل چسپی موجود رہی۔ ایسے معاشرے میں لسانی تنگ نظری کے امکانات نہیں کے برابر پیدا ہوں گے اور اس کے نتیجے میں ایک تہذیبی ہم مشربی کا بھی ماحول ہوگا۔ اردو معاشرے کی اس خصوصیت نے اس زبان کے لوگوں میں تراجم کے لیے ایک خاص شوق پیدا کیا تھا۔

ہماری کلاسیکی کتابوں میں 'سب رس' اور 'باغ و بہار' جیسی عظیم کتب طبع زاد نہیں بلکہ ترجمہ شدہ ہیں یا ترجمہ در ترجمہ کی مثالیں ہیں۔ اسلوبیاتی رنگارنگی کے لیے 'نیرنگِ خیال' صفِ اول کی کتاب تسلیم کی جاتی ہے مگر وہ بھی انگریزی زبان کے مضامین کا بہت حد تک آزاد ترجمہ ہے۔ یہ کتابیں زبانِ اردو کی طبع زاد عظیم کتابوں کی صف میں نہ جانے کس عالم میں پہنچ گئیں کہ اب صرف ماہرین کے درمیان یہ بحث ہوتی ہے کہ یہ کتابیں مترجمہ ہیں ورنہ اردو کے عام قارئین کے بیچ یہ بات موضوعِ گفتگو بھی نہیں کہ یہ اردو کی طبع زاد کتابیں نہیں۔ شاید حقیقی متن اور اعلا ترجمے کے متن کے بیچ اردو میں جو ایک خیر سگالی کا ماحول پیدا ہوا، اسی وجہ سے یہ محبوبانہ اشتراک اور میل جول کی صورت پیدا ہوئی۔ اردو میں ذو لسانی اور سہ لسانی فن کاروں کی تعداد بھی خاصی رہی ہے۔ امیر خسرو تو ہفت قلم تھے ہی، ان کی بات چھوڑیے، محمد قلی قطب شاہ کے شامل دکنی دور کے اکثر شعرا و ادبا سہ لسانی یا چہار لسانی بنیادوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ زبان ہی نہیں، ان فن کاروں کے فکری مزاج میں جو وسعت نظر آتی ہے، اس کے پیچھے ان کی کثیر لسانیت بنیاد کا ایک پتھر ہے۔

شمالی ہندستان میں اردو کے فروغ میں فارسی اس طرح سے گھنی چھاؤں کے طور پر نظر آتی رہی کہ ہر شاعر کے دیوان کا فارسی گوشہ لازمی طور پر نظر آجائے گا۔ اسی ماحول کا یہ نتیجہ ہوا کہ اردو کے دو عظیم شعرا غالب اور اقبال کے یہاں فارسی کلام کی مقدار اردو سے بڑھ گئی۔

بیسویں صدی میں مابعد عہد اقبال کے فن کاروں کے یہاں لسانی تکثیریت نئے رنگ و آہنگ میں نظر آتی ہے۔ فیض نے اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی چار زبانوں کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ ترقی پسندوں اور حلقۂ اربابِ ذوق کے افراد نے دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کی ایک مستحکم روایت قائم کی۔ میراجی نے مغرب کے ساتھ ساتھ مشرق کے سرمایۂ ادب کو بھی ترجمے کے لیے منتخب کیا۔ اختر حسین رائے پوری نے بنگلہ زبان اور سنسکرت دونوں سے تراجم پیش کیے۔ ظ انصاری ایک ساتھ اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور روسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام اور ادبی ترجمے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین نے اپنے مشہور زمانہ ناولوں 'آگ کا دریا' اور 'اداس نسلیں' کا خود ہی انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس نے آزادانہ طور پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا اور حسبِ ضرورت تراجم بھی پیش کیے۔ ان کا افسانہ ابابیل جب '*The Sparrow*' کی شکل میں انگریزی زبان میں آیا تو مترجم اور مصنف کی باہم آویزشیں اور دو زبانوں کے پڑھنے والوں کے مزاج کے اعتبار سے تبدیلی کے معاملات بھی سامنے آئے۔ اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اس بات پر ہمارا ایمان پھر سے تازہ ہو جائے کہ اردو معاشرے میں کثیر لسانی ماہرین کی کبھی کمی نہیں رہی اور سب نے حسبِ ضرورت موقع محل کے اعتبار سے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔

یہ سوال قابلِ غور ہے کہ فی زمانہ اردو معاشرے میں ترجمے کے کاموں کو کس قدر توجہ سے کرنے کا رجحان موجود ہے۔ کیا پچھلے زمانے میں اس باب میں جو مستعدی تھی، تعلیم کے فروغ اور ہمہ گیر ماحول میں اس میں کچھ اضافہ ہو سکا؟ حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کا آزادانہ کام اہلِ اردو کے بیچ بڑے پیمانے پر ہوتا ہوا کم از کم ہندستان میں نظر نہیں آتا۔ ایک سبب اس کا یہ بھی ہے کہ اردو داں طبقے میں ہندی اور انگریزی زبانوں سے جو عمومی آشنائی بڑھتی چلی گئی، اس نے ان زبانوں سے ترجمے کی ضرورت کو شاید کم کر دیا کیوں کہ بڑا طبقہ براہ راست استفادے کے لیے موجود تھا۔ پچھلے دور میں ہماری زبان میں کل وقتی مترجمین کی ایک کھیپ بھی سامنے آئی تھی، اس کے علاوہ معتبر مصنفین ان تحریروں کا بھی انتخاب اور ترجمہ کرتے رہتے تھے جنھیں وہ اہم سمجھتے تھے۔ اہم ذاتی ترغیب کی بنیاد پر ایسے تراجم کم ہوئے ہیں۔ دوسری زبانوں سے اردو میں کچھ ترجمہ ہو بھی جائے مگر اردو سے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمے کا رجحان کم ہوا ہے۔ ہندی کو بہ طورِ استثنیٰ رکھا جا سکتا ہے کیوں کہ وہاں اردو سے بڑے پیمانے پر ہندی ترجمہ اور نقلِ حرفی

کی مثالیں آسانی سے ملتی رہتی ہیں۔

انیس الرحمان ہم عصر اردو مترجمین میں اس اعتبار سے نہایت اہم شخصیت کے مالک ہیں کیوں کہ انھوں نے اردو سے انگریزی اور انگریزی زبان سے اردو میں لگا تار تراجم کیے ہیں۔ وہ خاص طور سے شعری تراجم میں پیش پیش رہے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انھوں نے باضابطہ طور پر شاعری کی ہے۔ انگریزی میں ان کی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہوا مگر اردو شاعری کے جلد بند ہونے کے مواقع ابھی تک پیدا نہیں ہوئے۔ حالاں کہ اب سے پچاس برس پہلے سے خال خال ہی سہی، ان کی غزلیں رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان تخلیقی کاموں کے ساتھ وہ انگریزی زبان میں نقاد کی حیثیت سے احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ تنقید میں ہی فنِ ترجمہ نگاری کے ادبی و علمی مباحث کے لیے بھی ان کے مضامین اور ان کی کتابیں قابلِ غور سمجھی جاتی ہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ وہ انگریزی زبان کے معتبر استاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تراجم کے کام تو انھوں نے کافی پہلے سے شروع کر دیے تھے مگر گذشتہ ایک دہائی سے اس سلسلے میں ان کی مستعدی بڑھی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اردو کے جدید شعرا کے تراجم پر مشتمل ان کی ایک کتاب '*Fire and the Rose*' شائع ہوئی مگر ۲۰۱۹ء کے آغاز میں جب 'ہزاروں خواہشیں ایسی' جیسی ضخیم کتاب منظر عام پر آئی تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ انیس الرحمان اب مترجم کی حیثیت سے اردو ادب کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ انھوں نے اردو کے ۶۵ رشعرا کی دو دو غزلوں کا انتخاب کیا اور انھیں رومن اسکرپٹ کے ساتھ ساتھ ترجمہ کر کے تنقیدی و تحقیقی تحشیہ نگاری کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے بعد انھوں نے 'ہزار رنگ شاعری' کے نام سے ۲۰۲۲ء میں اردو نظم کا اسی طرح ضخیم انتخاب پیش کیا اور یہ کوشش کی کہ اردو کے تمام اہم نظم نگار اس مجموعے کا حصہ ہو سکیں۔ ۲۰۲۴ء میں انھوں نے غالب کے دو سو منتخب اشعار کا ترجمہ اردو، ہندی اور رومن خط میں شائع کیا اور ہر شعر کی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی۔ ابھی یہ خوش آیند اطلاع آئی ہے کہ میر کی سہ صدی کے موقعے سے انیس الرحمان نے میر کی سوانح اور ان کے منتخب اشعار کی تعبیر و تشریح پر ایک مکمل جلد بھی سامنے آ گئی ہے۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ میر کے بعد انھوں نے حضرت امیر خسرو کے انتخاب اور اس کے انگریزی ترجمے کے سلسلے سے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ توقع ہے کہ انگریزی ترجمے کی وہ کتاب بھی جلد ہی منظرِ عام پر آ جائے گی۔

یہ مترجم کی حیثیت سے ان کی ایک سرگرم زندگی کی کہانی ہے اور ایک دہائی سے کم مدت میں انھوں نے پانچ پانچ جلدوں کی ترتیب و تدوین اور ترجمے کے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ جو لوگ

سست رَو ہیں، ان کے لیے تصنیف وتالیف کی یہ رفتار اور سنجیدگی قابلِ رشک ہے۔ یہ بھی معلوم ہو کہ انیس الرحمان کے یہ تراجم نہ صرف یہ کہ اردوداں طبقے میں پوری سنجیدگی کے ساتھ پڑھے گئے بلکہ وہ حلقہ جہاں اردو زبان موجود نہیں ہے، وہاں بھی ان کی تصنیفات بڑے پیمانے پر فروخت ہورہی ہیں۔ اب عام طور پر انھیں نقاد اور شاعر سے بڑھ کر مترجم تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ شاید اسی لیے دلی اردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ اور ساہتیہ اکادمی نے بھی اس دوران انھیں اعزازات سے نوازا۔ یہ سارے اعزاز وانعامات انھیں اردو شاعری کے انگریزی تراجم ہی کے لیے ملے۔

اردو شاعری کے انگریزی تراجم کا بھی ایک اچھا خاصا سلسلہ رہا ہے۔ آغا شاہد علی، اعجاز احمد، خورشید الاسلام، رالف رسل، محمد ذاکر وغیرہ نے اردو شاعری کے سرمایے کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی مشقت اٹھائی ہے۔ اس سلسلے کی ایک مستحکم کڑی انیس الرحمان کی کتابیں بھی ہیں۔ 'ہزاروں خواہشیں ایسی' میں پہلی بار اردو کے منتخب ۶۵ رغزل گو شعرا کی دو دو غزلیں ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ شاعروں کے انتخاب میں انیس الرحمان نے محمد قلی قطب شاہ سے لے کر عصرِ حاضر کے شعرا تک کی ایک کہکشاں سجائی ہے۔ شعرا کو انھوں نے مختلف موضوعاتی اور تاریخی خانہ بندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ تنقید وتحقیق کے بھی طالب علم ہیں، اس لیے اس بات کا خیال رکھا کہ ہر عہد کی عمومی ادبی خصوصیات کے تعین کے ساتھ ہر مصنف کا مختصر تعارف بھی شامل کر دیا جائے تاکہ انگریزی زبان کا قاری ہر شاعر کے بارے میں ایک بنیادی معلومات بھی حاصل کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ آغاز میں غزل کی تاریخ اور انگریزی داں طبقے کے لیے اس صنف کے مطالعے کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک تفصیلی بیانیہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں ایسی کوئی مبسوط کتاب اب تک ہمیں نظر نہیں آئی جس میں اردو کے غزلیہ سرمایے کا اتنا بھرپور مواد اور اس قدر سنجیدہ مطالعہ موجود ہو۔ ظاہری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی پیش کش میں کہیں نہ کہیں انیس الرحمان کے لاشعور میں 'آبِ حیات' کی بناوٹ پیشِ نظر رہی ہے۔ بڑی کتابیں ہمارے دل وجان پر قابض ہوجاتی ہیں۔ اس ساخت اور خانہ بندی سے پڑھنے والوں کو آسانی بھی ہوئی کہ اردو شاعری کے عہد بہ عہد امتیازات کو سمجھتے ہوئے اس دور کے نمائندہ شعرا کے کلام کو مطالعے کا حصہ بنایا جائے۔

ابتدا میں ہی دو سوال مزید غور طلب ہیں کہ انیس الرحمان نے جن ۶۵ رشعرا کو اپنے انتخاب کا حصہ بنایا ہے، کیا وہ ہر اعتبار سے نمائندہ ہیں اور کیا ان کی شمولیت سے اردو شاعری کا بالخصوص غزل گوئی کا ایک مکمل منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے؟ اسی طرح سے دوسرا سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ہر شاعر کی جن دو غزلوں کو انیس الرحمان نے منتخب کیا ہے، کیا وہ اس شاعر کا سب سے نمائندہ کلام ہے؟ یا ان غزلوں کے

مطالعے سے ہم کیا ان شعرا کے جہانِ معنی میں واقعی داخل ہو سکتے ہیں؟ سرسری طور پر ان سوالوں پر غور کیا جائے تو طرح طرح کے جوابات آسکتے ہیں۔ انیس الرحمان نے صرف ۶۵ رشعرا کو چنا، کسی دوسرے نے پانچ سو شعرا کی شمولیت بھی کر دی ہو، اس کے باوجود بہت سارے ایسے شعرا کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں جو اس فہرست سے باہر ہوں گے۔ انتخاب کا حق اس مصنف یا مرتب کا ہے۔ انیس الرحمان براہِ راست اردو اور انگریزی کے علمی میدان سے متعلق رہے ہیں، اس لیے انھوں نے شعرا کے ناموں کے انتخاب میں کم تر دّدات کا سامنا نہیں کیا ہوگا۔ کم و بیش پانچ سو برس کی تاریخ سے اپنے ادبی اوصاف کی بنیاد پر لوگوں کو منتخب کرنا تھا۔ انیس الرحمان نے ہر عہد کی ادبی تحریکات اور رجحانات کو بھی نگاہ میں رکھا اور اس بات کی بھی کوشش کی کہ مقبولِ عام فہرستوں سے وہ پورے طور پر ایک نئی راہ نہ چن لیں۔ انھوں نے ہندستان کے ساتھ موجودہ پاکستان کے نئے پرانے شعرا کو بھی اس انتخاب میں شامل کیا جس کی وجہ سے فطری طور پر انھیں کچھ دوسرے شعرا کو شامل کرنے سے رکنا پڑا ہوگا۔ ۲۶ رشعرا جدیدیت کے دور سے شامل کیے گئے ہیں جس سے انیس الرحمان کی افتادِ طبع اور اپنی نسل کے لیے محبت داری کا بھی ایک اندازہ ہوتا ہے۔

دو غزلوں کا انتخاب تو وہ پُل صراط ہے جس سے کوئی مرتب بہ سلامت گزر ہی نہیں سکتا ہے۔ کسی شاعر نے پانچ سو غزل کہی اور کسی نے ہزار، اس میں پچاس نمایندہ غزلیں تو مل ہی جائیں گی۔ لیکن پچاس سے دو تک کا سفر مشکل اور کانٹوں بھرا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس شاعر کی صفِ اول کی غزلیں چھوٹ جائیں۔ اب دیوانِ میر یا مصحفی کے کلام کو پیش نظر رکھیں تو اس سمندر سے دو غزلوں کی تلاش اور انھیں ان کا نمایندہ قرار دینا کس قدر مشکل یا ناممکن ہے۔ اگر انیس الرحمان نے شعرا کے منتخب اشعار کو پیش کرنے کا مقصد سامنے رکھا ہوتا تو انھیں ان سب مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا مگر انھوں نے اردو غزل کو مکمل اکائی تسلیم کرتے ہوئے اپنا انتخاب مکمل کیا، اس لیے انھیں دوسرے اصول قائم کرنے پڑے۔ انیس الرحمان نے اس انتخاب کے مرحلے میں غزلوں کو ان کے صنفی امتیازات کے پیشِ نظر چنا۔ صرف مقبولِ عام دھاروں پر چلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان شعرا کے دواوین سے کسی نئی یا انوکھی غزل کی تلاش میں بھی بہت بار کامیابی پائی ہے۔ انیس الرحمان نے قابلِ ترجمہ متن کی تلاش کرنے میں خصوصی توجہ دی ہے۔ نفسِ مضمون میں بھی ضرور اس بات کا خیال رکھا کہ کس حد تک قابلِ ترجمہ ہے؟ اس سے اس کتاب کی موزونیت ظاہر ہوتی ہے۔

انیس الرحمان نے غزلیہ شاعری کے ترجمے کے لیے ایک اصول یہ بنایا کہ وہ انگریزی میں ردیفو ں کا التزام رکھیں گے اور جہاں ممکن ہو وہاں قوافی کے لیے گنجایشیں پیدا کریں گے۔ اردو کے طالب علم کی حیثیت سے میں اسے مصیبت مول لینا کہنا چاہوں گا۔ غزل کے تمام نقادوں نے اس کی ردیفوں کو

موضوعات کی سطح پر جکڑن اور تنگنائے احوال قرار دیا ہے۔ غزل کی تاریخ میں ہزاروں نہیں، لاکھوں اشعار ایسے ہوں گے جو صرف ردیف کی قید سے غیر ضروری طور پر اپنے اصل موضوع سے بھٹک گئے یا شعرا کے لیے امتحان کا باعث ہوئے۔ اس مرحلے میں میر ہوں یا غالب، مصحفی ہوں یا آتش، کون ہے جس کے قدم ڈگمگائے نہ ہوں۔ کہنا کچھ تھا مگر ردیف کی جھنکار نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ انیس الرحمان کے لیے انگریزی زبان میں ترجمے کے مرحلے میں ردیفوں سے دور ایک بستی کا آباد کر لینا مشکل نہیں تھا۔ اکثر مترجمین نے اردو اور فارسی شاعری کے ترجمے میں ردیفوں کے بوجھ سے خود کو آزاد کرنے کا راستہ چنا اور ترجمے کے فرائض ادا کیے۔ انیس الرحمان نے اپنے لیے یہ مشقت اور سنگِ گراں خود سے منتخب کیا۔

یہ بات سمجھنے کی ہے کہ انگریزی ترجمے میں انیس الرحمان نے ردیفوں کی شمولیت پر کیوں کر اصرار کیا؟ کم از کم وہ اردو شاعری کے اس جھمیلے سے بچ سکتے تھے اور حقیقی متن پر مرتکز ہو کر دادِ ترجمہ دے سکتے تھے۔ انیس الرحمان کے پیش نظر انگریزی زبان کے قارئین کو غزل کی وہ مخصوص فضا فراہم کرنی تھی جس سے اس صنف کی تاریخ اتنی تنومند اور باوقار بن سکی۔ اب اگر پابند شاعری یا کسی غزل میں قافیہ ردیف کا خیال نہ رکھا جائے تو وہ فضا کیوں کر قائم ہو سکے گی جو فارسی اور اردو شاعری کی تاریخ میں کم و بیش آٹھ سو برسوں سے موجود ہے۔ غزلیہ ماحول پیدا کرنے کے لیے یہ لازم تھا کہ جہاں جہاں گنجایش ہو سکے وہاں ردیفوں کے التزام کے لیے مشقت اٹھائی جائے اور ان الفاظ کے دہراو سے غزل کی تاریخ میں کون سے موضوعاتی، موسیقاتی اور لسانی کام لیے گئے، اس کا عرفان حاصل کیا جا سکے۔ ایک مترجم کی حیثیت سے انیس الرحمان نے گویا مشکل طَور آزمانے کا نشانہ رکھا، اس کی پشت پر ان کا وہ اعتماد کام کر رہا تھا کہ وہ اردو شاعری کی مکمل کیفیت کو انگریزی ترجمے میں اتار دینے کے اہل ہیں۔ انیس الرحمان اردو اور انگریزی دونوں زبان کے شاعر بھی ہیں۔ ترجمے کے دوران ان کا تخلیقی شعور ان میں یہ اعتماد بھی ڈالتا ہوگا کہ وہ اردو شاعری کی اس خصوصیت کو انگریزی میں تمام و کمال منتقل کر سکتے ہیں۔ وہ اردو ہی نہیں فارسی زبان کے بھی باشوق مطالعہ کنندہ ہیں، آنے والے وقت میں خسرو کے ترجمے کے دوران ہم ان کی صلاحیت کو ایک علمی کارنامے کے طور پر بھی دیکھ سکیں گے۔ یہ ان کا تخلیقی اعتماد ہی تھا کہ انھوں نے ردیفوں کی زنجیروں سے انگریزی ترجمے میں خود کو آزاد نہیں کیا بلکہ کہیں کہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اچھے اور قادر الکلام شعرا کی طرح وہ ترجمے کے دوران انوکھی ردیفیں وضع کرتے ہیں اور اس سے ایک شاعرانہ لطف اور محبوبانہ کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اردو غزل کے مترجم کے طور پر انیس الرحمان کا یہ اصولی اور تاریخی اجتہاد ہے۔

اردو غزل کے قارئین کے لیے اسے ایک دلچسپ مشق کے طور پر لیا جائے گا کہ انیس الرحمان

نے اردو کی مشہور غزلوں کے ترجمے کے دوران کس طرح سے ردیفیں وضع کی ہیں اور ایک مختصر چارٹ سے موازنہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح انیس الرحمان نے ان مشہور غزلوں کو اور ان کی ردیفوں کو انگریزی کا قالب عطا کیا ہے:

۱۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں (انشاءاللہ خاں انشا)	Set to leave, all the fellows here are **set to leave**
۲۔ تصوّر سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں (آتش)	I have chatted with her fine thoughts **for years**
۳۔ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہوتے تک (غالب)	My wails need a lifetime to reach the heart, **wait, O wait**
۴۔ دل گیا تم نے لیا ہم کیا کریں؟ (داغ)	You robbed me of my heart, **what can I do?**
۵۔ اسیرِ جسم ہوں میعادِ قید لامعلوم (شاد)	I'm my body's prisoner, how long my term, **I do not know**
۶۔ اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا (اقبال)	If the stars waver, whose sky is that? **Yours or mine?**
۷۔ ساقی کی ہر نگاہ پہ بَل کھا کے پی گیا (جگر)	I watched the Saqi's gaze each time **I drank my drink**
۸۔ سکوتِ شام مٹاؤ بہت اندھیرا ہے (فراق)	Let not the quiet of dusk grow, **it's too dark**
۹۔ رات بھی نیند بھی کہانی بھی (فراق)	A night, slumber, a tale **too**
۱۰۔ بربادِ تمنا پہ عتاب اور زیادہ (مجاز)	Let the lovesick be distressed, **a little more**
۱۱۔ بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں (جذبی)	The bliss of the days gone by, **where shall I get now**

۱۲۔ جنگ بھی تیرا دھیان بھی ہم بھی
(مجید امجد)
The war, your nagging thoughts, **and me too**

۱۳۔ ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیے
(مجید امجد)
Only to die a humble death **is all I desire**

۱۴۔ ہونٹوں پہ کبھی ان کے ترا نام ہی آئے
(ادا جعفری)
Let your name touch her lips, **let that happen**

۱۵۔ نہ غبار میں نہ گلاب میں مجھے دیکھنا
(ادا جعفری)
Not in dust, not in roses, **look for me**

۱۶۔ رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
(ناصر کاظمی)
Passers-by in pain's wilderness; **have patience a little patience**

۱۷۔ وہ رنگِ رخ و آتشِ خوں کون لے گیا
(خلیل الرحمان اعظمی)
That glamour, that gurgle of blood - **who took them all away**

۱۸۔ کریں نہ یاد شبِ حادثہ ہوا سو ہوا
(حسن نعیم)
Let's forget that terrible night, **happenedwhatever happened,**

۱۹۔ جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو(احمد فراز)
Wherever I look, I see **only you**

۲۰۔ اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
(احمد فراز)
The tale of the tamed times, **let someone write**

یہ محض چند مثالیں ہیں مگر اِن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کے اِس مخصوص مزاج یعنی ردیفوں کی شمولیت کو انیس الرحمان نے انگریزی ترجمے میں کس شوق اور مہارت کے ساتھ برتنے میں کامیابی پائی ہے۔ اِن سے اُنھوں نے غزلیہ فضا بندی اور نغمہ ریزی کے جو مقاصد تھے، اُسے بھی پورے طور پر حاصل کیا ہے۔

انیس الرحمان نے ردیفوں کے ساتھ قوافی کو بھی ترجمے کے دوران آزمایا ہے۔ کچھ ترجمے غیر مردّف انداز میں بھی موجود ہیں اور چند غزلیں ایسی بھی ہیں جہاں اردو کی طرح قافیہ اور ردیف دونوں کی موجودگی ملتی ہے۔ 'ہزاروں خواہشیں ایسی' میں بہ مشکل دس فی صد ایسی غزلیں سامنے آئی ہوں گی جن میں

انیس الرحمان نے ترجمہ کے دوران قافیہ اور ردیف سے آزادی پائی ہو۔ حالاں کہ اس کے باوجود اُن کا آہنگ غزل کا مانوس آہنگ ہی ہے۔ اِس صورتِ حال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انیس الرحمان نے اردو غزل کے ترجمے میں ممکن حد تک اردو کی غزلیہ روایت کو آزمانے کے ساتھ روایت سے باہر نکلتے ہوئے انگریزی کی عام شعری فضا کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ چند ملی جلی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) غیر مردّف تراجم

تجھ سے پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلہ نہ ہوا

You cared for love less and less
I couldn't complain of that stress
(حسرت موہانی)

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اُس کے بعد آئے جو عذاب آئے

Let some clouds gather, Let some wine flow
Then come what may when I'm all aglow
(فیض)

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لیے ہیں

My verses are for the world to cheer
But only a few lines for you to hear
(جاں نثار اختر)

یہ بھی نہیں بیمار نہ تھے
اتنے جنوں آثار نہ تھے

Not that I was naver riled
But never so very wild
(آشفتہ چنگیزی)

(ب) قافیہ اور ردیف کا التزام

روشنی کچھ تو ملے جنگل میں
آگ لگ جائے گھنے جنگل میں

Let there be some **light** in the jungle
Let some fire **ignite** in the jungle

(محمد علوی)

وہ لوگ جو زندہ ہیں مر جائیں گے اک دن
اک رات کے راہی ہیں گزر جائیں گے اک دن

All those who live now will **die** one day
Travellers of a night will **fly** one day

(ساقی فاروقی)

زمیں سے خلا کی طرف جاؤں گا
وہاں سے خدا کی طرف جاؤں گا

From the earth to **space**, I will set off
Then for God's land of **grace**, I will set off

(اسعد بدایونی)

مری رسوائی کے اسباب ہیں میرے اندر
آدمی ہوں سو بہت خواب ہیں میرے اندر

The reasons for my disgrace **lie** within me
I'm human, many a dream **fly** within me

(اسعد بدایونی)

☆

(ج) قافیہ اور ردیف کے التزام کے بغیر

حکمرانی بیاں سے باہر ہے
بے بسی اب مکاں سے باہر ہے

Power play goes beyond description
Helpless wanders beyond a home
(خورشید اکبر)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
Beyond the stars, many a world
Before love is proved, many a test
(اقبال)

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنّا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے
Why should I pray for death, why should I worry for life?
Be it this or that world, why should I care for any?
(معین احسن جذبی)

اِن مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انیس الرحمان نے اردو شاعری کے ترجمے میں اِن تینوں رویّوں کا حسبِ ضرورت استعمال کیا ہے۔ اردو میں اگر چہ ردیف وقوافی کا مشترکہ التزام سب سے مقبول رویّہ ہے مگر انیس الرحمان نے اپنے ترجمے میں اِسے دوسرے مقام پر رکھا ہے۔ اُن کے یہاں ردیفوں سے ایک مقصود بالذات فضابندی کی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ پڑھتے ہوئے ہر قاری غزل کی اُس مخصوص کیفیت میں اِن ردیفوں کی شمولیت سے بہت آسانی سے داخل ہو جاتا ہے۔ اِسی لیے انیس الرحمان نے ردیفوں کی آزادانہ حیثیت کو نہ صرف یہ کہ برتنے میں کامیابی پائی ہے بل کہ وہ اردو غزل کی اُس مخصوص دنیا میں قارئین کو لے جانے میں بھی کامیاب ہیں۔ انیس الرحمان اردو غزل کی تاریخ کے بہترین واقف کار ہیں، اِس لیے اُنھوں نے اپنے مترجمہ متن میں ایسی غزلیں بھی تیّار کیں جن میں قافیہ اور ردیف دونوں کا التزام نہیں ہے۔ اردو میں ایسی صورتِ حال ہو تو اُسے غزل کا حصّہ بھی نہ مانا جائے۔ بحر اگر ایک ہو تو نظمِ معریٰ کا عنوان ٹانک دیا جائے مگر انیس الرحمان نے اپنے ترجمے کو ہر جگہ خواہ مخواہ ردیف وقوافی کی زنجیروں سے باندھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اِسے اِس بات کے ثبوت کے طور پر بھی ہمیں لینا چاہیے کہ اُن کا ذہن تجربہ پسندی اور نئے آداب کے لیے بہت موزوں ہے۔ ایک کلاسیکی صنف کے ترجمے میں

اُنھوں نے اپنے ذہن کی اختراعی کیفیت کو ضائع نہیں ہونے دیا اور اپنے ترجمے کے متن میں فطری طور پر جہاں ردیف وقوافی کے لیے گنجایشیں تھیں، وہاں اُنھیں آزمایا لیکن ٹاٹ میں پیوند کی طرح اُنھوں نے ہر جگہ انگریزی متن میں قافیہ وردیف کی لازمیت کو جاری نہیں رکھا۔ بالا میں پیش کردہ مثالوں سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انیس الرحمان نے اردو شاعری کے انگریزی متن کو تیّار کرنے میں آزادانہ طور پر نظامِ قوافی کو تختۂ مشق بنایا ہے کیوں کہ جو غزلیں غیر مردف شکل میں انگریزی میں پیش ہوئی ہیں، وہ حقیقتاً اردو میں اِس شکل میں نہیں ہیں۔ اُسی طرح جو غزلیں قافیہ اور ردیف سے انگریزی متن میں آزاد ہیں، وہ اردو میں کسی ایسی آزادی کو آزماتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ اِس صورتِ حال میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انیس الرحمان نے ترجمے کے لیے ایک آزاد لسانی ڈھانچہ قائم کیا اور اُسے اردو غزل کے آداب کے متوازی چلانے کی کوشش کی۔ ایک انگریزی شاعر اور مترجم کے طور پر اُن کا تخلیقی اعتماد ہی اُن کے لیے رہ نما تھا ورنہ غزل کی ساخت میں اتنی آزادی کہاں سے مل پاتی۔ ایک مترجم کے طور پر اسے اُن کا جرأت مندانہ امتیاز مانا جا سکتا ہے۔

انیس الرحمان نے اِس کتاب کے نام میں انگریزی کا مختصر سا فقرہ ذیلی عنوان کے طور پر شامل کیا ہے: *'The wonderful world of Urdu Ghazals'* پانچ سو سال کی تاریخ سے اُنھوں نے پینسٹھ شعرا کی ایک سو تیس غزلیں کچھ اِس طرح سے شامل کی ہیں کہ ہر دور اور ہر اہم ادبی رویّہ اس کے دائرے میں سمٹ آتا ہے۔ انیس الرحمان نے ۲۰۲۴ء میں شائع شدہ اپنی کتاب *'The Essential Ghalib'* میں غالب کے دو سو منتخب اشعار کے معنوی نظام سے بحث کی ہے۔ اِس اعتبار سے 'ہزاروں خواہشیں ایسی' سے غالب کے انتخاب تک ایک بنیادی تبدیلی سامنے آتی ہے۔ غالب کے انتخاب میں اُنھوں نے غالب کی چالیس پچاس منتخب غزلوں کو شامل کرنے کے مقابلے میں دو سو متفرق اشعار کو چننا زیادہ مناسب سمجھا۔ یہیں صنفِ غزل کے اُس مزاج کو بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ آخر غزل کی دنیا کس چیز سے استحکام پاتی ہے۔ صنفِ غزل کا اوّلین کَکَہرا پڑھتے ہوئے ہمارا طالبِ علم یہ بتاتے نہیں بھولتا کہ اردو غزل کا ہر شعر آزادانہ طور پر اپنا معنوی نظام رکھتا ہے اور سلسلۂ مضامین کا معنوی التزام رکھنا شاعر کے لیے ضروری نہیں۔ اِسی صنفی اختصاص سے غزل اور نظم دو دنیاؤں کی سیر تسلیم کی جاتی ہیں۔

'ہزاروں خواہشیں ایسی' کتاب میں چوں کہ اُنھیں قارئین کو غزل کی طویل تاریخ اور روایت سے باخبر کرانا تھا، اِس لیے اُنھوں نے غزل کو اکائی کے طور پر منتخب کیا لیکن تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ہر غزل میں چند اشعار ہی نمایندہ ہوتے ہیں۔ غزل کی تنقید میں آخر 'برائے بیت' کی اصطلاح کیوں کر رائج ہوئی؟ اِسی طرح 'حاصلِ غزل' اور 'بیت الغزل' جیسی اصطلاحات بھی اِسی لیے سامنے آئیں کہ اُنھی چند

اشعار پر شاعر کے طلسمات اور جلال و جمال کا مدار ہوتا ہے۔ اُس ایک شعر کی پیش کش کے لیے شاعر نے مطلع، حسنِ مطلع اور مقطع جیسے نہ جانے کتنے لوازم کا اضافہ کیا۔ اِن سب کے بعد بھی اگر پانچ اشعار نہ پورے ہو رہے ہوں تو ایک اور 'برائے بیت' شعر کہہ کر شاعر نے اُس روایت کا خیال رکھتے ہوئے غزل کی ظاہری ساخت متعین کی مگر شاعر کو بھی معلوم ہے کہ جس شعر کے لیے وہ غزل کہی گئی تھی، شہرت اور عزت اُسی شعر کے حوالے سے میسّر آئے گی مگر روایتِ شعری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اچھے اور گوارا اشعار سے ملا کر مطلع اور مقطع کے ساتھ کم از کم پانچ اشعار کا ایک نمونہ تیار کر دے۔

اردو غزل کے اِس انتخاب اور ترجمے کی حیرت انگیز دنیا کی سیر کرتے ہوئے ہمیں اِس پہلو سے بھی توجّہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری تاریخ کے جو چند مشہور اشعار تھے، وہ مترجم کی گرفت میں کس قدر آئے ہیں اور یہ بھی دیکھا جائے کہ ترجمہ شدہ متن میں کون سے ایسے اشعار ہیں جو ترجمے کے طور پر 'حاصلِ غزل' کا درجہ رکھ سکتے ہیں۔ اِسی کے ساتھ اردو غزل کی تاریخ میں 'منھ بولتے مصرعوں' کی بھی خاص روایت رہی ہے۔ وہ مصرعے شعرا کے دواوین سے نکل کر ہمارے گھر آنگن اور بازار میں روزمرّہ اور ضرب المثال کی شکل میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ انیس الرحمان کی اِس ترجمے کی پھیلی ہوئی دنیا سے جب تک ایسے اشعار اور مصرعوں کی تلاش نہ کر لی جائے، اردو غزل کی تاریخ کی اُس بوقلمونی اور بلندی کی معرفت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اِس سلسلے سے چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

(الف) منتخب اشعار

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے ہمیں انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

The skies don't spare me a moment to think, Insha
Now, it's enough for us to sit apart and set to leave

(انشااللہ خاں انشا)

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

I too have a tongue in my mouth
Wish you asked: what matters, what?

(غالب)

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

I know, Ghalib is no good
What if he comes for free, what?
(غالب)

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

Hundred circles in each eddy, hundred crocodiles too
See what happens till the drops become pearls, wait, O wait
(غالب)

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

But who can cure the pains of life and living, Asad?
The lamp burns in every hue till dawn's break, wait O wait
(غالب)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

You are mine when none else is mine
None else but you alone are mine
(مومن)

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

I joined the tale of life but only midway
Where it begins, where it ends, I do not know
(شادعظیم آبادی)

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہیں کم یاب ہیں ہم

Millions move to reach the goal; only a few get there at last
Value me, my dear ones; I'm not extinct, but rare I am

(شادعظیم آبادی)

قناعت نہ کر عالمِ رنگ وبو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

Not end to the world of glamour
Many a garden, many a nest

(اقبال)

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئے

What is knowledge, what is its worth?
We had aplenty, there was no dearth

(یگانہ چنگیزی)

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

A heart and the pain of the heart
Curse of divine scale too

(فراق گورکھ پوری)

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

I sat to count all life's loss and gain
Your memories came, all in a row

(فیض)

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبیؔ، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے

The world deserted me, Jazbi, why shouldn't I desert the world?
I have known it well, why should I pine for the world now?
(معین احسن جذبی)

یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہے

All this living among books and journals
Is only to keep her memories in clear
(جاں نثار اختر)

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کے نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہہ گار کی طرح

Majrooh! He's scribbling the names of lovers
I too with them-like a damned sinner
(مجروح سلطان پوری)

دنیائے بے طریق میں جس سمت بھی چلو
رستے میں اک سلام رفیقانہ چاہیے

Whichever way I move in a rowdy world, I may
Only a kind greeting on the way is all I desire
(مجید امجد)

روشن ترائیوں سے اُترتی ہوا میں آج
دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیے

With the winds descending from the luminous foothills
To walk a few wobbling steps is all I desire
(مجید امجد)

حیراں ہیں، لب بستہ ہیں، دل گیر ہیں غنچے
خوش بُو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے

Blossoms wonder; they are sad and silent too
May the fragrance bring your word, let that happen
(اداجعفری)

تھک ہار کے بیٹھے ہیں سرِ کوے تمنّا
کام آئے تو پھر جذبۂ ناکام ہی آئے

I'm tired; I sit forlorn by the lane of desire
Let the failed emotions matter, let that happen
(اداجعفری)

تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں

All day long in your lane
Pain's pebbles I pick anew
(ناصرکاظمی)

سو گئے اک ایک کر کے خانۂ دل کے چراغ
اُن چراغوں کو جگا دے زندگی اے زندگی

One by one, all the lamps of the heart went to sleep
Wake them up once again, O life, my life
(خلیل الرحمان اعظمی)

پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے
پیار ہوتا ہے گھنے جنگل میں

The tree stand embracing trees
Love glows so bright in the jungle
(محمدعلوی)

(ب) مصرعے

دیکھیے وہ کیا کریں ہم کیا کریں (داغ)

Now let me see what she does, what can I do?

پھر نئی صبح لے گی جنم، صبر کر صبر کر (ناصر کاظمی)

We shall surely meet at dawn; have patience, a little patience

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے (درد)

Is this a life, or a rough strom I suffer

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی (بہادر شاہ ظفر)

It was never so very hard to speak, but now

بستیاں دل کی بھی سنسان پڑی ہیں کب سے (زیب گوری)

The heart has stayed deserted all along

پہلے اُن کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے (ظفر اقبال)

You should first get out of your own slumbers

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے (احمد مشتاق)

The water flows quietly in silence

یہ ایک ابر کا ٹکرا کہاں کہاں برسے (شکیب جلالی)

A single piece of cloud and many a cracked earth

انیس الرحمان کا یہ انتخاب ایک نگار خانۂ رقصاں ہے۔ اردو غزل کی تاریخ کے تقریباً تمام اہم کردار اپنی انفرادی اور اپنے عہد کے اجتماعی شعور کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کے فکری اور اسلوبیاتی رنگا رنگیوں سے یہ جہاں آباد ہے۔ انیس الرحمان نے انتخابِ کلام کا کام کسی عجلت میں نہیں۔ اُنھوں نے ایک باذوق قاری کی طرح برسوں اردو شاعری کا جو آزادانہ مطالعہ کیا تھا، اُسی سے وہ ایک مختصر فہرست بنانے میں کامیاب ہوئے جس میں اردو کے بہترین غزل گو شعرا کی شمولیت ہو پائی۔ افراد کے انتخاب میں نہ جانے کتنی بار ردّ و بدل اور تخفیف و اضافہ کا عمل گزرا ہوگا۔ اِسی طرح انتخابِ کلام میں ہر شاعر کا وہ نمونہ منتخب کرنا جو اُس کے مجموعی سرمایے کے لیے نمایندہ کا درجہ رکھتا ہو مگر ہر کلام کو اِس طرح چنا جائے کہ وہ اجتماعی طور پر اُس صنف کی جملہ خصوصیات کو حاوی رہے۔

اردو کے طالبِ علم کی حیثیت سے جب اِس انتخابِ کلام کو پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو غزلیہ شاعری کے سارے ابواب اِن صفحات میں کھُل گئے ہیں۔ چھوٹی بڑی ہر تحریک سے وابستہ موضوع اور اسلوب مرتب کے پیشِ نظر ہے اور اُس کی کوشش ہے کہ گذشتہ پانچ صدیوں کی ہر سانس اور دھڑکن اِس میں شامل ہو سکے۔ انیس الرحمان نے اِس عظیم سرمایۂ غزل کو انگریزی قالب عطا کرنے میں جس قدر مشقّت اُٹھائی ہوگی، اِس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ایسے مشکل کاموں کی بساط بچھائی ہو۔ اُنھوں نے اپنی تمام تر ذولسانی مہارت اور تخلیقی وفور کو اِس کتاب میں شامل کر کے ایک مثالی نمونہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انیس الرحمان اِس کتاب میں اپنے مختصر تعارفی نوٹ اور مترجم کی حیثیت سے شذرات کی وجہ سے اردو غزل کی تاریخ کے ایک نقّاد اور محقق کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اُنھوں نے غزلیہ شاعری کی جو صفات، مختلف ادوار کے اوصاف اور شعرا کے تعارف میں جو تنقیدی و تحقیقی اشارے شامل کیے ہیں، وہ اِس لائق ہیں کہ اُن پر آزادانہ طور پر گفتگو کی جائے۔ وہاں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ماہر اسکالر کے طور پر اُن کی حیثیت اُبھرتی ہے۔ یہ کتاب اِس لیے بھی یادگار رہے کہ وہ اُن کی ادبی، علمی، ذولسانی، تحقیقی وتنقیدی تمام طرح کی بصیرتوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے جس کی قدر آنے والے وقت میں ہوگی۔ اُن کے تراجم واقعتاً ٹھہر ٹھہر کر چاؤ سے پڑھنے کا تقاضا کرتے ہیں، اُن سے عام کتابوں کی طرح سرسری گزرنے کا طور اپنانے سے اُن کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو شاعری کے جس طلسم خانے میں انیس الرحمان نے اپنے ترجموں سے دستکیں دی ہیں، 'میرؔ' اور 'خسروؔ' کے سلسلے سے اُن کی کتابوں کی اشاعت کے بعد اُنھیں اپنی زبان کے عظیم مترجمین میں گِنا جائے گا۔ وہ اِس داد اور تحسین کے ہر طرح سے مستحق ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

Department of Urdu,
College of Commerce, Arts and Science, Patna: 800020
Email Id: safdarimamquadri@gmail.com
Mob & Whatsapp: 9430466321

● ڈاکٹر قسیم اختر

سعادت حسن منٹو کی خاکہ نگاری

کہتے ہیں کہ جب وقت میں برکت ہوتی ہے تو ایک قلیل وقفے میں آدمی ایسے ایسے کارنامے انجام دے دیتا ہے کہ عقل انسانی حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔اس کی نوعیت مبالغے کی سی ہو جاتی ہے کہ عقل بھی قبول کرنے میں تر دد سے کام لیتی ہے۔کسی طرح بھی تصور میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک انسان نے اکیلے اتنا بڑا کام کر دکھایا ہے۔جیسے امام غزالیؒ کی ایک کتاب جس کا نام ابھی ذہن میں محفوظ نہیں، چالیس جلدوں میں ہے۔بعض اہل علم کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب کو صرف پڑھنے کے لیے ایک عمر چاہئے۔حالانکہ امام غزالی نے غالبًا ۵۵ سال کی عمر میں اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ٹھیک اسی طرح منٹو نے ایک قلیل مدت یعنی بیالیس سالہ زندگی میں اتنا کچھ کر دکھا کہ حیرت ہوتی ہے۔یہاں امام غزالی اور منٹو کے درمیان مطابقت پیدا کرنا مقصود نہیں۔دونوں کا کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔لیکن اتنی بات طے ہے کہ امام غزالی کی طرح منٹو کی عمر میں وہ برکت تھی کہ منٹو نے قلیل مدت میں سیکڑوں افسانے لکھے، خاکے بھی لکھے۔ایک ناول بھی لکھا۔ترجمے کا کام بھی احسن طریقے سے انجام دیا۔ڈرامے لکھے، فلموں سے بھی تعلق رہا۔

اور یہیں پر میں یہ بھی کہہ لوں کہ............ بے طرح تمام عمر پیتا بھی رہا۔آخری وقت میں بھی پانی کی جگہ اس نے شراب کی ایک گھونٹ لی۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شراب میں اس طرح ڈوبے رہنے کے باوجود منٹو نے اپنی بیشتر تخلیقات میں دانش مندی کی بات کی ہے۔اور فن کو بھی معراج عطا کیا ہے۔اور اس کے فن کی یہ معراج افسانے ہی میں نہیں اس کے خاکوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منٹو جتنا دن بھی جیا ادب کے لیے جیا۔پینا اس کا شغل تھا اور ادب اس کی حیات۔وہ پیتا تھا اور لکھتا تھا، لکھتا تھا اور پیتا تھا۔لیکن بہکتا نہیں تھا۔اسی لئے نشے میں بھی وہ ادب اور دانش کی باتیں کر گیا۔عصمت چغتائی نے منٹو کا خاکہ لکھتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔
> میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔مجھے تو کبھی کوئی

فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیے ہوتو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں ......''(مضمون؛میرا دوست میرا دشمن!:عصمت چغتائی)

گویا ادب اس کی روح تھی اور شراب اس روح کی غذا۔اس کا جسم مٹ چکا تھا یا جسم بھی روح بن چکا تھا۔اس میں ڈوب کر اسے انسانی اقدار، سماجی قدریں اور اخلاقی محاسن کا شدت سے احساس وادراک ہوتا تھا۔اور جب اس کیفیت میں وہ سماج پر، سماج کے افراد پر، افراد کے اطوار پر نظر ڈالتا تھا تو اسے برائیاں ہی برائیاں نظر آتی تھیں۔اور پھر اس کا قلم چل پڑتا تھا۔اور جب قلم چلتا تھا تو سماجی اور انسانی برائیوں کی سختی سے گرفت کرتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ منٹو اپنے خاکوں میں بھی فرد کی کمزوریوں اور کج رویوں کی ہی گرفت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔منٹو نے خاکہ نگاری کے اصول توڑ ڈالے اور اپنے لیے ایک نیا اصول وضع کیا۔اس نے اپنے خاکوں میں ممدوح کی مدح سرائی نہیں کی بلکہ ممکن ہوا تو ہجو ہی کر ڈالی۔حالانکہ بیشتر خاکے اس نے اپنے قریبی لوگوں پر ہی لکھے جنہیں وہ اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا۔ظاہر سی بات ہے خاکے اسی شخص کے بہتر طور پر لکھے جاسکتے ہیں جس سے خاکہ نگار بھرپور طور پر واقف ہو۔منٹو اپنے خاکے کے 'کرداروں' سے پوری طرح واقف ہے لیکن منٹو کی جودتِ طبع ان کرداروں کے خط وخال نہیں دیکھتی بلکہ ان ''فرشتہ صفت'' کرداروں کے اندرون میں چھپی انسانی کمزوریوں تک پہنچتی ہے اور انہیں پکڑ کر باہر لاتی ہے۔منٹو کے خاکوں کے ایک مجموعے کا نام ''گنجے فرشتے'' ہے۔اس مجموعے کے خاکوں میں شامل اشخاص جو بظاہر فرشتے ہیں، منٹو ان کا مونڈن کرتا ہے اور انہیں گنجہ بنا دیتا ہے۔اس اعتبار سے یہ عنوان یعنی ''گنجے فرشتے'' معنویت کا حامل ہے اور اس سے منٹو کی شوخ طبیعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔منٹو کو اس بات کو پورا احساس تھا کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے اس لیے اس نے برملا اس کا اظہار بھی کر دیا کہ

''میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔اس کے منہ سے گالیوں کی بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔میرا جی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔''(گنجے فرشتے:منٹو)

گویا منٹو نے اپنے خاکوں میں اپنے ''ممدوح'' کا مونڈن کیا ہے اور اسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ اس نے یہ مونڈن بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ یہاں ممدوح کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ خاکوں میں عام طور پر خاکہ نگار مدح سے ہی کام لیتے رہے ہیں۔ بہرکیف منٹو کی یہی چھٹی حس تھی جس نے اس کے جسم کو بھی روح بنا دیا تھا۔ اور شاید اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے حسن عسکری نے منٹو کے بارے میں کہا تھا کہ:

> ''......منٹو بڑی خوفناک چیز تھا۔ وہ ایک بغیر جسم کے روح بن کر رہ گیا تھا......منٹو سوچتا تو احساسات اور جسمانی افعال کے ذریعہ ہی تھا لیکن یہ چیز وہ تھی جس کے متعلق اسپین کے صوفیوں نے کہا ہے کہ جسم کی بھی ایک روح ہوتی ہے۔ یہ روح منٹو نے پالی تھی......''
>
> (بحوالہ منٹو ایک لیجنڈ ۔مرتب: ہمایوں اشرف)

بہرحال منٹو کی چھٹی حس وہ سب کچھ دیکھتی ہے اور اپنے قاری کو دکھانا چاہتی ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ ہے۔ منٹو حقائق کو افسانوی رنگ دے کر پیش کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے خاکوں میں کہانی پن کے ساتھ دلچسپی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے خدوخال کو نمایاں کرنے کے لیے کہانی بھی گھڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین اس کے خاکوں میں پیش کئے گئے تمام حقائق سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ اسے سراسر منٹو کی اختراع تصور کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ منٹو کو قریب سے جاننے والے اس بات کے قائل ہیں کہ منٹو اپنے سینے میں ایک دردمند دل بھی رکھتا تھا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں خود کرشن چندر نے منٹو کا خاکہ لکھتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ منٹو اپنے دل میں بشری محبت رکھتا ہے لیکن اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کرشن چند کے لفظوں میں:

> ''......وہ ہزار بار کہتا ہے مجھے انسانوں سے محبت نہیں۔ وہ کہے گا مجھے دوستی، عنایت، شفقت کسی پر اعتبار نہیں۔ میرا اعتقاد شراب ہے۔ ......وہ یہ سب باتیں کہتا ہے تکلفاً کبھی آپ کا جی جلانے کیلئے، منہ چڑانے کے لئے، اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے بھی۔ وہ سب باتیں کہتا ہے لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں۔ اس کا قلم کچھ اور کہتا ہے اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کی زبان کی طرح اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں۔ وہ اپنی انسانی ہمدردی، اپنی ترقی پسندی، اپنی بشری محبت پر پردہ ڈالنے کی ہزار کوشش کرتا ہے۔ ......

لیکن اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں ہے اور ہر افسانے کے پس پردہ انسانی محبت ابلی پڑتی ہے۔'' (سعادت حسن منٹو: کرشن چندر)

منٹو پر لکھتے ہوئے کئی اور قلم کاروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ منٹو ایک جذبات سے بھرا دل رکھتا تھا لیکن ہر وقت اس کی پردہ داری کرنا چاہتا تھا۔حتیٰ کہ اپنے خاکوں میں بھی وہ اسی عمل سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''...........منٹو نے دوستی کو دشمنی کا سارنگ دے دیا ہے۔ریا کاری کی یہ عجیب وغریب شکل ہے۔لوگ مصلحت کو مدنظر رکھ کر دشمن کو بھی دوست کہتے ہیں۔منٹو دوست کے گن بھی حسب دلخواہ نہیں گا تا کہ لوگ اس کی اس کمزوری پر مطلع نہ ہو جائیں کہ وہ جذباتی قسم کا آدمی ہے اور دوستوں کے تمام عیوب معاف کر دینے پر قادر ہے۔'' (مضمون: گنجہ فرشتہ۔سید عابد علی عابد مشمولہ :منٹو ایک لیجنڈ)

عابد علی کے ان جملوں سے جہاں منٹو کی بشری ہمدردی کا احساس ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ منٹو نے اپنے خاکوں میں اپنے دوستوں کی مدح سرائی نہیں کی ہے بلکہ انہیں واضح لفظوں میں کہیں تو ''بے نقاب'' کیا ہے۔منٹو کے خاکوں سے ایک دو مثالیں دیکھیں جس سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جائے گی۔

عبدالباری صاحب منٹو کے وہ محسن تھے جس نے منٹو کو ادب کی راہ پر ڈالا۔ان کا خاکہ لکھتے ہوئے منٹو کا قلم کچھ اس انداز سے چلتا ہے:

''ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چھیڑنے کی خاطر باری صاحب سے کہا۔

آپ کی یہاں سب لوگ عزت کرتے ہیں۔بی بی جان آپ کو نمازی اور پرہیزگار کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے۔اگر وہ یہاں آجائیں تو کیا ہو؟''

باری صاحب نے کہا:''میں کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں گا اور پھر کبھی ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر

کودجاتے رہے۔ یہ کھڑکی کھلی رہتی۔ مگر وہ پھر کبھی اس کو اپنی شکل نہ
دکھاتے۔''   (گنجے فرشتے:منٹو)

عصمت چغتائی سے منٹو کی بڑی قربت رہی۔ مختلف موضوعات پر دونوں میں اکثر بحثیں ہوتیں۔ دونوں اپنی ضد پر اڑنے والے تھے۔ عصمت نے منٹو کا جو خاکہ لکھا اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے اور منٹو نے عصمت کا جو مرقع تیار کیا ہے اس میں بھی دونوں اپنی اپنی ضد پر قائم نظر آتے ہیں۔ عصمت پر لکھے خاکے سے دونوں کی شبیہ ایک ضدی کی ابھرتی ہے۔ یہ خاکہ افسانوی انداز میں شروع ہوتا ہے۔ منٹو کہانی گھڑتا ہے کہ اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو کیا ہوتا؟ لیکن خاکوں میں ابھرنے والی اس ''ضد'' سے پرے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ منٹو عمر بھر عصمت بہن کہتا رہا یہ تمام باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ تخلیقی سوچ اور فکری سطح پر دونوں میں بڑی موافقت تھی۔ مگر منٹو جب عصمت کا خاکہ کھینچنے بیٹھتا ہے تو اس کا کھلنڈرا پن، اس کی شوخی اور اس کی طراری عود کر آتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے ناامیدی ہوئی اس لیے میں 'لحاف' کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا 'یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی'

میراجی کا جو خاکہ منٹو نے کھینچا ہے اس سے قطعی طور پر میراجی کی بہتر شبیہ نہیں ابھرتی۔ اس کی شاعری اور شخصیت دونوں پر ضرب پڑتی معلوم ہوتی ہے۔ دو چار جملے دیکھیں:

''......اس کے گلے میں موٹے موٹے گول منکوں کی مالا تھی جس کا صرف بالائی حصہ قمیص کے کھلے ہوئے کالر سے نظر آتا تھا میں نے سوچا اس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے۔ لمبے لمبے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکے تھے فرنچ کٹ سی داڑھی، میل سے بھرے ہوئے ناخن، سردیوں کے دن تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔''

آغا حشر کاشمیری کے بارے میں منٹو لکھتا ہے:

'' تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیوں کی جانب سے ہلکی سی مہک آئی پھر سرسراہٹیں سنائی دیں۔ آغا صاحب کا چہرہ بشاش ہو گیا، مختار جو ہرگز حسین نہیں تھی خوش وضع کپڑوں میں ملبوس صحن میں داخل ہوئی۔ آغا صاحب اور

حاضرین کوتسلیمات عرض کی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ آغا صاحب کی آنکھیں وہاں تک چھوڑنے گئیں............ معافی چاہتاہوں۔ اندر ایک معشوق میراانتظارکررہاہے۔''(گنجے فرشتے)

ایک مثال اور دیکھیں۔معروف اداکاراشوک کمار سے منٹو کے گہرے مراسم تھے۔اشوک کماراپنی راز کی باتیں بھی منٹوکو بتادیا کرتے تھے۔منٹو نے جب''پارودیوی'' کا خاکہ لکھا تو اشوک کمار کی ایک راز کی بات طشت از بام کردی۔پارودیوی اشوک کمار کو چاہتی تھی۔ایک روزاس نے اشوک کمارکوا کیلے آنے کو کہا۔اور جب اشوک کمار پارودیوی کے فلیٹ پہنچے تو جو کچھ ہوااس کی تفصیل منٹو کے خاکے میں اشوک کمار کی زبانی سنئے:

''میں بڑاڈرپوک ہوں۔جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہوجاتا ہے۔ اس نے (پارودیوی) مجھے صوفے پر بٹھایا۔آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔دو پیگ مجھے پلائے۔خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر--- پھر وہ لگی اپنی محبت دکھانے......میں سنتارہااور کانپتارہا۔جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا......اس کی آنکھوں میں آنسوآ گئے لیکن فوراً کہیں غائب ہوگئے......وہ مسکرانے لگی...... بھیااشوک!میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی...... میں نے یہ سنا تو چکرا گیا۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا، اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا...... کار میں بیٹھا......گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے بڑاافسوس ہوا!

''کیاہرج تھااگر میں''............اشوک کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں نے کہا''ہاں کوئی ہرج نہیں تھا۔''

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہوگیا......''اور...... مجھے وہ پسند بھی تھی۔''(خاکہ: پارودیوی)

اس طرح منٹو نے خاکہ نگاری کا اصول ہی بدل دیا۔وہ اپنے افسانوں کی طرح اپنے خاکوں میں بھی بے باک نظرآتا ہے۔خواہ اس کے لیے آپ جو بھی توجیہہ دیں کہ منٹورحم دل، ہمدرد، بشری محبت رکھنے والا اور دوستوں سے دوستی رکھنے والا تھا اور اپنے جذبات پر پردہ ڈالنے کیلئے ایسے طرز بیان کو ہتھکنڈہ کے طور پر اپنایا مگر حقیقت تو یہی ہے کہ منٹو اپنے خاکوں میں ہر جگہ موجود نظر آتا ہے۔اس کی شوخی،اس کا کھلنڈرا

پن اس کے ساتھ ساتھ ہر خاکے میں جلوہ ساماں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے خاکوں میں ایک دوسرا شخص بھی ہے اور وہ خود منٹو ہے۔

منٹو بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کے خاکوں میں بھی افسانویت پائی جاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اسے دیگر خاکہ نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ اسے ممتاز بناتی ہے۔ منٹو کی زبان میں دلکشی اور دل نشینی ہے۔ وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ چاہے جس کا اور جس ماحول کے رہنے والے کا خاکہ لکھے، جس طرح چاہے اسے پیش کر سکتا ہے۔ اس کے قلم کی جودت، دامنِ دل پر اپنا نقش چھوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ منٹو کے خاکوں پر لکھنے کے لیے بھی ایک دفتر چاہئے۔ میں آخر میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا قول نقل کرنا چاہتا ہوں جس سے خاکہ نگاری میں منٹو کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''منٹو اردو کا منفرد اور بے مثال خاکہ نگار ہے جس کی تحریریں جب تک اردو ادب میں باقی رہیں گی، خاکہ اردو ادب کی ایک مقبول صنف بنا رہے گا۔''

◀◀ ● ▶▶

Deptt.of Urdur,
Marwari College,Kishangunj(Bihar)
Pin. 855107
Mob. 9470120116
E-mail: qaseemakhtar786@gmail.com

نام کتاب: شاہد جمیل مکالمے اور بازگشت صنف: انٹرویوز مرتب: ڈاکٹر اشرف النبی قیصر سن اشاعت: ۲۰۲۵ء صفحات: ۲۱۵ قیمت: ۴۴۹/روپے مرتب کا پتہ: New Azeemabad Colony Sandal Nagar Patna - 6 Mob: 9430831832		نام کتاب: بھاشا سنگم (جنوری تا مارچ ۲۶) مدیر: ایس۔ ایم۔ پرویز عالم جلد: ۳۲ شمارہ نمبر: ۱ صفحات: ۱۱۲ ملنے کا پتہ: اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار

● غلام علی اخضرؔ

اقبال کا تصورِ امن

انسانی تاریخ کے عروج و زوال اور تہذیبوں کے ارتقا و انحطاط کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے پس منظر میں امن کی جستجو نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ لفظ بظاہر مختصر مگر معنوی اعتبار سے نہایت وسیع ہے۔ انسان نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے، وہ سکون، تحفظ اور عدل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے کبھی اس نے جنگ کا راستہ اختیار کیا تو کبھی معاہدات کی میز پر بیٹھ کر مسائل کے حل کی کوشش کی۔

دراصل دنیا کی تاریخ مسلسل کشمکش، جنگ و جدل، ظلم و استحصال اور طاقت کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ہے۔ اس لیے ہر دور میں امن کی خواہش تو موجود رہی مگر اس کی تعبیر مختلف انداز میں کی جاتی رہی۔ کہیں امن کو صرف جنگ کا عدمِ وجود قرار دیا گیا تو کہیں طاقتور اقوام کے مفادات کے تحفظ کو ہی امن کا نام دے دیا گیا۔ اس طرح امن کا مفہوم اکثر اوقات عدل اور انسانی وقار سے خالی ہو کر محض سیاسی بن کر رہ گیا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماضی کی تاریخ کی پگڈنڈیوں پر ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ عصرِ حاضر کا منظر نامہ ہی کافی ہے۔ ایسے ماحول میں علامہ اقبال کا تصورِ امن نہایت اہم ہے۔ اقبال صرف ایک شاعر نہیں بلکہ مفکر مصلح اور فلسفہ امن کے زبردست حامی تھے جن کا تصورِ امن ان کے وسیع تر فکری نظام کا حصہ ہے۔ ان کے نزدیک امن خاموشی، گوشہ نشینی، رہبانیت، جمود یا ظاہری سکون کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ متحرک اور باوقار انسانی کیفیت ہے جو پیہم حرکت و عمل کے نظام سے مستعار ہے۔ وہ اور ایسے امن کے قائل نہیں جو غلامی، ناانصافی یا ظلم کی بنیاد پر قائم ہو بلکہ ان کے فکر کا بنیادی محور ہی بیداری شعور تعمیر خودی اور ایک منصفانہ سماجی نظام کی تشکیل ہے۔

اقبال انسان کو محض ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک باوقار اور بااختیار وجود کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی امن وہ ہے جو عدل پر استوار ہو، جو انسان کو اس کی خودی سے آشنا کرے اور اسے ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کا بھی حوصلہ عطا کرے۔ جب تک انسان اپنی خودی کو مسخر نہیں کر لیتا، وہ نہ تو اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی پائیدار امن قائم کر سکتا ہے۔ اس لیے اقبال کا امن داخلی

بیداری سے شروع ہو کر اجتماعی نظام تک کو حاوی ہے۔ یہ امن فرد کی اصلاح، معاشرے کی تطہیر اور اقوام کے مابین عدل و احترام کے قیام سے عبارت ہے۔

علامہ اقبال کی فکر و نظر پر نہ صرف یورپ بلکہ مشرق کے بعض نام نہاد ناقدین اور ابن الوقت قسم کے دانشوروں نے بھی متعدد نوعیت کے الزامات عائد کیے۔ کسی نے انہیں فاشسٹ قرار دیا، کسی نے جنگ کا حامی ٹھہرایا تو کسی نے انھیں مذہبی مبلغ کے تنگ نظریاتی دائرے میں محدود کرنے کی کوشش کی۔ حالاں کہ اگر اقبال کی شاعری اور افکار کا دیانت داری اور غیر جانب داری سے مطالعہ کیا جائے تو یہ تمام سطحی تعبیرات پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں اور اقبال ایک منصفانہ نظام کے حامی اور امن کے حقیقی داعی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اقبال ایسے نظام کے سخت مخالف تھے جو ظاہر میں امن، انسانیت اور مساوات کا دعویٰ کرے مگر باطن میں استحصال، استعمار اور شیطنت کی پرورش گاہ ہو۔ علامہ اقبال کے اس خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر ظفر اقبال احمد صدیقی کے نام لکھا تھا:

> ''معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے، غلط ہے۔ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہوسکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے، مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے۔ (نہ حکم) دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ۹:۴۰۹ میں ان آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز میں جس کو سموئل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ہے۔ قرآن نے اس اصول کو کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔''(۱)

اسی طرح علامہ اقبال کے اس تفصیلی خط کا ایک اقتباس بھی پیش خدمت ہے جو انھوں نے اپنے استاذ پروفیسر نکلسن کے نام تحریر کیا تھا:

> ''......جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔''(۲)

مذہب اپنی اصل روح کے اعتبار سے انسانیت کو امن، رواداری اور باہمی احترام کا درس دینے

کے لیے آیا تھا مگر عصر حاضر میں اسی مذہب کو تعصب، نفرت اور تفریق کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ صورت حال دراصل مذہب کی تعلیمات کا نہیں بلکہ اس کی غلط تعبیر اور محدود فہم کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس شعر کے ذریعے اقبال نے مذہب کے صحیح مفہوم کو اجاگر کیا ہے کہ مذہب انسانوں کے درمیان دشمنی نہیں بلکہ اخوت اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

اقبال کی فکر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ دیگر اقوام اور مذاہب کے تئیں گہرا احترام رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف مذاہب کی مقدس شخصیات کے حوالے سے بھی عقیدت مندانہ اشعار کہے جو ان کے کشادہ ظرف، بین المذاہب ہم آہنگی اور انسانی وحدت کے تصور کی روشن دلیل ہیں۔ اس تناظر میں اقبال کا رویہ کسی تنگ نظر مذہبی تعصب کا نہیں بلکہ ایک ایسے فکری اعتدال کا آئینہ دار ہے جو اختلاف کے باوجود احترام کو ملحوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ دوسری قوموں کے بارے میں اپنے دلوں میں بغض و عناد کے جذبے رکھتے ہیں اور ان کے احساسات و جذبات کا لحاظ نہیں کرتے، ان کے لیے اقبال کے خطبات اور افکار قابل غور ہیں۔ خصوصاً ان کے خطبہ الہ آباد کا وہ حصہ جو بین الاقوامی تعلقات اور انسانی احترام کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اقتباس:

> ''جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر، قوانین و ضوابط...... مذہبی و معاشرتی ادارات کا بے حد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق مجھ پر یہ فرض عائد ہوجاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کروں۔ (۳)

اس ضمن میں اقبال کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو　　مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

اردو شاعری میں کعبہ، بت خانہ، دیر و حرم جیسے استعارے کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ بعض شعرا نے انہیں طنز و تعریض کے پیرائے میں برتا، تو کہیں یہ علامات فقط مزاحیہ یا روایتی شعری فضا قائم کرنے کا وسیلہ بنیں۔ مگر علامہ اقبال کے یہاں یہ علامات اور استعارات گہرے فکری اور تہذیبی پیغام رکھتے ہیں۔ اقبال ان استعاروں کو تفریق کے بجائے اتحاد کی علامت بنا دیتے ہیں کیوں ان کے نزدیک کعبہ ہو یا

بت خانہ، دیر ہو یا حرم سب کا خالق ایک ہی ہے اور تمام مظاہر اسی ذات واحد کی تجلیات ہیں جس نے کائنات کو وجود بخشا۔

اقبال کے تصور توحید کی اساس ہی یہ ہے کہ کثرت کے پردے میں وحدت کو دیکھا جائے۔ وہ خارجی اختلافات اور ظاہری امتیازات کے باوجود اس باطنی یگانگ باطنی یگانگت پر زور دیتے ہیں جو انسانیت کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں یہ مذہبی علامات تصادم یا برتری کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنتیں بلکہ باہمی ہم آہنگی اور روحانی وحدت کو روشن کرنے کے لیے سامنے آتی ہیں۔ اقبال دراصل کثرت میں وحدت کے داعی ہیں اور ان کے نزدیک پائیدار امن کا قیام اسی فکری زاویے کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ ذیل میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کعبے میں بت کدے میں برابر تری ضیا — میں امتیاز دیر و حرم میں پھنسا ہوا
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

امن کا قیام محض فکری یا سیاسی تصورات سے ممکن نہیں بلکہ اس کی بنیاد محبت، ہمدردی اور باہمی تعاون میں ہے۔ محبت کے ذریعے ایک دل نہیں بلکہ پورا عالم فتح کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک انسانیت کا ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور احترام امن کی اصل ضمانت ہے۔ جب تک انسان ایک دوسرے کے جذبات اور ضروریات کو سمجھ کر تعاون اور ہمدردی کا عملی مظاہرہ نہیں کرے گا حقیقی امن کا تصور محال ہے۔ اسی لیے اقبال کی شاعری میں دوسروں کے لیے محبت، بلاتفریق مدد اور ہمدردی بنائے امن کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے — ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے — کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
دل میں ہو سوز محبت کا وہ چھوٹا سا شرر — نور سے جس کے ملے راز حقیقت کی خبر
شاہد قدرت کا آئینہ ہو، دل میرا نہ ہو — سر میں جو ہمدردی انساں کوئی سودا نہ ہو
جو تو سمجھے تو آزادی ہے، پوشیدہ محبت میں — غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری — اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے — آتے ہیں جو کام دوسروں کے

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

اس طرح علامہ اقبال کی نظم 'طلوع اسلام' ایک ہمہ گیر انسانی اور آفاقی پیغام کی حامل نظم ہے جس میں وہ صرف نظم ملت اسلامیہ ہی نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کو خود غرضی، تفرقہ اور محدود قومیت کے حصار سے نکلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک انسانی زوال کی بنیادی وجہ وہ ہوس اور مفاد پرستی ہے جس نے انسان کو انسان سے جدا کر دیا ہے۔ اسی کیفیت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ہوس نے نوع انساں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور انسان اپنی اصل یعنی اخوت و محبت سے دور ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ پکار اٹھتے ہیں: 'اخوت کا بیاں ہو جا اور محبت کی زباں ہو جا'، یعنی انسان اپنی شناخت مفاد سے نہیں بلکہ محبت اور بھائی چارے سے قائم کرے۔

اقبال اس تقسیم کو محض اخلاقی خرابی نہیں بلکہ فکری و تہذیبی بحران سمجھتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی تو دراصل وہ اس مصنوعی تقسیم پر تنقید کرتے ہیں جو رنگ، نسل، وطن اور خطے کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کرتی ہے۔ وہ انسان کو شرمندہ ساحل کہہ کر اس کی محدود ہمتی پر گرفت کرتے ہیں اور اسے تلقین کرتے ہیں کہ وہ ساحل کی قید سے نکل کر سمندر کی بے کراں وسعت اختیار کرے۔ اس استعارے میں اقبال کا تصور آفاقیت پوری شان سے جلوہ گر ہوتا ہے، جہاں انسان اپنی تنگ نظری کو چھوڑ کر وسعت انسانیت کو اپناتا ہے۔ اسی تسلسل میں وہ رنگ ونسب کے تعصّبات کو انسان کی پرواز میں گرد آلود رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔ مرغ حرم کا استعارہ انسان کی اصل پاکیزہ فطرت کی طرف اشارہ ہے، جو وقتی تعصّبات اور ظاہری امتیازات کی دھول میں چھپ گئی ہے۔ اقبال اسے جھنجھوڑتے ہیں کہ اڑنے سے پہلے اپنے بال و پر جھاڑ لے، یعنی اپنی فطرت کو تعصّبات سے پاک کر کے اپنی اصل پہچان بحال کرے۔ ذیل میں طلوع اسلام کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر — شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی　　نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

نظم طلوع اسلام میں اقبال انسان کو تفرقہ نسل پرستی اور خود غرضی سے نکال کر عالمی اخوت، خودی کی بیداری اور ظم اخلاقی استکام کی راہ دکھاتے ہیں۔ پیلم دراصل ایک فکری انقلاب کا اعلان ہے جو انسان کو محدود شناختوں سے آزاد کر کے راہ ایک ایسی وحدت کی طرف لے جاتا ہے جہاں محبت، علم اور خودی کی روشنی میں ایک نیا عالمی نظام جنم لے سکتا ہے۔

علامہ اقبال امن کے معاملے میں اتنے سنجیدہ تھے کہ وہ بچوں کی تربیت کو بھی اسی فکری دھارے کے تحت دیکھتے تھے۔ موجودہ عالمی حالات میں جہاں انسانیت نفرت اور تعصب میں گھر چکی ہے اور وطن عزیز میں بھی بعض حلقے بچوں کو اقلیت دشمنی اور تعصّبات کے جذبات کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ایسے موقع پر اگر اقبال کی تعلیمات و مبنی فلموں کو اسکولوں میں پڑھنے سے اعتراض کیا جائے تو یہ حیرت انگیز بات ہے۔ اقبال کی نظم جس کا عنوان بچے کی دعا ہے، محبت، انسانی ہمدردی اور برائی سے بچنے کی تلقین پر مشتمل ہے۔ اس میں غریبوں کی مدد، ضعیفوں کے ساتھ شفقت اور وطن کی محبت کے ایسی اقدار بیان کی گئی ہیں جو چمن کی پھولوں کی طرح زندگی کو زینت بخشتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دعا نہ صرف بچوں کے لیے اخلاقی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے بلکہ امن اور ہم آہنگی کا پیغام بھی بھرپور انداز میں دیتی ہے اس طرح یہ دعا اقبال کے تصور امن کا ترجمان بھی ہے:

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت　　جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا　　درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو　　نیک جو راہ ہو اس رہ پر چلانا مجھ کو

علامہ اقبال کی نظم دنیا شوالہ نہ صرف مذہبی تعصّبات اور فکری تقسیم کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے بلکہ امن، اخوت اور باہمی ہم آہنگی کا پیغام بھی پیش کرتی ہے۔ اقبال نے یہاں یہ واضح کیا ہے کہ نفرت، تفرقہ جنگ وجدال اور بدخواہی مذہب یا عبادت کے حقیقی مقاصد کے برخلاف ہیں۔ وہ انسانیت کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندرونی تعصّبات اور خرافات کو چھوڑ کر شانتی کی طرف رجوع کرے۔ نظم میں وطن کی محبت اور انسانوں میں بھائی چارے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ سب عناصر حقیقی امن کے قیام کی بنیاد ہیں۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں　　بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی　　آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ　　دامان آسمان سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کا تصورِ امن محض سیاسی نعروں یا وقتی مفاہمتوں تک محدود نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اخلاقی اور فکری نظام سے وابستہ ہے۔ ان کے نزدیک امن کی بنیاد عدل، خودی کی بیداری، باہمی محبت اور احترامِ انسانیت پر استوار ہے۔ وہ ایسے امن کے قائل نہیں جو ظلم، غلامی یا استحصال کی کوکھ سے جنم لے بلکہ وہ انسان کو اندر سے مضبوط، باوقار اور باخبر دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اجتماعی سطح پر ایک منصفانہ نظام کی تشکیل کر سکے۔ اقبال کی شاعری میں اخوت، رواداری، اتحاد، بین المذاہب ہم آہنگی اور خدمتِ خلق کا جو درس ملتا ہے، وہ عصرِ حاضر کے پرآشوب ماحول میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر انسان اقبال کے پیغامِ محبت، عدل اور خودی کو سمجھ کر اپنی عملی زندگی کا حصہ بنا لے تو ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے جہاں امن محض خواب نہیں بلکہ زندہ حقیقت بن جائے۔

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

☆☆☆

(1) مکاتیب اقبال [جلد چہارم - جنوری ۱۹۳۵ تا اپریل ۱۹۳۸] مرتب: سید مظفر حسین برنی، ناشر: اردو اکادمی دہلی۔ سنہ اشاعت: ۲۰۱۳، ص: ۴۱۴
(۲) (مکاتیب اقبال [جلد دوم- جنوری ۱۹۱۹ تا دسمبر ۱۹۲۸] مرتب: سید مظفر حسین برنی، ناشر: اردو اکادمی دہلی۔ سنہ اشاعت: ۱۹۹۱ ص: ۲۲۹
(۳) خطبات اقبال، مرتبہ: رضیہ فرحت بانو، ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی، بار اول، سنہ اشاعت: ۱۵ر اپریل ۱۹۴۶، ص: ۲۳
(۴) کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ) فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمٹیڈ۔ دہلی

◀◀ ● ▶▶

H.No-13/A,Second floor Ghafoor, Nagar
Jamia Nagar OkhlaNewDelhi110025.
Mob: 7275989646

● منظور پروانہ

شاہد جمیل کی دوہا نگاری پر ایک نظر

''ذہین لوگوں کے لئے میدانوں کی قید نہیں ہوتی۔ وہ جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں، اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔'' کسی دانشور کا یہ قول اس وقت نوک قلم پر آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میرے پیش نظر، نثر اور نظم کے مختلف میدانوں میں یکساں قدرت رکھنے والے اور گلشن شعر و ادب کی ایک طویل عرصے سے آبیاری کرنے والے شاہد جمیل کے دوہوں کا مجموعہ ''موسم کی رفتار'' ہے۔ شاہد جمیل ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے نثر اور نظم کے مختلف میدانوں میں اپنے نقش ثبت کیے ہیں۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ پیش نظر مجموعہ سے پہلے نثر کے میدان میں ان کا مضامین کا مجموعہ ''پس الفاظ'' منظر عام پر آیا تھا اور اسی مجموعہ کے حوالے سے میرا ان سے ادبی تعارف ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نقش بچوں کے ناول کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ جس کا نام تھا'' آدم خور انسان''۔ بعدہٗ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ''سرخ آنکھ'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔

نثر کی طرح نظم (شاعری) کے مختلف میدانوں میں بھی انھوں نے اپنے نقش چھوڑے ہیں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خوابوں کے ہم سائے'' منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد ان کا ماہیے کا مجموعہ ''سوماہیے'' کے نام سے حلیہ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اگلا نقش تھا کہہ مکرنی کا مجموعہ۔ نام ہے ''عکس اندر عکس''۔ دوہوں کے حوالے سے پیش نظر دوہوں کے مجموعہ سے قبل انھوں نے ''دوہا رنگ'' کے نام سے دوہوں کا انتخاب ترتیب دیا جس میں تقریباً ڈھائی سو دوہا نگاروں کے دوہوں کو شامل کیا۔ ان کے اس انتخاب کی ہند و پاک میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اب چوتھے شعری مجموعہ کی شکل میں میرے پیش نظر ان کا دوہے کا مجموعہ ''موسم کی رفتار'' ہے۔ موسم کی رفتار کے ذریعہ بھی انھوں نے ایک نیا نقش بنایا۔ وہ یہ کہ، یہ پہلا دوہے کا مجموعہ ہے جو (منقسم) صوبۂ بہار میں منظر عام پر آیا۔

مندرجہ بالا تمہیدی کلمات کے بعد آیئے، اب ''موسم کی رفتار'' پر کچھ گفتگو ہو جائے۔ دوہے کا یہ مجموعہ جب مجھے موصول ہوا تو اسے دیکھ کر سب سے پہلے ذہن میں یہ سوال گونجا کہ آخر شاہد جمیل کو دوہوں سے دلچسپی کیسے اور کیوں ہوئی؟ لیکن جب میں نے مجموعہ کا مطالعہ کیا تو میرے سوال کا جواب ملا۔ مجموعہ میں

شامل ''دیباچہ'' ہے جس کا عنوان ہے ''دوہے سے میری دلچسپی''۔ اس مضمون میں شاہد جمیل نے دوہوں سے اپنی دلچسپی کا بیان اس طرح کیا ہے کہ ''دوہے سے میری باضابطہ دلچسپی ۱۹۸۷ء کے آس پاس پیدا ہوئی، جب ماہنامہ 'شاعر'، بمبئی کے ایک شمارے میں ندا فاضلی کے دوہے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں دوہے کی صنف، اس کی ہیئت کی تکنیک اور اس کے ذہن و مزاج سے کسی قدر واقفیت ضرور رکھتا تھا... مگر ندا صاحب کے متذکرہ دوہوں کے مطالعہ کے بعد ایک بات تو میرے ذہن میں ضرور صاف ہوگئی کہ دوہے میں قابل ذکر شاعری کے لیے ضروری نہیں کہ روایتی گیان دھیان کے موضوعات یا پند و نصائح کے فلسفے، یا پھر پریت رس یا شرنگار رس کے معاملے ہی نظم کیے جائیں۔'' ''شاعر'' میں شائع شدہ ان دوہوں میں یہ مشہور دوہا بھی شامل تھا:

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی، بن چٹھی بن تار

اس دوہے کا شاہد جمیل پر کیا اثر ہوا۔ اس کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ''یہ دوہا میرے لیے اتنا سریع الاثر ثابت ہوا کہ جیسے یکا یک اس نے میری توجہ کا رخ اس صنف کی جانب پھیر کر رکھ دیا! اب میں رسائل میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر دوہے پڑھ رہا تھا۔ اور جوں جوں پڑھتا گیا، اس کے اسٹرکچر کو لے کر کنفیوژ ہوتا گیا۔''

شاہد جمیل آخر کس وجہ سے کنفیوژ ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ ''میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ہندو پاک میں دوہا نگاروں کے دو طبقے تھے۔ ایک وہ، جو دوہا چھند یعنی قدیم چھند میں دوہے لکھتا تھا، اور دوسرا وہ، جو سرسی چھند کو 'دوہے' کے عنوان سے شائع کرا رہا تھا۔ لیکن ہمارے اہم دوہا نگاروں میں تقریباً سب ہی دوہا چھند لکھتے تھے، جبکہ پاکستانی دوہا نگاروں میں مثلاً احمد ندیم قاسمی یا قتیل شفائی جیسے سینئر لوگوں کو چھوڑ کر زیادہ تر دوہا نگار 'سرسی چھند' کو ہی بطور دوہا اپنائے ہوئے تھے اور وہاں اس دوہے کے سرخیل تھے جمیل الدین عالی۔''

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہد جمیل قدیم دوہا نگاروں کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ ''واقعہ یہ ہے کہ ہمارے قدماء کا کثیر سرمایہ دوہا چھند کی ہیئت میں ہی ہے۔ یعنی مصرعے میں 'وشرام' یا وقفے کا وجود اور اس کے دونوں حصوں (چرنوں) میں ۱۳/اور ۱۱/ ماتراؤں (حرفوں) کا التزام، جبکہ سرسی چھند میں وقفہ یا 'وشرام' ہوتا ہی نہیں، اور مصرعے کے دونوں حصوں میں ۱۶/اور ۱۱/ ماتراؤں کا نظام کام کرتا ہے۔ بہر حال ایک اچھی خاصی تعداد سرسی چھند والے شعراء کی بھی رہی ہے جسے دوہے کے پارکھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ مظفر حنفی نے تو اس رویے کو 'بدعت' تک کہہ ڈالا ہے۔''

دوہے کے اسٹرکچر کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد شاہد جمیل نے اپنی دوہا نگاری کے آغاز کے سلسلے میں بتایا ہے کہ ''میں نے پہلے پہل ۱۹۹۳ء میں کوئی تین درجن دوہے لکھے اور اکثر کو

رسائل میں شائع کرایا۔ میرا یہ دوہا خاصا سراہا گیا اور مجھے پسندیدگی کے خطوط موصول ہوئے:

خط لکھنے کی عادتیں، لے گیا' ڈائل ٹون'
تب آتا تھا ڈاکیہ، اب آتا ہے فون

یہ دوہا 'دوہا چھند' میں ہے۔

پیش نظر مجموعہ کے منظر عام پر آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے شاہد جمیل تحریر کرتے ہیں کہ ''دوہے کے اس مجموعے کا خیال کوئی سولہ سترہ برسوں سے میرے ذہن میں گونجتا رہا ہے۔ ادھر کچھ مہینوں میں ذہنی یکسوئی اور سرشاری نے مجھ سے درجنوں دوہے کہلوائے تو یہ دیرینہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہونچی اور 'موسم کی رفتار' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔''

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں جب میں نے مختلف عنوانات سے مزین سات باب میں منقسم پیش نظر دوہے کے مجموعہ ''موسم کی رفتار'' کا مطالعہ کیا، تو مجھ پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان میں سب سے پہلا تاثر یہ تھا کہ شاہد جمیل نے دوہا چھند میں خوش اسلوبی سے دوہا نگاری کی ہے اور فنی چابک دستی کے جوہر دکھائے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ لفظوں پر ان کی گرفت مضبوط ہے، اس لیے ان کی زبان میں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ شاہد جمیل نے اپنے دوہوں میں اپنے اردگرد کے ماحول کے ساتھ تمام مسائل کا ذکر کیا ہے۔ یعنی انھوں نے اپنے دوہوں میں اپنے عہد کے مزاج کو برقرار رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہد جمیل نے اپنی عادت کے مطابق دوہے کی صنف کو بھی سنجیدگی سے اپنایا ہے اور پورے فنی ریاض کے ساتھ اپنایا ہے۔ اس ریاض کی وجہ سے ان کے دوہوں میں ایک صوتی بہاؤ ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ یہی ان کے دوہوں کی کامیابی ہے۔

اپنے دعویٰ کے ثبوت میں آیئے شاہد جمیل کی دوہا نگاری کے حوالے سے ان کے دوہے کے مجموعہ ''موسم کی رفتار'' میں شامل دوہوں پر نظر ڈالی جائے۔

پیش نظر مجموعہ کے پہلے باب کا عنوان ہے 'حمد'۔ اس باب میں کل سات دوہے ہیں۔ ان حمدیہ دوہوں سے ان کی مذہبی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک، مالک کل کائنات کی حمد وثنا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تو ہے ہر 'محدود' میں، بن کر لا محدود
ہر ایٹم کے خواب میں، 'ملکی وے موجود'
برمودا کا ٹرینگل، 'بلیک ہول' کا راز
اللہ تیرے بھید سب، سب تیرے انداز

وہ گرمی کی شام ہو، یا جاڑے کی بھور
کرن کرن پہ کیا لکھا، تو ہے چاروں اور

اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اسکا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایمانی جذبے کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں ان کی التجا کا انداز دیکھیے:

میری ہر تحریر میں، بھر دی ہے تاثیر
اللہ! ایسے نقش دے، بول اٹھے تصویر

ہر صاحبِ ایمان رب العالمین کے ساتھ رحمت اللعالمین سے محبت و الفت کو ایمان کا جز مانتا ہے۔ شاہد جمیل نے بھی دوسرے باب کا عنوان 'نعت'' رکھا ہے اس باب میں بھی کل سات دوہے ہیں۔ ان دوہوں میں سرکار دو عالمؐ کے فیوض و برکات کا بیان کرنے کے ساتھ ہی اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے:

لمحہ، صدیاں، ازمنہ، نفس نفس سیماب
عکسِ محمدؐ سے ڈھلیں، سب سورج، مہتاب
قرأت اُنؐ کی نعت کی، ہر غم کی دمساز
سرشاری کی رہگزر، معنی اور الفاظ
آقاؐ! مجھ سے دور ہے، نظر کرم کی چھاؤں
آنسو کے انگار پر، جلتے میرے پاؤں!

حمد و نعت کے بعد تیسرے باب کا عنوان ہے ''زمانہ''۔ زمانہ کے عنوان سے شاہد جمیل نے زمانے سے حاصل تجربات، مشاہدات اور حادثات کو دوہوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان دوہوں میں ان تمام مسائل کا ذکر ہے جو ہمارے معاشرے میں ہر طرف موجود ہیں۔ ان دوہوں میں احساس کی شدت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند دوہے پیش ہیں:

مٹی میں تھے کھیلتے، اور کیا کیا تھا گیان!
پہنچے کس اونچائی پر، بہرے ہوگئے کان
ہر رستے پر بھیڑ ہے، ہر رستے پر جام
جتنا اچھا آدمی، اتنے مشکل کام
زور زور سے شور ہے، شور میں کیا کیا زور!
بدمزگی کے ہاتھ میں، تیوہاروں کی دوڑ

ٹی وی پر جو 'سین' ہے، گھر میں وہی ماحول
باہر بھی لاحول ہے، اندر بھی لاحول
شہروں میں قانون کے، جنگل کے سب کام
کیا اچھی جمہوریت! کیا اچھا کہرام!
آگ لگاتا میڈیا، بدل بدل کر بھیس
نیرو والی بانسری، پہنچی اپنے دیس
غالب پڑھ کر اب یہاں، کون بنائے ساکھ؟
'یوٹیوبر' کے فالوور، گھومیں لاکھوں لاکھ
کہاں سے آیا 'فیس بک؟' کلچر کیا امینڈ
بیٹا، بیٹی، باپ سب، اک دوجے کے فرینڈ

چوتھے باب کا عنوان ہے''کرونا کال(۲۰۲۰ء)''۔قارئین کو یاد ہوگا کہ کرونا کی عالمی وبا نے کس طرح پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔اس دور میں انسانی رویوں میں آئی تبدیلی کو سبھی نے محسوس کیا تھا۔مگر شاہد جمیل کچھ زیادہ حساس دل کے مالک ہیں۔انھوں نے جو محسوس کیا،انہیں دوہوں کے قالب میں ڈھال دیا۔اوراس انداز سے کہ ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس کے دل کی بات ہے۔چند دوہے بطور نمونہ حاضر ہیں:

گھر میں سب کو فرصتیں، سب کو الگ خمار
یار 'کرونا کال' میں، ساتوں دن اتوار
ہندو مسلم کون تھا؟، کون تھا سکھ عیسائی؟
'ماسک میاں' نے کر دیا، سب کو بھائی بھائی
ناچ رہا ہے وائرس، آنگن بنی زمین
خوب 'کرونا' بھیج کر، بیٹھ گیا ہے چین
لمبی بندی کاٹ کر، پہنچے ہم بازار
پر کس کو پہچانتے؟ ماسک تھا پہرے دار
دُوری دُوری کھیل کر، ہوگئے اتنی دور
جانے کہاں پر حور تھی، جانے کہاں لنگور

پانچواں باب ہے'ہفت رنگ''۔یہ باب واقعی ہفت رنگ دوہوں سے سجا ہے۔آپ بھی ملاحظہ

فرمائیے یہ ہفت رنگ دوہے:

گرمی سے بدحال تھے، کیا ٹھنڈ سے پیار
وہ لائی بازار سے، موٹے کمبل چار
وہ غزلوں کی شاعری، یہ دوہے کا رنگ
تو کلیوں کے ساتھ ہے، میں ولیوں کے سنگ
کیا کیا دوہے لکھ گئے، کیا کیا کہہ گئے شعر
موتی پایا اک نہیں، کنکر پتھر ڈھیر
تو ظاہر کا شور ہے، میں باطن کا راگ
جتنا تجھ میں جھاگ ہے، اتنی مجھ میں آگ
کڑے کوس کیوں کاٹنا، کھڑے گھاٹ جب دید
یار کا ملنا روز کا، بن رمضان کے عید
سڑکوں پر بھی جام تھا، ہاتھوں میں بھی جام
ان کی اور ہی شام تھی، اپنی اور ہی شام

چھٹے باب کا عنوان ہے ''بچوں کے دوہے''۔ بچوں کے لیے کچھ لکھنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک تخلیق کار کو بچوں کے خواب، عادات واطوار، حرکات وسکنات کا مکمل علم نہ ہو، اور تخلیق کار خود بچہ بن کر اس پر غور نہ کرے۔ شاہد جمیل نے بچوں کے دوہے میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان کا معیار بچوں کی استعداد کے مطابق ہو۔ چند دوہے بطور نمونہ پیش ہیں:

مجھے بلا کر باغ میں، کان میں بولا پھول
پڑھنے لکھنے کے لیے، جانا ہے اسکول
باہر جاکر گھومنا، پاپا کی اسکیم
لیکن ہم کو دیکھنا، گھر پر 'چھوٹا بھیم'
زو میں دیکھا زیبرا، بندر اک شیطان
پیٹھ پر اس کی بیٹھ کر، کھینچ رہا تھا کان
ہم جائیں بازار تو، کیا کیا موج اڑائیں
مومو، برگر، چاؤمن، سب کچھ جم کر کھائیں

سڑک کے نیچے میٹرو، سڑک کے اوپر ٹرام
دونوں کی رفتار کا، کلکتہ ہے نام

ساتویں اور آخری باب کا عنوان ہے ''کچھ پرانے دوہے (۲۰۰۰ء سے قبل لکھے گئے)''۔ آیئے اس باب سے بھی چند دوہوں پر نظر ڈالی جائے تا کہ موسم کا سفر ماضی تا حال مکمل ہو سکے:

شبنم تکیے پر گری، بستر پر انگار
بھیگی بھیگی رات نے، پھونک دیا سنسار

جھیل، شکارے، وادیاں : دھواں دھواں تصویر
گولی، وردی، بوٹ میں، آ ڈھونڈیں کشمیر

بن آنسو، بن درد کے، یادوں کا انبار
کمپیوٹر کے سامنے، سازِ دل بیکار

دل جیسے اک چاند کے، ٹکڑے کیے ہزار
اب کے اس کو بھیجنا، یہ تاروں کا ہار

رضیہ موتی رولتی، رادھا کھیلے دھول
جس کی جتنی اوڑھنی ، اتنے اس کے پھول

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ شاہد جمیل کے دوہے زندگی سے قریب تر اور شعریت سے بھرپور ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندی تہذیب کی آغوش میں پلنے والی صنف دوہا میں شاہد جمیل نے ہندی لفظیات کا بہت کم استعمال کیا ہے۔ زیادہ تر اردو اور اس کے بعد انگریزی لفظیات کو اپنایا ہے۔ یعنی انھوں نے روش عام سے ہٹ کر دوہوں میں اپنی راہ بنائی ہے۔ ان کا یہ رویہ لائق تقلید بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔ لہٰذا وہ ہماری تبریک کے مستحق ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

Danish Mahal
Amin Abad
Lucknow 226018 UP
Mob: 94524-82159
manzoorparwana7673@gmail.com

● سلیم انصاری

اقبال حسن آزاد کے افسانوں کا تخلیقی نظام

''قطرہ قطرہ احساس''، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے افسانوں کا اولین مجموعہ ہے جو ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آیا تھا، اس مجموعے میں ان کے ۱۶ افسانے شامل کیے گئے تھے، اس کے علاوہ ان کے دو اور افسانوی مجموعے'' مردم گزیدہ'' (۲۰۰۵) اور'' پورٹریٹ'' (۲۰۱۷) اشاعت پذیر ہو کر سنجیدہ ناقدینِ ادب کی توجہ حاصل کر چکے ہیں۔ کچھ نئے افسانوں کی شمولیت کے ساتھ'' قطرہ قطرہ احساس'' کی دوبارہ اشاعت ۲۰۲۴ میں عمل میں آئی جس میں ان کے کل ۳۰ افسانے شامل ہیں۔ افسانہ نگار کے مطابق اس افسانوی مجموعے کی از سرِ نو اشاعت کا مقصد محض پہلے ایڈیشن کا ختم ہو جانا نہیں ہے بلکہ فکشن پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ اور طالبات کی ضرورتوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ۲۰۱۴ میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی ایک تحقیقی کتاب بھی ''نثری اصنافِ ادب اور طنز و مزاح کی روایت'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آ چکی ہے جس میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ اردو کی تقریباً تمام تر نثری اصناف میں طنز و مزاح کی روایت اور موجودہ صورتِ حال زیرِ بحث آ جائیں۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ۱۹۷۷ء سے ہی افسانے لکھ رہے ہیں اور اب بھی اپنے تخلیقی سفر میں سرگرم ہیں۔ میرے نزدیک ۱۹۸۰ کے آس پاس اپنا ادبی سفر شروع کرنے والے فکشن نگاروں میں ان کا نام نمایاں طور پر خصوصیت کا حامل ہے۔ اس حقیقت سے عدم اتفاق کی کوئی وجہ نہیں کہ ۱۹۸۰ کے آس پاس ادب میں جدیدیت کی تحریک شدت اختیار کر چکی تھی یعنی ترقی پسند تحریک سے انحراف کے نتیجے میں اظہار اور اسلوب کے علاوہ فکر کی سطح پر بھی ایک طرح کی پیچیدگی بلکہ لایعنیت کی حمایت میں ایک پوری ادبی نسل کھڑی نظر آتی تھی۔ رسائل و جرائد میں شایع ہونے والے نثری اور شعری فن پاروں میں بھی مہمل استعارات اور مبہم علامات کے استعمال کا چلن بڑھ گیا تھا، جس کے سبب سنجیدہ قارئین کا رشتہ ادبی فن پاروں کے مطالعے سے کٹ کر رہ گیا تھا اور ریڈر شپ کی سطح پر ایک طرح کا بحران پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے دھند آلود اور غیر یقینی صورتِ حال میں بھی جن چند فکشن نگاروں نے اپنی سادگی اور بیانیہ اسلوب کی حفاظت کی

ان میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے افسانوں پر گفتگو سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان کے یہاں جو خصوصیت مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ ان کے افسانوں کا اختصار ہے۔ان کے زیادہ تر افسانے دو یا تین صفحے میں ہی مکمل ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ، وہ افسانے کے مرکزی خیال پر ہی فوکسڈ (focussed) رہتے ہیں۔ان کا اسلوب بیانیہ ہے مگر غیر ضروری جزیات نگاری اور کردار نگاری سے اپنی کہانی کو محفوظ رکھنے میں وہ کامیاب ٹھہرتے ہیں۔''قطرہ قطرہ احساس'' کے تیس افسانوں میں کہیں بھی موضوع کے دہراؤ کا احساس نہیں ہوتا۔ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ان کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ''تاریخ ادب اردو'' میں تحریر کیا ہے کہ اقبال حسن آزاد کے یہاں انسانی زندگی اور اس کی پیچیدگیاں موضوع رہی ہیں۔یہ بات سچ ہے کہ انسانی زندگی کا مطالعہ اپنے آپ میں ہی ایک انتہائی وسیع سبجیکٹ ہے، جس میں فرد اور معاشرے کے درمیان بنتے بگڑتے رشتوں اور انسان کی نفسیات کا مطالعہ بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں تہذیبی قدروں کے زوال کا نوحہ ہی نہیں بلکہ گمشدہ تہذیبی قدروں کے نشانات کی تلاش کا عمل بھی شدید ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ان کے یہاں کہیں کہیں جدیدیت کے اثرات کے غلبے کی نشاندہی کی ہے۔یہ بات موضوعات کی حد تک تو تسلیم کی جاسکتی ہے مگر اسلوب اور طرزِ اظہار میں وہ بالکل فطری اور روایتی انداز کے افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ

> ''اقبال حسن آزاد نے نہ تو جدیدیت، نہ مابعد جدیدیت اور نہ کسی اور رجحان کو اپنا آئیڈیل بنایا بلکہ خود جو محسوس کیا وہی لکھا اور اپنے آس پاس کے کرداروں کا ظاہر اور اندرون پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔''

شاید اسی لئے اقبال واجد نے بھی ان کے بارے میں کم و بیش یہی رائے قائم کی ہے کہ اقبال حسن آزاد اپنے ہم عصروں سے ان معنی میں مختلف ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہر طرح کی شدت پسندی سے گریز کیا ہے اور ہمارے سامنے معاشرے کی ناہمواریوں کو پیش کیا ہے۔میرے نزدیک اقبال حسن آزاد کے یہاں تخلیقی فکر کا کینوس وسیع ہے، وہ عام آدمی کے مسائل و مصائب، غریبی، نا آسودگی، محرومی، مایوسی، بے یقینی، چھوا چھوت اور کرپشن جیسے سامنے کے موضوعات کو بڑے مؤثر انداز میں برتنے کا تخلیقی ہنر جانتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ وہ کہیں کہیں پریم چند کی روایت کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر افسانوی مجموعے قطرہ قطرہ احساس میں ان کا ایک شاہکار افسانہ ٹھاکر کا کنواں، پریم چند

سے معذرت کے ساتھ شامل ہے۔ جسے پریم چند کے افسانے کی توسیع کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ پریم چند نے اپنی کہانی میں طبقاتی کشمکش اور ہریجنوں سے چھوا چھوت کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ مگر اقبال حسن آزاد نے پریم چند کی کہانی کو نہ صرف آگے بڑھانے کا کام کیا ہے بلکہ اسے نئی معنوی دشاؤں میں منعکس بھی کیا ہے۔ یوں تو ان کا یہ افسانہ بھی لینتھ کے اعتبار سے دو ڈھائی صفحات پر ہی محیط ہے مگر اس افسانے کے مرکزی خیال میں گاؤں کے عام غریب لوگوں کے مسائل کو نہایت عمدگی سے ڈسکس کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں ٹھاکر کا سوکھا ہوا کنواں ہی راوی اور واحد متکلم ہے اور گاؤں کے گزشتہ اور موجودہ حالات کا چشم دید بھی، اس کے مطابق

۱۔ میرے ہی پانی سے پنڈت جی صبح صبح اشنان کیا کرتے تھے اور اشلوک پڑھتے ہوئے آتی جاتی عورتوں کو تاکا کرتے تھے۔

۲۔ میری ہی کوکھ سے پانی کھینچنے کے جرم میں ایک ہریجن عورت کے پیچھے پورا گاؤں پڑ گیا تھا۔

۳۔ گاؤں کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے، فیملی پلاننگ والے آتے ہیں اور بچوں کی باڑھ کو روکنے کی ناکام کوشش کر کے چلے جاتے ہیں۔

۴۔ گاؤں میں جگہ جگہ جوئے بازی ہوتی ہے مگر تھانیدار پولس چوکی کے آگے کھاٹ بچھا کر سپاہیوں سے ٹانگیں دبواتا ہے۔

۵۔ جگہ جگہ بورنگ ویل بن چکے ہیں، مگر یہ بورنگ ویل تو بے جان ہیں۔ ان میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لئے بجلی کی ضرورت ہوتی ہے اور بجلی دن رات آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ اس کے آنے اور جانے کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ کبھی دن دن بھر غائب رہتی ہے۔

۶۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کا ٹرانسفارمر خراب ہو گیا ہے۔ ایک ہفتے بعد بجلی کے کارکن آئے اور ٹرانسفارمر کھول کر لے گئے۔

۷۔ آسمان بادلوں سے خالی، اخباروں میں سوکھے کی خبریں آنے لگیں۔

۸۔ گاؤں کے ایک ایک کر کے سارے ٹیوب ویل خراب ہو گئے، لوگ پانی کو ترسنے لگے۔

۹۔ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ان پچاس برسوں میں اس گاؤں نے کیا ترقی کی۔ بے جان بجلی کے کھمبے اور ان پر لٹکی ہوئی ننگی تاریں۔ جگہ جگہ زمین کے سینے پر اگ آئے ٹیوب ویل، جنہیں چلانے پر صرف ہوا نکلتی ہے، میں سوچ رہا ہوں۔

اس مختصر افسانے میں اقبال حسن آزاد نے ایک سوکھے ہوئے کنوئیں کی زبانی جہاں ایک طرف

گاؤں میں پھیلی ہوئی سماجی، سیاسی اور اخلاقی برائیوں کی نشاندہی کی ہے وہیں سرکاری محکموں میں ہونے والے کرپشن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ گاؤں میں بجلی، پانی اور سڑک جیسی سہولیات تو مہیا کرادی گئی ہیں مگر سوکھے ہوئے ٹیوب ویل، بجلی کی فراہمی میں غیر یقینی صورتِ حال اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے سوکھے کی خبروں کے بیچ کنوئیں کی یہ خواہش کہ کاش میں آج بھی پانی سے بھرا ہوتا تو کم از کم پنڈت جی کو اشنان کرنے کے لئے اور اعلیٰ جاتی کے لوگوں کے لئے پینے کے لئے پانی تو فراہم کرسکتا۔ افسانے کے اس جملے میں اثبات کا عکس تو دکھائی دیتا ہے مگر افسانہ نگار اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھانے میں کامیاب نظر آتا ہے کہ کئی دن بیت چکے ہیں نہ تو پانی کا ٹینکر ہی دوبارہ آیا ہے اور نہ ہی ٹرانسفارمر درست ہوا ہے، ٹیوب ویل اب تک بیکار پڑے ہیں۔ یہاں ایک بار پھر ہمیں پریم چند کی یاد آتی ہے کیونکہ ان حالات میں گاؤں کے لوگ دوبارہ نالے کا گندا پانی استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسن کا یہ افسانہ ایک بڑے کینوس کا افسانہ ہے جو نام نہاد اور مصنوعی طور پر ترقی یافتہ گاؤں کی زبوں حالی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

قطرہ قطرہ احساس کے تقریباً تمام افسانوں میں، اقبال حسن آزاد کے مشاہدات اور تجربات کا عکس صاف طور پر جھلکتا ہے، شاید اسی لئے غضنفر نے ان کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سادگی، صداقت اور خلوص جیسی صفات ان کی تمام تر کہانیوں میں موجود ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل افسانوں کے سنجیدہ مطالعے سے مجھے یہ انکشاف ہوا ہے کہ ان کے یہاں زورِ تخیل نہیں بلکہ حقیقت نگاری کے عناصر غالب ہیں جو ان کے افسانوں کی تخلیق میں Driving Force کا کام کرتے ہیں۔ جنریشن گیپ، رشتوں کی ناقدری، سیاسی، سماجی اور اخلاقی قدروں کی پامالی، تہذیب کا انحطاط اور زندگی کی ناہمواریاں وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے افسانوں میں کمالِ ہنرمندی کے ساتھ برتے گئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کا پہلا افسانہ قطرہ قطرہ احساس کا مرکزی خیال ایک ایسے بوڑھے شخص کے اردگرد گھومتا ہے، جو اپنی تنہائی اور بے بسی کے لمحات سے نبرد آزما ہے کیونکہ اس کے بیٹے اور بہو روشن مستقبل کی تلاش میں غیر ملک میں جا کر بس گئے ہیں، اب ان کے پاس تنہائی اور بہت سارا فاضل وقت ہے جو ان کی بے ضرورت اور بے کارکی مصروفیات کے باوجود نہیں گزرتا ہے۔ شاید اسی لئے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آج کل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ ایک بوڑھے اور بیکار شخص سے گفتگو کرے۔ آگہی میں ایک ایسی بہن کا کردار تراشا گیا ہے جس کے پاس بہت ساری دولت اور عیش وعشرت کا سارا سامان موجود ہے۔ اور جو اپنی معمولی اور غریب بہن کے لڑکے بابو کو اپنے پاس رکھ لیتی، بظاہر یہ احسان کا معاملہ لگتا ہے مگر بابو سے نوکروں

جیسا سلوک کرنے والی بہن سخت مزاج اور متکبر بھی ہے۔ایک دن جب بابو کی ماں یہ سب دیکھتی ہے تو اپنے لڑکے کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرتی ہے مگر بابو جانے کے لئے تیار نہیں، وہ اپنی ماں سے جھوٹ بولتا ہے کہ اسے اپنی خالہ کے یہاں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی ماں اور اپنے گھر کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔اچانک اس کی ماں کو لگتا ہے کہ اس کا بیٹا بابو بڑا اور سمجھدار ہوگیا ہے۔اس طرح سگے رشتوں کی پامالی اور ناقدری کو یہ افسانہ بڑی خوبصورتی سے بیان کرنے میں کامیاب ہے۔

لامکاں ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی ہے جس کے پاس دو کمرے ہیں جن کی آرائش اور زیبائش بڑے سلیقے سے کی گئی ہے، گھر میں ضرورت کی ہر چیز ہے اور ان سب کے لئے مناسب جگہ بھی مقرر کردی گئی ہے مگر مقدس مذہبی کتاب کو رکھنے کے لئے ان کمروں میں کوئی جگہ نہیں ہے، آخر کار اس مسئلے کے حل کے لئے عورت مشورہ دیتی ہے کہ اسے مسجد میں رکھوا دیا جائے تاکہ اس کتاب کی بے حرمتی نہ ہو۔اس افسانے کے مرکزی تھیم سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فیشن گزیدگی، ایمان کی کمزوری اور مصنوعی ترقی کے اس دور میں مذہب بیزاری کی وبا عورتوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔وہیں گھروندے میں مرکزی خیال یہ ہے کہ کرایے کے گھر میں زندگی گزارنے والے بے شمار لوگوں کے لئے گھر ایک خواب ہی رہ جاتا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔

کارِ جہاں دراز ہے میں افسانہ نگار نے انسانی تہذیب کے تسلسل بلکہ ٹکراؤ اور تصادم کو نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ان کے مطابق انسان نے بستیاں بسائیں، جنگیں لڑیں۔ہار جیت ہوتی رہی۔ انسان کا وحشی پن دھیرے دھیرے اس سے جدا ہوتا رہا۔مگر نہیں یہ صرف ایک خول تھا اور جب کبھی ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ یہ خول توڑ کر باہر آجاتا ہے۔میرے نزدیک وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تہذیبوں کے سفر میں انسان کے اندر کا حیوان بدستور زندہ ہے، اس کی جبلت میں درندگی اب بھی قائم ہے۔انسان اب بھی بھوک اور افلاس سے مرتا ہے، اجتماعی اور انفرادی موت ایک انتظار کی صورت انسانیت کا منھ چڑا رہی ہے۔اجتماعی موت کبھی تقسیم کی صورت رونما ہوتی ہے، کبھی بنگلہ دیش، کبھی ایران عراق اور افغانستان اور فلسطین کو اپنا گہوارہ بناتی ہے اور کبھی خالصتان اور آزاد کشمیر کا نام اپناتی ہے۔دراصل یہ سارے سوال ایک حساس انسان کے لئے گمبھیر سروکار رکھتے ہیں۔افسانہ نگار اس کہانی کے بطن میں اپنی سیاسی اور سماجی بصیرت کی تلاش کرتا ہے۔اس طرح کارِ جہاں دراز ہے ایک ایسا افسانہ ہے جس کا کینوس وسیع ہے اور اس کے مرکز میں صرف اور صرف انسان ہے۔اس افسانے کا ایک جملہ کہ انسان کے پیٹ میں جو جنگ جاری ہے اس کے لئے کوئی یو۔این۔او، قائم نہیں ہوتا بے حد معنی خیز ہے اور کسی بھی حساس اور دردمند انسان کو اندر تک

جھنجھوڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔

کھوئے ہوئے سال میں اقبال حسن آزاد نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ یادیں کبھی نہیں مرتیں، بوڑھی ہوکر بھی نہیں۔ ندی کے کنارے ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت جوانی میں کیے گئے پیار کو یاد کرتے ہوئے اپنی زندگی کا حساب لگاتے ہیں۔ عورت گاڑی، بنگلہ، زیورات اور دولت حاصل کرنے کے لئے کسی دوسرے مرد سے شادی کرلیتی ہے جب کہ مرد آسائشیں حاصل کرنے اور دولت کمانے کی دوڑ میں اپنی شادی سے محروم رہ جاتا ہے۔ دونوں کی محرومی مختلف نوعیت کی ہے جس کی بھرپائی اب عمر کے اس پراؤ پر کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔

میری ناقص رائے میں قطرہ قطرہ احساس میں شامل افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال حسن کی تخلیقی سوچ متنوع ہے۔ جسے انہوں نے اپنے افسانوں میں نہایت خوش سلیقگی سے برتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ان کے افسانے لینتھ کے اعتبار سے مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر معنوی سطح پر وسعت رکھتے ہیں۔ غیر ضروری جملوں اور مکالموں سے گریز اور مرکزی خیال کی ترسیل میں مہارت ہی ان کی خصوصیات ہیں۔ یہاں طوالت کے خوف سے ہر ایک افسانے کے تجزیاتی مطالعے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مجموعی رائے پیش کرتے ہوئے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ موجودہ عہد کے ایک قابلِ ذکر اور اہم افسانہ نگار ہیں۔

◄◄ ● ►►

HIG-3 Anand nagar
Adhartal Jabalpur (M.P) 482004
Mob- 7070135643

اقبال حسن آزاد کا
تیسرا افسانوی مجموعہ
پورٹریٹ
(۲۰۱۷ء)

● نسترن احسن فتیحی

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد......ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے ادبی تنقید،افسانہ نگاری،شاعری،ادبی جریدے کی ادارت کے علاوہ تدریس اور تدوین کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ان میں سے ہر ایک شعبے میں ان کی خدمات ادب کی گہری سمجھ،تعلیم سے ان کی وابستگی،اور ادبی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے ان کے جذبے کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک مبصر کے طور پر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی تحریریں ان کی گہری تجزیاتی صلاحیتوں اور ادبی کاموں کے گہرے معانی اور سیاق وسباق کو تلاش کرنے کی ان کی صلاحیت سے نشان زد ہے۔وہ تنقید کو محض ادب کا جائزہ لینے کے ایک طریقہ کار کے طور پر نہیں بلکہ سماجی، ثقافتی، تاریخی اور فلسفیانہ بنیادوں کو تلاش کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ان کے تبصرے اکثر ادبی تخلیقات کے وسیع تر مضمرات کو روشن کرتی ہیں، اور ایسے روابط بناتی ہیں جو قارئین اور اسکالرز کو یکساں طور پر نئی جہتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر آزاد کے تنقید اور تبصرے ان کی وضاحت، گہرائی اور بصیرت انگیز تناظر کے لیے مشہور ہیں، جو مختلف ادبی روایات کی تفہیم اور تعریف میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد اردو ادب کے پارکھ کی حیثیت سے ہمیشہ بے باک رہے ہیں۔سوشل نیٹ ورک پر ان کے تبصرے زندگی کی بے قاعدگیوں کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ادب میں حقیقت بیانی اور سچائی کو کس حد تک ترجیح دی جانی چاہئے یہ ان کی بے باکانہ رائے سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ دوستی، رشتہ داری، مروت اور مراسم کو کبھی بھی اپنی ان ادبی خدمات میں حائل نہیں ہونے دیتے ہیں۔ساتھ ہی دوسروں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ بے جا تعریف وتوصیف سے بچتے ہوئے غیر جانب داری سے ادبی متون کو پرکھا جائے تا کہ ادب اور ادیب کا تعین قدر صحیح اور سچائی پر مبنی ہو۔مندرجہ ذیل تبصرہ ان کی بے باکی اور صاف گوئی کا غماز ہے اور وہ صرف نوآمیز لکھنے والوں کے لئے ہی نہیں ہوتی وہ کہنہ مشق ادیبوں کی کمیوں اور کوتاہیوں پر بھی اسی صاف گوئی سے تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

• جب کسی نومشق لکھاری کو اس کی صلاحیت سے زیادہ اہمیت دی جانے لگتی ہے تو اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ (اقبال حسن آزاد)

• پی ڈی ایف موصول ہوئی شکریہ۔ تجسس کے سبب کچھ افسانے پڑھے بلکہ زہر مار کئے۔ واقعی ''یوا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ'' مذاق بن کر سامنے آیا ہے ''اسٹیپنی'' کے سارے افسانے پڑھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ پہلا افسانہ پڑھا دوسرا بھی دل پر جبر کرکے پڑھا تیسرا اس امید پر پڑھا شاید کچھ بہتر سامنے آئے چوتھا افسانہ چھوڑ پانچواں پڑھنا شروع کیا لیکن ادھورا ہی چھوڑنا پڑا اللہ رحم کرے اب یہ دن بھی دیکھنا پڑینگے۔ ایسی بات نہیں کہ نوجوان اچھے افسانے نہیں لکھ رہے نامعلوم اس کتاب کو انعام سے نوازنے کے پیچھے کیا عوامل رہے ہوں گے یا جیوری کو اس میں کیا خوبی نظر آئی ہو سکتا ہے جیوری کسی دباؤ میں ہو ہاں اتنا ضرور ہے اگر ایسی کتابوں پر انعامات دیے جانے لگے تو ساہتیہ اکادمی انعام کی اس سے بڑی بے وقعتی اور نہیں ہو سکتی اس سے بہتر ہوتا کہ اس برس انعام نہ دے کر یہ اعلان کردیا جاتا ''اس برس کوئی کتاب انعام کے معیار پر کھری نہیں اتری'' اس سے ایک فائدہ ہوتا آئندہ نوجوان نسل مزید محنت کرتی ساتھ ہی اسے خود کا محاسبہ کرنے کا موقع بھی ملتا افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے اس کتاب پر انعام ملنے کا مطلب نئی نسل کی راہیں مسدود کرنے آگے بڑھنے اور اچھا لکھنے کی چاہ ختم کرنا ہے۔''

ثالث میں ان کے اداریے زندگی اور ادب کے بارے میں ان کی سمجھ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی بے باکی زندگی کی غیر اطمینان بخش سچائیوں کا سامنا کرنے یا ادبی دنیا اور معاشرے کے اندر موجود خامیوں کو بے نقاب کرنے سے کترانے پر مجبور نہیں کرتی ہے۔ ان کی تنقید اکثر قائم شدہ اصولوں کو چیلنج کرتی ہے اور سوچ سمجھ کر گفتگو کو اکساتی ہے، اور قارئین کو سوال کرنے اور ان کے مفروضوں پر نظر ثانی کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ جرات مندانہ نقطہ نظر نہ صرف سوشل نیٹ ورک پر نظر آتا ہے بلکہ ان کی اجتماعی تنقیدی بصیرت میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور اردو ادب میں تنقیدی مشغولیت اور فکری ایمانداری کے کلچر کو بھی فروغ دیتا ہے۔ سوشل نیٹ ورکس پر، ڈاکٹر آزاد مختلف سماجی بے ضابطگیوں پر روشنی ڈالنے کے لیے اپنا پلیٹ فارم استعمال کرتے ہیں۔ ان کی پوسٹس اور تبصرے ثقافتی منافقت سے لے کر سیاسی بدعنوانی تک کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، جو انسانی معاشروں میں موجود پیچیدگیوں اور تضادات کے بارے میں گہری آگاہی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنے تیز مشاہدات کے ذریعے، ڈاکٹر آزاد زندگی کے اکثر نظر انداز کیے جانے والے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں، اور اپنے سامعین کو ان بے ضابطگیوں کا مقابلہ کرنے اور ان سے نمٹنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ادبی تنقید کو سماجی تبصرے کے ساتھ جوڑنے کی ان کی صلاحیت معاشرے کے آئینہ کے

طور پر ادب کی مطابقت اور طاقت کو واضح کرتی ہے۔ ثالث کے ایڈیٹر کے طور پر، ڈاکٹر آزاد کے اداریے زندگی اور ادب کے بارے میں ان کی جامع تفہیم کا ثبوت ہیں۔

ثالث کے ایڈیٹر کے طور پر اپنے کردار میں، ڈاکٹر آزاد نے ایک ایسے پلیٹ فارم کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے جو متنوع آوازوں اور نقطہ نظر کو فروغ دیتا ہے۔ ان کا ادارتی نقطہ نظر جامعیت اور ثقافتی بیانیے کی وسیع رینج کی نمائندگی کرنے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ ان کی قیادت میں، ثالث ایک قابل احترام جریدہ بن گیا ہے جو اعلیٰ معیار کی ادبی اور ثقافتی تخلیقات شائع کرتا ہے، اور اسکالرز، ادیبوں اور قارئین کے درمیان مکالمے اور تبادلے کو فروغ دیتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا ادارتی کام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جریدہ اپنے علمی اور ادبی معیار کو برقرار رکھے اور پرکشش بھی نظر آئے، اس طرح علمی گفتگو اور وسیع تر ادبی برادری کے درمیان خلیج کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔

یہ اداریے محض جریدے کے مواد کا تعارف نہیں ہیں بلکہ عکاس مضامین ہیں جو ادبی کاموں اور وسیع تر سماجی و ثقافتی تناظر کے درمیان تعامل کو تلاش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آزاد کے اداریے اکثر جریدے میں دریافت کیے گئے موضوعات اور عصری مسائل کے درمیان ربط پیدا کرتے ہیں جس سے قارئین کو ادبی متون اور فنکار دونوں کے بارے میں قاری کو ایک بھر پور تفہیم فراہم کی جاتی ہے۔ ''ثالث'' کے اداریے میں ایڈیٹر اقبال حسن آزاد نے غضنفر سے شناسائی اور رسم و راہ کا تذکرہ خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

میری غضنفر صاحب سے پہلی ملاقات غالباً دو ہزار سولہ میں ہوئی جب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اپنی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ میرے ساتھ سلمان عبدالصمد تھے۔ اس موقع پر انھوں نے مجھے اپنی مثنوی کی کتاب ''کرب جاں'' عنایت فرمائی۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ''غضنفر'' صاحب استاد اور ادیب دونوں حیثیتوں سے مالا مال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم اور عزت و شہرت سے بہت نوازا ہے۔

اپنے اداریے میں، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد متنوع آوازوں اور نقطہ نظر کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ثالث مضبوط اور جامع ادبی گفتگو کے لیے ایک پلیٹ فارم ہے۔ ان کے اداریے جریدے کی پیشکش کے ذریعے قارئین کی رہنمائی کرتے ہیں، اہم بصیرت کو اجاگر کرتے ہیں اور متن کے ساتھ تنقیدی مشغولیت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر نہ صرف قاری کے تجربے کو بڑھاتا ہے بلکہ جریدے کے مجموعی معیار اور اثر کو بھی بلند کرتا ہے۔

زندگی اور ادب کے بارے میں ڈاکٹر آزاد کی گہری تفہیم پیچیدہ موضوعات کو عبور (نیویگیٹ) کرنے اور انہیں اس انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت سے عیاں ہے جو قابل رسائی اور فکر انگیز بھی ہے۔ ان کے تنقیدی

اداریے اکثر ایک باریک نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں جو ادبی تخلیق کی تفہیم اور اس کے زندہ تجربات کی تعریف کے ساتھ علمی تجزیہ کو متوازن کرتا ہے۔ یہ دوہری توجہ ڈاکٹر آزاد کو ایسی بصیرتیں پیش کرنے کے قابل بناتی ہے جو فکری اور جذباتی دونوں سطحوں پر ہے، اور جس سے ادب کی قارئین کی فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔

بحیثیت مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا کردار خاص طور پر اردو ادب کے دائرے میں ان کی جرآت مندانہ اور بے باک طبیعت سے نمایاں ہے۔ سوشل نیٹ ورکس پر ان کے تبصرے اور ثالث میں ان کے اداریے معاشرتی بے ضابطگیوں کو بے نقاب کرنے اور زندگی اور ادب کے بارے میں گہری تفہیم کی عکاسی کرنے کی ان کی صلاحیت کی مثال ہیں۔ اپنے بے خوف تنقیدی اور بصیرت افروز اداریوں کے ذریعے ڈاکٹر آزاد نہ صرف ادبی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ تنقیدی سوچ اور سماجی بیداری کے کلچر کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ ان کی شراکتیں ادب کی تبدیلی کی صلاحیت اور دنیا کے بارے میں ہماری سمجھ کو تشکیل دینے اور چیلنج کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

ایک افسانہ نگار کے طور پر، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے ایسی کہانیوں کو بُننے کی ایک قابل ذکر صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے جو دل چسپ اور فکر انگیز ہے۔ ان کی کہانیاں اکثر انسانی تجربے کی پیچیدگیوں کی عکاسی کرتی ہیں، جذبات اور رشتوں کی باریکیوں کو گہری نظر سے پرکھتی ہیں۔ ان کا بیانیہ انداز جزیات نگاری، کرداروں اور پلاٹوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہ ان کی تحریر کی خصوصیت ہے جو اکثر گہرے اخلاقی یا فلسفیانہ سوالات اٹھاتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیں۔

> ''آبادی سے تھوڑی دور ہٹ کر جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اسے گھنے جنگلوں سے خوف آتا۔ رام دین مالی کا لڑکا جو اس سے عمر میں چند سال بڑا تھا اسے لے کر جنگل کی سمت نکل جاتا۔ جہاں تک جنگل چھدرا رہتا اور سورج کی روشنی دکھائی دیتی اسے بڑا لطف آتا مگر جیسے ہی اندھیرا سروں پر چھانے لگتا وہ گھبرا کر کہتا۔
>
> ''سکھو! اب گھر چلو۔'' سکھو کو اس کی گھبراہٹ پر ہنسی آجاتی۔ وہ اور اندر جانا چاہتا مگر صاحب کے ڈر سے لوٹ جاتا۔ گذرتے وقت کی دھند ہر شے پر چھاتی جا رہی تھی۔ یادیں مٹ میلی ہو گئی تھیں۔ اسے لگتا جیسے درخت بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے تنے کھوکھلے ہو گئے ہیں اور وہ کسی تیز آندھی کے منتظر ہیں۔''
>
> (افسانوی مجموعہ۔ پوٹریٹ: صفحہ۔ ۸۱)

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی کہانیاں صرف تفریح کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ انسانی حالت، معاشرتی اصولوں اور عصری زندگی کے بے شمار چیلنجوں کی عکاسی کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوی

سفر کا آغاز ۱۹۷۴ میں افسانہ ''منزل سراب کی'' سے کیا ہے لیکن ادبی حلقوں میں جس افسانے کی بدولت انہیں شہرت حاصل ہوئی وہ افسانہ ''انقلاب'' ہے جو ۱۹۷۷ء میں رسالہ ''شمع'' دہلی سے شائع ہوا۔اس طرح اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' (۱۹۸۷) ''مردم گزیدہ'' (۲۰۰۵) اور ''پورٹریٹ'' (۲۰۱۷) منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے ''پورٹریٹ'' کے ایک افسانہ بہ عنوان پورٹریٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے علی رفاد فتیحی کہتے ہیں۔

> ''اقبال حسن آزاد پوٹریٹ میں استدلال کرتے نظر آتے ہیں کہ پرانی یادوں کا مقصد کسی کے ماضی کی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ اعتراف ہے کہ یہ ماضی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص یادوں کے سہارے اپنے بچپن میں واپس نہیں آسکتا۔اس طرح پرانی یادوں کو ان ناخوشگوار حقیقتوں سے بچنے کی ایک مایوس کن کوشش کے طور پر وقت کی ناقابل واپسی نوعیت (یہ حقیقت کہ ماضی ماضی ہے) اور موت کے ناگزیر امکان دونوں کے ردعمل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔
> (بیانیات اور بیانوی ساخت:عصری فکشن کے حوالے سے صفحہ نمبر ۲۹۵)

اقبال حسن آزاد بطور شاعر

اقبال حسن آزاد بطور شاعر اردو ادب کی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں فکری گہرائی،سادگی،اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں،معاشرتی مسائل،اور انسانی جذبات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

اقبال حسن آزاد کی شاعری میں فکری گہرائی کا عنصر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان کے اشعار میں نہ صرف سطحی معنی بلکہ گہرے فلسفیانہ اور فکری مضامین بھی ملتے ہیں۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے قاری کو زندگی کی حقیقتوں اور انسانی رویوں کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ان کے اشعار میں پیچیدگی نہیں ہوتی، بلکہ وہ سادہ الفاظ میں گہرے مفاہیم پیش کرتے ہیں۔اس سادگی کی وجہ سے ان کی شاعری قاری کے دل میں فوراً اتر جاتی ہے۔

اقبال حسن آزاد کی شاعری میں انسانیت اور اخلاقی قدروں کا بہت ذکر ملتا ہے۔وہ اپنے اشعار کے ذریعے محبت، بھائی چارہ،اور انسانی ہمدردی کی تلقین کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں ہمیں انسانی زندگی کی خوبصورتی اور اس کی ناپائداری کا احساس ہوتا ہے۔

اقبال حسن آزاد کی شاعری میں معاشرتی مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے معاشرتی ناہمواری، ظلم وستم، اور دیگر مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری سماجی اصلاح کی جانب ایک قدم ہے، جو قاری کو سوچنے اور عمل کرنے پر اکساتا ہے۔ مثلاً:

حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے   مجھے لوگوں نے پہچانا نہیں ہے
کسی کو اس کے ظاہر سے نہ تولیں   پرکھنے کا یہ پیمانہ نہیں ہے
اگرچہ وہ سدا رہتا ہے گم سم   مگر لوگو! وہ دیوانہ نہیں ہے
یہ دنیا وہ جوا خانہ ہے جس میں   فقط کھونا ہے کچھ پانا نہیں ہے
جو دل میں ہے اسے اقبال کہہ دو   کسی موقع پر شرمانا نہیں ہے

یہ شعر خود شناسی اور دوسروں کی جانب سے نہ پہچانے جانے کی بات کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کی زندگی اور خیالات حقیقت پر مبنی ہیں، لیکن لوگ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس غزل کا دوسرا شعر انسانی شخصیت کی اصل قدروں کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کسی کو اس کی ظاہری حالت سے نہیں پرکھنا چاہیے۔ اس غزل کے بعض اشعار دنیا کی بے ثباتی اور اس میں انسان کی کوششوں کے بیکار ہونے کی حقیقت کو بیان کرتا ہے اور خود اعتمادی اور بے باکی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ شاعر نصیحت کرتا ہے کہ جو دل میں ہو، اسے بے جھجک کہہ دینا چاہیے۔

اقبال حسن آزاد کی شاعری میں زندگی کی حقیقتوں، انسانی رویوں، اور معاشرتی مسائل کا بہترین اظہار ملتا ہے۔ ان کے اشعار سادہ اور روانی کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیں۔

دست قدرت ہی کھلاتا ہے گل تازہ کو
دست قدرت سے ہی اک پل میں بکھر جاتا ہے

ان کی شاعری قاری کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اسے سوچنے اور عمل کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ اقبال حسن آزاد بطور شاعر اردو ادب کی دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ان کی شاعری نے اردو ادب کو بہت زیادہ نوازا ہے۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد بطور استاد

بحیثیت استاد ڈاکٹر آزاد کی خدمات بھی اتنی ہی قابل ذکر ہیں۔ وہ اپنے طلباء کے لیے اپنی لگن اور ادب سے محبت پیدا کرنے کی صلاحیت کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کا تدریسی طریقہ کار سخت تعلیمی معیارات کو پرورش کے انداز کے ساتھ جوڑتا ہے، طلباء کو تنقیدی انداز میں سوچنے اور متن کی اپنی تشریحات

تیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ڈاکٹر آزاد تجزیاتی اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے پر زور دیتے ہیں، اپنے طلباء کو نہ صرف تعلیمی کامیابی کے لیے تیار کرتے ہیں بلکہ اپنے اردگرد کی دنیا کے ساتھ سوچ سمجھ کر مشغول ہونے کے لیے بھی تیار کرتے ہیں۔ ان کی رہنمائی نے بہت سے طلباء کو ادب اور متعلقہ شعبوں میں کامیاب کیریئر کی طرف رہنمائی کی ہے، جو ان کی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگیوں پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔

گویا ادب اور تعلیم میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی خدمات وسیع اور ہمہ جہتی ہیں۔ ایک نقاد کے طور پر، وہ ادبی کاموں میں گہری اور باریک بین بصیرت پیش کرتے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کے طور پر، وہ ایسے افسانے بیان کرتے ہیں جو متعدد سطحوں پر قارئین کے ساتھ بازگشت کرتی ہیں۔ ایک استاد کے طور پر، وہ مستقبل کے اسکالرز اور مصنفین کے ذہنوں کو متاثر اور تشکیل دیتے ہیں۔ اور بطور ایڈیٹر، وہ متنوع اور جامع ادبی ثقافت کو فروغ دیتے ہیں۔ ان شعبوں میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا کام نہ صرف ادب کے میدان کو تقویت بخشتا ہے بلکہ تحریری لفظ کے ساتھ فکری اور سرشار مشغولیت کی طاقت کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ ان کی ادبی وراثت فکری بالیدگی، تخلیقی اظہار اور ادبی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا عزم ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Near Shan Elahi Masjid
Jamia Nagar Oakhla
New Delhi-110025
Mob :9599396218

نام کتاب: جہان اردو
سلور جوبلی خصوصی شمارہ ۱
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵ء
مدیر: پروفیسر مشتاق احمد
جلد :۲۵
شمارہ نمبر: ۱۰۰
قیمت: ۶۰۰/روپے
ملنے کا پتہ:
Rahamganj
Darbhanga, Bihar 846004

نام کتاب: جہان اردو
سلور جوبلی خصوصی شمارہ ۲
جنوری تا مارچ ۲۰۲۶ء
مدیر: پروفیسر مشتاق احمد
جلد :۲۶
شمارہ نمبر: ۱۰۱
قیمت: ۶۰۰/روپے
ملنے کا پتہ:
Rahamganj
Darbhanga, Bihar 846004

● ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

شبیر احمد کا ناول: جگ بانی

معروف فکشن نگار شبیر احمد کے دو ڈیجیٹل ناول ''جگ بانی'' اور ''بدروہی'' موصول ہوئے۔ پہلی نظر ''جگ بانی'' پر پڑی، جس کا سرورق نہ صرف دل کش بلکہ اپنے معنوی جہات کے اعتبار سے بھی توجہ طلب محسوس ہوا۔ تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل اس ضخیم ناول کا مطالعہ شروع کیا تو جلد ہی احساس ہوا کہ شبیر احمد نے اردو نثر کی اس داستان گو روایت کو نئے عہد کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے جس کی جڑیں فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی نثری تجربات تک پہنچتی ہیں۔

فکری سطح پر ''جگ بانی'' بنگال کی سرزمین میں پنپنے والی اس باغی روایت کا بیانیہ ہے جس نے استعماری جبر کے خلاف مزاحمت کو جنم دیا۔ ناول کا پس منظر سیاسی، تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے نہایت وسیع ہے، لیکن مصنف نے اسے محض واقعات کی ترتیب تک محدود نہیں رکھا بلکہ ایک زندہ انسانی تجربے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کو ہر چند صفحات کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نہیں پڑھ رہا بلکہ تاریخ کو اپنے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہا ہے۔

ناول کا آغاز ڈرامائی اور علامتی انداز میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں رمزیت کی ایک ہلکی سی فضا قائم ہوتی ہے، لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، علامتوں کی دھند چھٹنے لگتی ہے اور ان کی جگہ تجسس لے لیتا ہے۔ یہی تجسس قاری کو آخری صفحے تک اپنے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ ناول کے اختتام پر مرکزی کردار کے بارے میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ زمانے کے دھارے کے ساتھ بہنے والا شخص نہیں بلکہ اس کے مخالف سمت میں سفر کرنے والا ایک باغی مسافر ہے۔

شبیر احمد کی منظر نگاری ناول کی اہم ترین فنی خصوصیات میں سے ہے۔ ان کے ہاں مقامات، مناظر اور ماحول صرف بیان نہیں ہوتے بلکہ قاری کے ذہن میں تصویری صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پورا منظر کسی پردۂ سیمیں پر متحرک ہو۔ کرداروں کے مکالمے بھی اسی طرح مؤثر ہیں۔ بالخصوص ابنِ فقیر اور عباپوش کے درمیان ہونے والی گفتگو ناول کے فکری نظام کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

عبا پوش کا کردار دراصل اخلاقی ضمیر کا استعارہ ہے۔ ناول کے اختتامی مباحث میں اس کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات محض چند کرداروں کے سوالات نہیں بلکہ پورے عہد کے سوالات ہیں۔ وہ قاری کو اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں اسے صبر، بغاوت اور ترکِ دنیا جیسے تصورات کے درمیان انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ناول کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے نجات اور تبدیلی کے امکانات کو بغاوت کے تصور سے وابستہ کیا ہے، لیکن یہ بغاوت محض تخریب نہیں بلکہ شعور، تعمیر اور اخلاقی ذمہ داری سے عبارت ہے۔

ناول میں فلیش بیک کی تکنیک نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کی گئی ہے۔ ماضی اور حال ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان حدِ فاصل دھندلی پڑ جاتی ہے۔ سیاسی اور اخلاقی بحرانوں کے ساتھ ساتھ انسانی محبت، ایثار اور قربانی کے عناصر بھی پوری قوت کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ یہی توازن ''جگ بانی'' کو محض ایک سیاسی ناول بننے سے بچاتا ہے اور اسے انسانی روح کی جستجو کا بیانیہ بنا دیتا ہے۔

: ناول ''جگ بانی'' کا مرکزی کردار نذر علی ہے، جو محض ایک فرد نہیں بلکہ اپنے عہد کی بے چینی، اضطراب اور انقلابی شعور کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے۔ شبیر احمد نے اس کردار کی تشکیل میں غیر معمولی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی شخصیت، طرزِ فکر، حرکات و سکنات، وطن سے محبت، انسانی دردمندی اور آزادی کے لیے تڑپ، سب کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں ایک زندہ اور متحرک کردار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

درحقیقت یہ ناول قاضی نذر الاسلام کی زندگی، فکر اور انقلابی شعور کی تخلیقی باز آفرینی ہے۔ مصنف نے ان کی شخصیت کو محض تاریخی حوالوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک علامت میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ علامت غلامی کے خلاف احتجاج، آزادی کے خواب، انسانی وقار اور قومی خودداری کی علامت ہے۔

ناول میں شانتی نکیتن کے پس منظر میں نذر علی اور گرودیو ربندر ناتھ ٹیگور کے درمیان ہونے والے مکالمے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مکالمے ناول کی فکری بنیادوں کو استحکام عطا کرتے ہیں۔ ایک طرف ٹیگور کا فلسفۂ محبت، انسان دوستی اور روحانی بالیدگی ہے، اور دوسری طرف نذر علی کا انقلابی مزاج، جو ظلم اور جبر کے خلاف فوری ردِعمل کا تقاضا کرتا ہے۔

ٹیگور کے نزدیک شاعر کا کام شور برپا کرنا نہیں بلکہ شعور پیدا کرنا ہے۔ وہ آگ کو چراغ بنانا چاہتے ہیں، جب کہ نذر علی کے اندر وہ اضطراب موجود ہے جو آگ کو شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔ تاہم ناول کی خوبی یہ ہے کہ مصنف ان دونوں نقطۂ ہائے نظر کو ایک دوسرے کی ضد کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ انہیں انسانی جدوجہد کے دو مختلف مگر تکمیلی زاویوں کے طور پر سامنے لاتا ہے۔

اسی تناظر میں نذر علی کا یہ احساس بڑی معنویت اختیار کر جاتا ہے کہ انقلاب صرف تلوار سے نہیں بلکہ قلم سے بھی برپا ہوتا ہے۔ ناول میں بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ پائیدار تبدیلی صرف سیاسی قوت سے نہیں بلکہ فکری بیداری سے جنم لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری یہاں محض جمالیاتی اظہار نہیں رہتی بلکہ ایک اخلاقی اور سماجی ذمہ داری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نذر علی کی شاعری ناول میں بغاوت کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے۔ اس کی نظموں میں ایک ایسی آگ موجود ہے جو غلامی کے اندھیروں کو چیر کر آزادی کی روشنی تک پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ شاعری نوجوانوں کے دلوں میں حریت، قربانی اور مزاحمت کے جذبات بیدار کرتی ہے۔ گوپی ناتھ جیسے کردار اسی انقلابی فضا میں اپنی شناخت حاصل کرتے ہیں اور اپنے عہد کے سیاسی شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

تاہم ناول نگار بغاوت کو محض تخریب کا نام نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی بغاوت وہ ہے جو تعمیر کی راہیں ہموار کرے۔ اسی لیے ناول میں محبت، قربانی اور انسانی رشتوں کی حرمت کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ صفحۂ زندگی پر انقلاب اور محبت ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون نظر آتے ہیں۔

سین گپتا خاندان کے ماحول میں نذر علی کی داخلی کشمکش اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ ایک طرف آزادی کی جدوجہد کا پکارنے والا عہد ہے اور دوسری طرف انسانی جذبات، محبت اور ذاتی وابستگیاں ہیں۔ مصنف نے اس کشمکش کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ نذر علی کے نزدیک خواب، محبت، قربانی اور انقلاب، سب ایک ہی انسانی تجربے کے مختلف رنگ ہیں۔ یہی تصور ناول کو محض سیاسی داستان بننے سے بچا کر ایک ہمہ جہت انسانی بیانیہ بنا دیتا ہے۔

اس پورے سفر میں مصنف نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ قوموں کی تقدیر صرف میدانِ جنگ میں نہیں بدلتی بلکہ درس گاہوں، کتابوں، شاعری اور انسانی شعور کی تشکیل کے عمل میں بھی نئی تاریخیں جنم لیتی ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ''جگ بانی'' کو ایک تاریخی ناول سے آگے بڑھا کر فکری اور تہذیبی مکالمے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

''جگ بانی'' کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے۔ ناول کے کردار محض کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے تخلیق نہیں کیے گئے بلکہ وہ اپنے عہد کے نفسیاتی، سماجی اور سیاسی رویوں کے نمائندہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے باطن میں خوشی اور غم، امید اور یاس، شکست اور مزاحمت، سب ایک ساتھ موجود ہیں۔ بعض کردار حالات کے جبر کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہتے ہیں، جب کہ بعض شکست خوردگی اور بے بسی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ یہی تنوع ناول کو زندگی کے قریب تر لے آتا ہے۔

شبیر احمد کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ جیسے بظاہر خشک موضوع کو فکشن کی دل کش فضا میں اس طرح سمودیا ہے کہ قاری نہ صرف تاریخی واقعات سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ ان کے انسانی اثرات کو بھی پوری شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ناول میں تقسیمِ ہند سے قبل کی سیاسی صورتِ حال، آزادی کی تحریک، سامراجی قوتوں کے عزائم اور برصغیر کے بدلتے ہوئے سماجی منظرنامے کی جھلکیاں بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

یہ ناول محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ تاریخ کے اندر پوشیدہ انسانی تجربات کی بازیافت ہے۔ مصنف نے ان لمحوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے جنہوں نے ایک قوم کی اجتماعی نفسیات اور فکری سمت کا تعین کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول پڑھتے ہوئے قاری خود کو محض ایک مشاہد نہیں بلکہ اس پورے تاریخی عمل کا شریک محسوس کرنے لگتا ہے۔

فنی اعتبار سے شبیر احمد کا بیانیہ متوازن، رواں اور اثر آفرین ہے۔ ان کے ہاں منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور کردار سازی ایک دوسرے کی تکمیل کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ جذباتیت اور خطابت کے جال میں پھنسنے کے بجائے واقعات اور کرداروں کو خود اپنی معنویت پیدا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہی رویہ ان کے فن کو پختگی عطا کرتا ہے۔

ناول کا ایک اہم پہلو تشدد، مزاحمت اور اخلاقی ذمہ داری کے باہمی تعلق سے متعلق ہے۔ شبیر احمد تشدد کو رومانوی رنگ میں پیش نہیں کرتے۔ وہ اس کے اسباب، نتائج اور انسانی قیمت کو پوری سنجیدگی سے سامنے لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تشدد محض سنسنی پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنتا بلکہ ایک فکری سوال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تناظر میں ان کا فن اردو فکشن کی بعض اہم روایتوں سے مکالمہ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تاریخی بصیرت، انتظار حسین کی تہذیبی یادداشت، منٹو کی بے باک حقیقت نگاری اور راجندر سنگھ بیدی کی انسانی نفسیات سے آگاہی......ان سب کی بازگشت کہیں نہ کہیں اس ناول میں سنائی دیتی ہے۔ تاہم شبیر احمد کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنی ایک الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔

منٹو کے یہاں تشدد اکثر انسانی تنہائی اور سماجی زوال کی علامت بن جاتا ہے، جب کہ بیدی کے ہاں اس کے روحانی اور نفسیاتی اثرات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ شبیر احمد ان دونوں زاویوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک تیسرا زاویہ سامنے لاتے ہیں، جہاں تشدد انسان کو سوال اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ قاری کو محض متاثر نہیں کرتے بلکہ اسے سوچنے، پرکھنے اور اپنے عہد کے مسائل سے مکالمہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اسی لیے ''جگ بانی'' صرف ایک تاریخی یا سوانحی ناول نہیں رہ جاتا بلکہ سیاسی، اخلاقی اور انسانی

بحرانوں کا ایک بامعنی استعارہ بن جاتا ہے۔ یہ ناول قاری کو ماضی کی گزرگاہوں سے گزار کر حال کے سوالات سے روبرو کرتا ہے اور مستقبل کے امکانات پر غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

المختصر، ''جگ بانی'' ایک اہم، فکر انگیز اور فنی اعتبار سے قابلِ توجہ ناول ہے۔ یہ آزادی، مزاحمت، محبت، قربانی اور انسانی وقار کی ایسی داستان ہے جو اپنے عہد کی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانوں کے لیے بھی معنویت رکھتی ہے۔ شبیر احمد نے اس ناول کے ذریعے نہ صرف ایک تاریخی شخصیت اور ایک عہد کی روح کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے بلکہ اردو ناول کی روایت میں ایک قابلِ قدر اضافہ بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جگ بانی'' محض مطالعے کی نہیں بلکہ سنجیدہ غور و فکر کی بھی متقاضی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں 'اودھ پنچ' اور 'شگوفہ' کا حصہ صنف: تنقید مصنف: ڈاکٹر فیاض احمد فیضی سن اشاعت: ۲۰۱۹ صفحات: ۳۶۸ قیمت: ۳۵۰/روپئے مصنف کا پتہ: T2/Flat 2304 lodha Casa Maxima, Hatkesh Udyog Nagar Mira Road Dist (East) Thane 401107		نام کتاب: ڈاکٹر حسن احمد نظامی (حیات و خدمات) مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں ایڈیشن: تیسرا سن اشاعت: ۲۰۲۶ صفحات: ۶۵۴ قیمت: ۱۰۰۰/روپئے ملنے کا پتہ: Gaous Manzil Talab Mulla Iram Rampur, UP

● ڈاکٹر رمیشا قمر

احمد فراز کی غزل: کلاسیکی رنگ میں جدید احساس

اس سے بڑھ کر کوئی انعام ہنر کیا ہے، فرازؔ
اپنے ہی عہد میں ایک شخص فسانہ بن جائے

آج نوجوانوں کے دلوں میں جن دو شاعروں نے ہلچل مچا رکھی ان میں ایک جون ایلیا اور دوسرے احمد فراز ہیں۔ دونوں اگرچہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، مگر ان کی شاعری آج بھی انھیں زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ ان کی غزلیں محبت کے نازک تاروں کو چھیڑتی ہیں، ذہن و دل کے رگ و ریشے میں ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ دل کے تاریک خانوں میں روشنی بکھیرتی ہیں، جذبات کی گہرائیوں میں چھپی حسرتوں کو بیدار کر دیتی ہیں۔ ان کے اشعار نہ صرف ہونٹوں پر مسکان سجاتے ہیں بلکہ دل میں عشق کے جذبات بھی جگا دیتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان دونوں شاعروں پر تفصیل سے روشنی ڈالوں، مگر اس مضمون میں صرف احمد فراز کی شاعری مرکز ہوگی، اس لیے جون ایلیا پر گفتگو بعد میں ہوگی۔

احمد فراز ان خوش قسمت شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو اپنی زندگی میں بھی دلوں کو لبھائے اور اپنی وفات کے بعد بھی محبت اور جذبات کے آئینے میں زندہ ہیں۔ اگرچہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں، مگر ان کی پہچان اور اصل عظمت غزل ہی میں مضمر ہے۔ غزل کے میدان میں کئی شاعروں نے اپنے احساسات کا اظہار کیا، مگر جو مقبولیت احمد فراز کی غزلوں کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عصری حسیت اور کلاسیکی حسن کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ہے کہ اس کی اپیل کا دائرہ کافی بڑھ جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں غنائیت اور موسیقیت کی دلاویز کیفیت بھی شامل ہے، اور یہی انہیں منفرد اور لازوال بناتی معروف شاعر فراق گورکھپوری بھی احمد فراز کی شاعری کی باریکیوں، جذباتی اثر پذیری اور دلاویزی کے معترف تھے لکھتے ہیں۔

''احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی اور انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے وجدان کی جمالیاتی شعور کی ایک خاص شخصیت ہے جو نہایت دلکش خدوخال

سے مزین ہے۔ وہ صداقت کے نئے مقامات سے اپنی باتیں رکھتے ہیں اور یہ
باتیں دعوت فکر دیتی ہوئی حد درجے دلکش و دل نشین ہیں ان کا کلام اردو شاعری
کے نئے موڑ کے کئی زاویوں کی لچک اور تھرتھراہٹیں اپنے اندر رکھتا ہے۔'' ۱

فراز کی غزل کے بارے میں ممتاز الحق رقمطراز ہیں۔

''ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانوی شاعری نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ
دورِ حاضر کے لطیف ذہنی ردعمل کا سچا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔'' ۲

روایتی غزل گو شاعروں سے احمد فراز اس لیے ممتاز ہیں کہ ان کے اشعار محض روایتی نہیں بلکہ دل سے نکلنے والے، سچے جذبات کے عکاس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کے کلام کو پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے دل کی گہرائیوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ احمد فراز کو صنف غزل سے بے پناہ محبت تھی اور یہ لگاؤ ان کے کلام میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف خالص غزل کے روایتی موضوعات میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ لفظ 'غزل' کو بھی اپنی شاعری کا لازمی اور بار بار ابھرتا ہوا جزو بنا دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں لفظ 'غزل' پر سینکڑوں اشعار ملتے ہیں، انہوں نے اپنے ایک شعری مجموعے کا عنوان بھی 'غزل بہانہ کروں' رکھا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

فراز شہرِ غزل میں قدم سلوک سے رکھ
کہ اس میں میر سا، غالب سا خوش نوا بھی ہے

غزل کہی تو لہو بدن سے نچڑ گیا
کہ جیسے صحرائے مرگ وادی خیال کی ہو

غزل کہوں تو خیالوں کی دھند میں مجھ سے
کرے کلام کوئی اپسرا اداسی کی

اردو غزل کو تلخ و شیریں، داخلیت و خارجیت، مادیت و روحانیت، حسن و عشق، ہجر و وصال کے حسین و جمیل رنگ سب مل کر ایک پر کیف اور بہار بھرا مجموعہ بناتے ہیں اور احمد فراز کی غزل انہی تمام عناصر کے اظہار کا شاہکار ہے۔ کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجئے:

ذکر جاناں سے ہی میری غزل آراستہ ہے
ورنہ میں کون، میرا شعر سے کیا واسطہ ہے

سب قرینے اسی دلدار کے رکھ دیتے ہیں
ہم غزل میں بھی ہنر یار کے رکھ دیتے ہیں

میری غزل میں کوئی اور کیسے در آئے
ستم تو یہ ہے کہ اے یار! اب کہاں تو بھی کوئی

کوئی سخن برائے قوافی نہیں کہا
ایک شعر بھی غزل میں اضافی نہیں کہا

جو غزل آج تیرے ہجر میں لکھی ہے وہ کل
کیا خبر اہلِ محبت کا ترانہ بن جائے

یہ چنداشعار ہی کافی ہیں اس بات کا ثبوت دینے کے لیے کہ لفظ "غزل" احمد فراز کی شاعری اور شخصیت کا لازمی اور ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، احمد فراز کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت محبت کا پُرخلوص اور دل سے اظہار ہے۔ واقعی، ان کی غزلیں عشق کا ترانہ ہیں، جن میں ہر جذبہ، ہر سر اور ہر احساس اپنی پوری شدت کے ساتھ جھلکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی ان کے کلام کو پڑھتا یا سنتا ہے، اس کے دل کی آواز بن جاتے ہیں اا ور ہر خاص و عام کے لب فراز کے اشعار گنگناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ احمد فراز کی غزلیں صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ دلوں کو چھو جانے والا تجربہ ہیں، جو ہر نسل کے دل میں محبت کے نغمے بکھیرتی ہیں اور یادگار رہ جاتی ہیں۔

احمد فراز کی غزلیں نہ صرف الفاظ کی نزاکت اور خیال کی گہرائی کی آئینہ دار ہیں بلکہ ہر مصرعے میں ایک طرح کی نغمگی بھی ہے جو اسے موسیقی کے لیے بے حد موزوں بناتی ہے۔ ہندستانی اور پاکستانی موسیقاروں نے ان کی غزلوں کو عوام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا، جس سے فراز کا کلام سرحدوں سے ماورا ہو کر دلوں میں رچ بس گیا۔ لتا منگیشکر، جگجیت سنگھ، مہدی حسن، نور جہاں جیسے عظیم فنکاروں نے فراز کی غزلوں کو اپنی آواز میں ڈھال کر انھیں دو آتشہ بنا دیا۔ ہر گلوکار نے فراز کے کلام میں اپنی آواز کی چاشنی شامل کی، جس سے یہ غزلیں ہر زمانے میں تازہ اور دلکش محسوس ہوتی ہیں۔

احمد فراز کی تخلیقات صرف عوام میں ہی نہیں بلکہ خواص میں بھی بے حد مقبول ہیں، اور ان کی پذیرائی ان کی لطافت، معنویت اور جذباتی شدت کی بدولت ہر محفل میں ہوتی ہے، ان کی اس خوبی کو احمد ندیم قاسمی نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

> ''فراز کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام تر روشن روایات کے خوبصورت اظہار کا نام ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک ایک مصرع ایسا گٹھا ہوا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بھی اگر ادھر سے ادھر ہو جائے تو شعر بکھر جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ فراز کی غزل گوئی پرفیکشن کی انتہا ہے۔'' ۳

بلاشبہ، احمد فراز نے اردو غزل میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ انہوں نے دل کی ہر کیفیت کو اس نفاست اور باریکی کے ساتھ بیان کیا کہ ہر انسان اپنی عکاسی وہاں دیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہ صرف دلوں میں اتر جاتے ہیں بلکہ زندگی کے مشکلات میں حوصلہ، صبر اور جینے کی لگن بھی پیدا کرتے ہیں۔ فراز کی شاعری قارئین کو محبت کی طاقت، احساس کی گہرائی اور جذبات کی نزاکت سے روشناس کراتی ہے، کچھ مثالیں سماعت فرمائیے:

لٹ چکے عشق میں ایک بار تو پھر عشق کرو کس کو معلوم کہ تقدیر سنور جائے
دل کا دکھ جانا تو دل کا مسئلہ ہے پر ہمیں اس کا ہنس دینا ہمارے حال پر اچھا لگا
کہاں کے مکتب وملا، کہاں کے درس ونصاب بس ایک کتابِ محبت رہی ہے بستے میں

فراز نے اپنی شاعری میں محبوب کی جستجو کے ذریعے انسانی زندگی کو عشق اور محبت کا پیغام دیا۔ ان کے نزدیک عشق زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ انہوں نے خود اس کا تجربہ کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو عشق نہیں کرسکتا، وہ اس دنیا میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ عشق کی شدت، قربت کے لمحوں کی نایابی اور محبت کے لطیف جذبات ان کے اشعار میں یوں محسوس کیے جاسکتے ہیں:

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں
نہیں ہے تاب تو پھر عاشقی کی راہ نہ چل یہ کارزار جنوں ہے جگر نکال کے رکھ
تیرا مسئلہ محبت ہے محبت بلا سے راس آئی یا نہ آئی
تیری قربت کے لمحے پھول جیسے مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں، میں شباہت اس کی کہ خواب میں بھی بھلی لگتی ہے خیالوں جیسی
وہ یاد آئے تو الہام بن کے شعر اترے وہ بھول جائے تو پھر کس کو یاد آئے سخن

اردو غزل کی روایت کے مطابق، محبوب کے لیے عام طور پر صیغہ مذکر استعمال ہوتا ہے، لیکن احمد فراز نے اس روایت سے ہٹ کر، بالکل ولی دکنی کی طرح، کئی اشعار میں محبوب کے لیے مونث کا صیغہ اختیار کیا۔ اس تبدیلی نے ان کی شاعری میں تازگی، نفاست اور جذباتی گہرائی پیدا کی۔ فراز نہ صرف روایت کو زندہ رکھتے ہیں بلکہ اسے ایک نیا ادبی رنگ بھی دیتے ہیں۔ غزل "خوابِ گل پریشاں ہیں" اس جدت کی بہترین مثال ہے، جہاں ہر مصرعے میں محبوب کی شخصیت کی نزاکت اور ادا کی اہمیت اتنی خوبصورتی سے اجاگر کی گئی ہے کہ پڑھنے والا ہر لفظ میں محبت اور احساس کے ملمع کو محسوس کرتا ہے۔

ادھر ادھر کے بھی کردار آتے جاتے رہے میرے سخن کا مگر مرکزی خیال تھی وہ
شب نشاط تھی یا صبح پر ملال تھی وہ تھکن سے چور تھا میں، نیند سے نڈھال تھی وہ
وہ پیرہن تھی مگر جسم وجاں رہی میری کہ جو بھی جیسا بھی موسم تھا حسب حال تھی وہ
یہ عمر بھر کا اثاثہ اسی کے نام تو ہے اگرچہ میری رفاقت میں چند سال تھی وہ

فراز کی شاعری میں انسانی جذبات کی گہرائی اور لطافت بیک وقت محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اشعار نہ صرف دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں بلکہ زندگی اور محبت کے اصول بھی سکھاتے ہیں۔ ہر شعر میں

ایک نرمی اور شدت کا امتزاج ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتا ہے، اور یہی ان کی شاعری کا حسن اور دیرپا اثر ہے۔ ان کی غزلیں صرف محبت کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی احساسات، یادوں کی نزاکت اور زندگی کے رنگوں کا ایسا مکمل عکس ہیں کہ ہر دور کے قارئین اسے اپنی زندگی کا حصہ محسوس کرتے ہیں۔ فراز کی شاعری قارئین کو نہ صرف سوچنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ ان کے دلوں میں ایک دیرپا اور لطیف اثر بھی چھوڑ جاتی ہے۔

محبت کی واردات، عشق کے لطیف معاملات، محبوب کے حسن کی نفیس جھلکیاں، ساتھ ہی لطافت ونرمی، اعتدال و ہمواری، تناسب و توازن اور درد و کرب کی مٹھاس، یہ تمام عناصر ہی حقیقی عشقیہ شاعری کی روح بنتے ہیں۔ احمد فراز کی شاعری کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خصوصیات ان کے فن کے لازمی ستون ہیں، جو ہر شعر اور ہر مصرعے میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور قاری کے دل میں ایک نرم لہجہ بکھیرتے ہیں۔

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں　　تیرے آنے کے زمانے آئے
یہ دل جو تجھ کو بظاہر بھلا چکا ہے　　کبھی کبھی تیرے بارے میں سوچتا بھی ہے
فراز آج شکستہ پڑا ہوں بت کی طرح　　میں دیوتا تھا کبھی ایک دیوداسی کا
خیال یار کا بادل اگر کھلا بھی کبھی　　تو دھوپ پھیل گئی جا بجا اداسی کی
اب تو ہمیں ترک مراسم کا دکھ نہیں　　پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

غزل کا حسن اس وقت عروج پر پہنچتا ہے جب اس میں غنائیت، موسیقی اور رقصِ الفاظ کی ہم آہنگی موجود ہو۔ احمد فراز نے اسی پہلو پر خصوصی توجہ دی، اور ان کی تقریباً ہر غزل میں مترنم بحریں، گنگناتی ہوئی ردیفیں اور موسیقی آمیز الفاظ سنائی دیتے ہیں، جو قاری کے دل میں رومانیت کی ایک مدھم لیکن گہری لہر چھوڑتے ہیں:

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فراز　　آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے
وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند　　میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

فراز کی غزل میں رومانوی فضا نہایت صاف اور شفاف ہے، کیونکہ وہ محبت میں وقار، احترام اور نفاست کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری کرب و آلام کی عکاسی بھی کرتی ہے، جس سے قاری نہ صرف عشق کی شدت بلکہ انسانی جذبات کی گہرائی کو بھی محسوس کرتا ہے۔

احمد فراز ایسی متاثر کن محبتوں کے شاعر ہیں جن کے بغیر اردو غزل کا ماضی، حال اور مستقبل ادھورا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی حسن کو نئے رنگ و آہنگ سے ہم آمیز کیا اور رومان کو انسانی نفسیات اور جذبات کی پہچان کے طور پر بھی پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی اور جدید ساختیں ہم آہنگ ہو کر ایک مکمل، دلکش اور روحانی تجربہ تخلیق کرتی ہیں:

سو حوالوں سے تجھے یاد کروں جانِ فراز — جانِ جاں، جانِ جہاں، جانِ سخن، جانِ فراز
پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں — تیرے آنے کے زمانے آئے
کچھ تو میرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ — تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ
رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ — آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

صنفِ غزل کی روشن تہذیب فراز کی شاعری میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ محبت ان کی غزلوں کا محور رہی، اور ان کی نظر میں یہ ایک مقدس جذبہ ہے، جو محض مرد وعورت کے تعلق تک محدود نہیں بلکہ انسان کو روحانیت، بلندی اور علویت کی جانب لے جاتا ہے وہ دعا کرتے ہیں۔

اے خدا سب کا مقدر کر دے
وہ محبت جو انسان کو پیغمبر کر دے

☆☆☆

حوالہ جاتی کتب:

۱۔ فراق گورکھپوری بحوالہ نیا ادب احمد فراز نمبر 2008 اردو اکادمی نئی دہلی 128

۲۔ فراز ایک ہمہ جہت شخصیت۔ شاہد دلاور شاہ۔۔مشمولہ ماہنامہ ماہ نوجنوری 2009 ص 219

۳۔ کلیات احمد فراز: ترتیب وتزئین: فاروق ارگلی فرید بک ڈپو دہلی 2004 ص 128

◀● ▶

H.NO: 189 Near Mahindra Showroom
Sedam Road Kalaburagi 585105(KS)
Mob No:7259673569

محترمہ نشاط پروین کا

پہلا

افسانوی مجموعہ

رانگ نمبر

کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر منظر عام پر آ چکا ھے.

● گوشہ ریسرچ اسکالر

● شگفتہ جبیں

مولانا منت اللہ رحمانیؒ: شخصیت وخدمات

حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ برصغیر کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے علمی، دینی، سماجی، ملی اور ادبی میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آپ حضرت شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی کے مرید وخلیفۂ اول اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بانی حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزندِ ارجمند تھے۔ آپ علومِ اسلامیہ، بالخصوص تفسیر، حدیث اور فقہ میں گہری بصیرت رکھتے تھے اور دینی دردمندی آپ کی شخصیت کا نمایاں وصف تھی۔

آپ کا تعلق ایک ایسے معزز اور علمی خانوادے سے تھا جس میں دینی قیادت، شرافت اور روحانی عظمت نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ تاہم آپ نے خاندانی عظمت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی صلاحیتوں، علمی جدوجہد اور اصلاحِ امت کے جذبے سے اس روایت کو نئی وسعت عطا کی۔ آپ کی زندگی بے شمار ایسے واقعات سے عبارت ہے جو محبت، شفقت، ایثار، حکمت اور دعوتِ عمل کا حسین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت امیرِ شریعتؒ نے ایسے دور میں آنکھ کھولی جب ہندوستان انگریزی استعمار کے تسلط میں تھا۔ ایک جانب آزادیِ وطن کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور دوسری جانب عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے عقائد وتشخص پر اثر انداز ہونے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ مزید برآں قادیانیت کا فتنہ بھی سر اٹھا رہا تھا اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی انہیں فکری انتشار اور گمراہی کے خطرات سے دوچار کر رہی تھی۔

انگریز حکومت کی پالیسیوں نے علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں مسلم معاشرہ فکری اور تہذیبی بحران کا شکار ہو گیا۔ ایسے نازک حالات میں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور دیگر مخلص علماء نے دینی بیداری کی تحریک چلائی اور علومِ دینیہ کے احیا کے لیے مدارس کے قیام کو فروغ دیا۔ اسی پس منظر میں لارڈ میکالے کی مشہور تعلیمی پالیسی سامنے آئی، جس کا مقصد ایک ایسا طبقہ تیار کرنا تھا جو نسلی اعتبار سے ہندوستانی مگر فکر وتہذیب کے اعتبار سے مغربی ہو۔ اس کے ردِ عمل میں دینی

مدارس کی تحریک نے مزید قوت حاصل کی اور دین وشریعت کے تحفظ کی ایک منظّم جدوجہد کا آغاز ہوا۔

حضرت امیرِ شریعتؒ کا خاندان علمی، دینی اور روحانی روایات کا امین تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔ آپ کے آبا و اجداد بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور مختلف علاقوں میں قیام کے بعد بہار کے ضلع مونگیر میں سکونت اختیار کی۔

گھر کا دینی ماحول اور بزرگوں کی تربیت آپ کی شخصیت سازی میں بنیادی عنصر ثابت ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور بعدازاں ممتاز علماء واساتذہ سے مختلف علومِ اسلامیہ کی تحصیل کی۔ بچپن ہی سے آپ غیر معمولی ذہانت، سنجیدگی اور دینی مزاج کے حامل تھے۔ فقہ، حدیث، تفسیر، عربی ادب اور دیگر اسلامی علوم میں آپ نے نمایاں مہارت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے تدریس، دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور ملی خدمت کے میدان میں عملی زندگی کا آغاز کیا۔ جہاں بھی آپ رہے، وہاں دینی شعور کی بیداری، علمی سرگرمیوں کے فروغ اور اصلاحِ امت کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔ علماء، طلبہ، دانشور اور عوام الناس یکساں طور پر آپ کی مجلس سے فیض یاب ہوتے تھے۔

حضرت امیرِ شریعتؒ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کا بلند اخلاق و کردار تھا۔ آپ اخلاقی اقدار کی پاسداری کو دینی زندگی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ جن امور سے اخلاقی انحطاط یا دینی کمزوری کا اندیشہ ہوتا، آپ نہ صرف خود ان سے اجتناب کرتے بلکہ دوسروں کو بھی ان سے بچنے کی تلقین فرماتے۔ اسی وجہ سے عوام وخواص آپ سے علمی اور عملی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

آپ ہر طبقۂ فکر کے افراد سے خندہ پیشانی اور محبت کے ساتھ ملتے تھے اور حدیثِ نبوی **کَلِّمُوا النَّاسَ عَلَىٰ قَدْرِ عُقُولِهِم** کے مطابق ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح اور ضرورت کے لحاظ سے گفتگو فرماتے تھے۔ صبر، تحمل، برداشت، توکل علی اللہ اور شکرگزاری آپ کی زندگی کا مستقل شعار تھا۔ آپ نے ہر حال میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھا اور مشکلات و مصائب کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا۔

اصلاحِ معاشرہ اور تربیتِ افراد کے میدان میں بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ نے نوجوانوں اور کارکنوں کی تربیت کے لیے باقاعدہ ادارے قائم کیے، تربیتی اجتماعات اور کیمپوں کا انعقاد کیا، اور دینی شعور کی بیداری کے لیے منظّم کوششیں کیں۔ امارتِ شرعیہ کے زیرِ انتظام مدارس کے قیام، غریب و نادار بچوں کی تعلیم و تربیت، اور دینی ماحول کی فراہمی میں آپ نے خصوصی دلچسپی لی۔

اسی طرح آپ نے دارالقضاء اور دارالافتاء کے نظام کو بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے مختلف علاقوں تک وسعت دی، جو آپ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے عائلی، سماجی اور شرعی

مسائل کے حل کے لیے ان اداروں کو مؤثر اور فعال بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

تعلیم خواہ دینی ہو یا عصری، حضرت امیرِ شریعتؒ ہمیشہ اس کی اہمیت اور ضرورت کے قائل رہے۔ یہ احساس آپ کو اپنے والدِ گرامی حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے ورثے میں ملا تھا۔ ایک طرف آپ دینی مدارس کے استحکام، نصاب کی اصلاح اور تعلیمی معیار کی بہتری کے لیے کوشاں رہے، تو دوسری طرف عصری تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کا یقین تھا کہ ملت کی ترقی کے لیے دینی اور عصری دونوں علوم کا حصول ناگزیر ہے۔

آپ نے نصابِ تعلیم کی اصلاح، علمی سیمیناروں کے انعقاد اور مختلف تعلیمی منصوبوں کی سرپرستی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کی کوششوں سے متعدد تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کو فروغ ملا اور نئی نسل کے اندر دینی شعور، علمی ذوق اور تعلیمی بیداری پیدا ہوئی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت امیرِ شریعتؒ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آپ نے ایک طرف حضرت شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی تابندہ حیات و خدمات کو زندہ رکھا، تو دوسری طرف حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی احیائے علومِ دینیہ کی تحریک کو منظّم انداز میں مزید مہمیز دی۔ آپ نے اپنے وقت، آواز، دینی بصیرت، عزم و حوصلے اور شب و روز کی تمام تر صلاحیتوں کو علومِ دینیہ کے احیا، مسلمانوں کے دینی تشخص کے تحفظ اور شریعتِ اسلامیہ کی پاسداری کے لیے وقف کر دیا اور اسی مقصد کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔''

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امیر شریعتؒ کی ہمہ جہت خدمات کا مکمل احاطہ کسی ایک کتاب میں ممکن نہیں۔ آپ کی شخصیت علم و عمل، قیادت و رہنمائی اور خدمتِ خلق کا ایسا حسین امتزاج تھی، جس کے مختلف پہلو آج بھی اہلِ علم و دانش کے لیے تحقیق و مطالعہ کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اسی احساس کے تحت مولانا ڈاکٹر محمد وقارالدین ندوی نے اپنی تحقیقی کاوش میں حضرت امیرِ شریعتؒ کی حیات و خدمات کو موضوع بنایا اور بڑی محنت و عرق ریزی کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، تاکہ نئی نسل آپ کی خدمات اور افکار سے بھرپور استفادہ کر سکے۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی عملی زندگی کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ آپ کی تمام سرگرمیوں کا محور ملتِ اسلامیہ ہند کی دینی، تعلیمی اور سماجی ضروریات کی تکمیل تھا۔ آپ نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو ملت کی فلاح و بہبود اور شریعت اسلامیہ کے تحفظ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شخصیت بیک وقت ایک دینی رہنما، مدبر، منتظم، مصلحِ قوم اور صاحبِ بصیرت قائد کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔

ایک جانب آپ امارتِ شرعیہ، بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے امیرِ شریعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی دینی اور سماجی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، تو دوسری جانب خانقاہِ رحمانی، مونگیر میں اصلاحِ باطن اور روحانی تربیت کی خدمات بھی انجام دے رہے تھے۔ اسی طرح جامعہ رحمانی، مونگیر کے ذریعے علومِ دینیہ کی اشاعت اور دینی تعلیم کے فروغ میں بھی آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود آپ ملک وملت کو درپیش مسائل پر گہری نظر رکھتے اور ان کے حل کے لیے عملی اقدامات کرتے تھے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام اور استحکام میں بھی آپ کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جس زمانے میں مسلم پرسنل لا کو مختلف سمتوں سے چیلنج کیا جا رہا تھا اور اسلامی عائلی قوانین میں مداخلت کی کوششیں ہو رہی تھیں، اس وقت آپ نے بڑی حکمت، بصیرت اور استقامت کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ آپ نے زندگی بھر شریعتِ اسلامیہ کے تحفظ اور مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی بقا کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ اس سلسلے میں آپ کی خدمات تاریخِ ملت کا ایک روشن باب ہیں۔

حضرت امیرِ شریعتؒ نے علمی ودینی میدانوں کے ساتھ اردو ادب کی خدمت بھی نہایت سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ انجام دی۔ آپ کے سفرنامے، مکتوبات، مقالات، خطبات اور تقاریر اردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آپ کی تحریروں میں فکری گہرائی، دینی بصیرت، اصلاحی شعور اور ادبی چاشنی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ آپ کی نثر کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی، روانی اور عام فہمی ہے۔ آپ پیچیدہ سے پیچیدہ دینی اور سماجی مسئلے کو بھی نہایت آسان اور مؤثر انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریریں علماء کے ساتھ ساتھ عام قارئین میں بھی یکساں مقبول رہیں۔ آپ کی زبان شستہ، اسلوب دل نشیں اور اندازِ بیان بے تکلف تھا۔ عبارت میں روانی اور استدلال میں مضبوطی آپ کے طرزِ تحریر کا خاص وصف تھی۔

امارتِ شرعیہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ نے ادارے کو نئی فکری اور تنظیمی جہت عطا کی۔ تنظیمی استحکام، عوامی رابطے، دینی رہنمائی اور اصلاحِ معاشرہ کے شعبوں میں متعدد اصلاحات نافذ کیں۔ آپ کی قیادت میں امارتِ شرعیہ کی خدمات کا دائرہ نہ صرف بہار بلکہ ملک کے دیگر علاقوں تک وسیع ہوا اور یہ ادارہ ملت کے اعتماد کا مرکز بن گیا۔ آپ غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ پیچیدہ اور حساس مسائل میں آپ کی دوراندیشی، اعتدال پسندی اور معاملہ فہمی نمایاں نظر آتی تھی۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور دانشور آپ کی رائے کا احترام کرتے تھے اور اہم معاملات میں آپ کے مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت امیرِ شریعتؒ کی پوری زندگی سادگی، تقویٰ، اخلاص اور خدمتِ خلق کا عملی نمونہ تھی۔ آپ نے ہمیشہ ذاتی مفادات پر اجتماعی مصالح کو ترجیح دی اور ملت کی فلاح و بہبود کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا۔ یہی

اوصاف آپ کو اپنے عہد کی ممتاز اور مؤثر شخصیات میں نمایاں مقام عطا کرتے ہیں۔

حضرت امیرِ شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ آپ اپنے عہد کی ایک ہمہ جہت، باوقار اور مؤثر شخصیت تھے۔ آپ نے دینی، علمی، سماجی، تعلیمی، ملی اور ادبی میدانوں میں ایسی گراں قدر خدمات انجام دیں، جن کے اثرات آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ آپ کی زندگی علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت اور خدمتِ دین وملت کا حسین امتزاج تھی۔ آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو دین اسلام کی سربلندی، ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی اور شریعتِ اسلامیہ کے تحفظ کے لیے وقف کر دیا۔ امارتِ شرعیہ کی قیادت، جامعہ رحمانی کی سرپرستی، خانقاہِ رحمانی کی روحانی خدمات اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں فعال کردار کے ذریعے آپ نے ملت کے دینی، سماجی اور تعلیمی تشخص کے استحکام میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ کی جدوجہد نے مسلمانوں میں دینی شعور، تعلیمی بیداری اور اجتماعی احساسِ ذمہ داری کو فروغ دیا۔

حضرت امیرِ شریعتؒ نہ صرف ایک عظیم عالمِ دین اور مدبر قائد تھے بلکہ ایک صاحبِ قلم ادیب اور مؤثر خطیب بھی تھے۔ آپ کی تحریریں اور تقاریر آج بھی فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔ آپ کا اسلوبِ بیان سادگی، خلوص اور اثر آفرینی کا ایسا نمونہ ہے، جو قاری اور سامع دونوں کے دل ودماغ پر گہرا نقش چھوڑتا ہے۔

آپ کی علمی، دینی اور ادبی خدمات آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ نے جن اداروں کی آبیاری کی اور جن تحریکوں کی سرپرستی فرمائی، وہ آج بھی ملت کی خدمت میں مصروف ہیں اور آپ کے افکار ومشن کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ امارتِ شرعیہ، جامعہ رحمانی، خانقاہِ رحمانی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے ادارے آپ کی دوراندیشی، حکمتِ عملی اور خلوصِ نیت کے زندہ مظاہر ہیں۔

بلاشبہ حضرت امیرِ شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت اور خدمات تاریخِ ملت کا ایک درخشاں باب ہیں۔ آپ کی زندگی اس بات کی روشن مثال ہے کہ اخلاص، عزم، علم اور عمل کے ذریعے ایک فرد پوری قوم کی فکری اور عملی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ ہند ہمیشہ آپ کی خدمات کی مقروض رہے گی اور آنے والی نسلیں آپ کے افکار، کردار اور کارناموں سے رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت امیرِ شریعتؒ کی خدماتِ جلیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی مساعیِ حسنہ کو صدقۂ جاریہ بنائے اور ملتِ اسلامیہ کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

◀◀ ● ▶▶

Research Scholar Depatment of Urdu
Munger University, Munger
Mob: 7488665449

● محمد جیمی

اقبال مجید کی افسانہ نگاری

۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا المناک باب ہے جس نے ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی زندگی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ یہ سانحہ محض دو ملکوں کی جغرافیائی تقسیم تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے انسانی رشتوں، مذہبی رواداری اور تہذیبی ہم آہنگی کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ فرقہ وارانہ فسادات، قتل و غارت، نقلِ مکانی اور انسانی المیوں نے لاکھوں افراد کی زندگیوں کو متاثر کیا اور اس اجتماعی کرب نے ادب، خصوصاً اردو افسانے کو ایک نیا موضوع عطا کیا۔

اردو افسانہ نگاروں نے اس سانحے کو نہایت گہرائی اور فنکارانہ بصیرت کے ساتھ اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ ان کے افسانوں میں تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی بے بسی، مذہبی تعصب، تہذیبی شکست و ریخت اور نفسیاتی اذیت کی مؤثر عکاسی ملتی ہے۔ کرشن چندر کا ''پشاور ایکسپریس''، سعادت حسن منٹو کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، حیات اللہ انصاری کا ''شکر گزار آنکھیں''، راجندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی''، عصمت چغتائی کا ''جڑیں'' اور قرۃ العین حیدر کا ''جلاوطن'' اس سلسلے کے نمائندہ افسانے ہیں، جنھوں نے تقسیمِ ہند کے انسانی المیے کو ہمیشہ کے لیے ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

بدقسمتی سے تقسیم ہند کے بعد بھی فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ختم نہ ہو سکا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس نے مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔ مذہب، ذات اور شناخت کی بنیاد پر ہونے والے تشدد نے ہندوستانی معاشرے میں عدمِ تحفظ اور بے اعتمادی کی فضا کو مزید گہرا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں نے بھی اس موضوع کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا اور نئے سماجی و سیاسی تناظر میں فرقہ واریت کے اسباب، نتائج اور انسانی المیوں کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ اس ضمن میں حسین الحق کا ''پسِ پردۂ شب''، شموئل احمد کا ''سنگھار دان''، شوکت حیات کا ''گنبد کے کبوتر''، ساجد رشید کا ''زندہ در گور''، شفق کا ''نیلا خوف''، ''سید محمد اشرف کا ''آدمی''، اقبال حسن آزاد کا ''کاٹنے والے، جوڑنے والے'' اور غضنفر کا ''در و دیوار یں'' خصوصی اہمیت کے حامل افسانے ہیں۔

اسی نسل کے ممتاز افسانہ نگاروں میں اقبال مجید کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ساتویں دہائی

میں منظرِ عام پر آنے والے افسانہ نگاروں میں انہوں نے اپنے منفرد اسلوب، فکری گہرائی اور فنی تجربوں کی بدولت نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کے افسانوی مجموعے ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' (۱۹۷۰ء)، ''ایک حلفیہ بیان'' (۱۹۸۰ء)، ''شہرِ بدنصیب'' (۱۹۹۷ء) اور ''تماشا گھر'' (۲۰۰۳ء) ان کی تخلیقی بصیرت کے معتبر حوالے ہیں۔

اقبال مجید اپنے عہد کے حساس اور باشعور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے بدلتے ہوئے سماجی، تہذیبی اور سیاسی حالات کو نہ صرف گہری نظر سے دیکھا بلکہ انہیں اپنے فن کا حصہ بھی بنایا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے موضوع، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے یکسانیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں تہذیبی اقدار کا زوال، معاشی ناہمواری، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، عورت کی محرومیاں، فرد کی داخلی تنہائی، سماجی بے حسی اور فرقہ وارانہ کشیدگی جیسے موضوعات نہایت فنکارانہ انداز میں سامنے آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے سے اقبال مجید کے افسانے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ''انوکھا گھر''، ''سوختہ ساماں''، ''چیلیں''، ''سرنگیں'' اور ''دسترس'' ان کے ایسے نمائندہ افسانے ہیں جن میں فسادات کے اسباب، ان کے سماجی و نفسیاتی اثرات اور انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج کو نہایت حقیقت پسندانہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کسی مخصوص مذہب یا طبقے کے خلاف تعصب نہیں، بلکہ انسان دوستی، رواداری اور باہمی ہم آہنگی کا واضح پیغام موجود ہے۔

اقبال مجید کے افسانوں کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو محض سیاسی یا مذہبی مسئلہ قرار نہیں دیتے، بلکہ اسے انسانی اقدار کے زوال، سماجی انتشار اور باہمی اعتماد کی شکست سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک فسادات کی اصل تباہی صرف جان و مال کے نقصان تک محدود نہیں رہتی، بلکہ یہ انسان کے باطن، اس کے احساسِ تحفظ، اس کی شناخت اور اس کے رشتوں کو بھی مجروح کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں فساد ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک مسلسل نفسیاتی کیفیت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اقبال مجید کی فکر کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ قومی یکجہتی، مذہبی رواداری اور انسانی اخوت کے علم بردار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ نفرت، تعصب اور مذہبی عصبیت کسی بھی معاشرے کو تباہی کے دہانے تک پہنچا سکتی ہے، جب کہ محبت، باہمی اعتماد اور رواداری ہی ایک صحت مند سماج کی بنیاد ہیں۔ اسی فکر کا بھرپور اظہار ان کے نمائندہ افسانے ''انوکھا گھر'' میں ملتا ہے۔ یہ افسانہ بظاہر ایک گھر کی کہانی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ہندوستانی معاشرے میں اقلیتوں کے احساسِ عدمِ تحفظ، مذہبی تعصب اور شناخت کے بحران کی علامتی تعبیر ہے۔ افسانہ نگار نے نہایت فنی مہارت کے ساتھ ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو مختلف سماجی ذہنیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انور شمیم، رشمی، ترویدی اور

ہنومن کیکڑے جیسے کردار محض افراد نہیں بلکہ مخصوص فکری رویوں کے نمائندہ کردار ہیں۔رشمی کے کردار کے ذریعے مصنف نے اس ذہنیت کو پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے بارے میں پہلے سے قائم شدہ تعصّبات کی بنیاد پر رائے قائم کرتی ہے۔وہ انور شمیم سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

''انور صاحب مسلمان ڈیموکریسی کا ساتھ بھلا کیسے دے سکتا ہے؟اس کو تو تھیوکریسی پسند ہے۔اس کے بادشاہ رعایا پر خود کو خدا کا سایہ بتاتے تھے۔ مسلمان تو بس اس لمحے تک دوسرے دھرموں کے ماننے والوں کے ساتھ گزارا کر سکتا ہے جب تک وہ خود ان پر راج کر رہا ہو۔دوسرے دھرم والوں کی حکومت میں پرجا بن کر رہنا مسلمان نے کبھی نہیں سیکھا۔سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مل جل کر کسی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔انگلینڈ میں رہتا تو انگریز اور عیسائیوں کے درمیان ہے،مگر وہاں بھی اپنی ڈفلی الگ ہی بجاتا ہے۔''

یہ اقتباس محض ایک کردار کی گفتگو نہیں بلکہ اس تعصب زدہ ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے جو تاریخی حقائق سے زیادہ پیشگی تصورات پر یقین رکھتی ہے۔اقبال مجید کی فنی کامیابی یہ ہے کہ وہ اس سوچ کی تبلیغ نہیں کرتے بلکہ پورے افسانے کے ذریعے اس کی تردید کرتے ہیں۔افسانے کا ارتقا بتدریج اس مقام تک پہنچتا ہے جہاں رشمی جیسے کردار کی سوچ میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔اس طرح مصنف براہِ راست وعظ و نصیحت کرنے کے بجائے فنی انداز میں قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

اقبال مجید اس حقیقت پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کسی ایک مذہب یا طبقے کی مرہونِ منت نہیں تھی۔اس تاریخی حقیقت کو نظرانداز کر کے مسلمانوں کی حب الوطنی پر سوال اٹھانا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ان کے نزدیک آزادی کی تحریک میں ہندو اور مسلمان دونوں نے یکساں قربانیاں دیں،اس لیے کسی ایک طبقے کو شک کی نگاہ سے دیکھنا قومی یکجہتی کے لیے نقصان دہ ہے۔

افسانے کا سب سے مؤثر پہلو انور شمیم کی نفسیاتی کیفیت ہے۔وہ اپنے ہی گھر میں خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا۔اسے ہر وقت اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ اگر فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھا تو اس کے مکان کو کس طرف سے آگ لگائی جا سکتی ہے اور وہ کس طرح اپنے خاندان کو محفوظ رکھ سکے گا۔یہ احساسِ خوف اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے مکان کے بیرونی خد و خال تک پر غور کرنے لگتا ہے۔اسی سلسلے میں وہ اپنے گھر کے باہر لگی نام کی تختی کو غور سے دیکھتا ہے،جس پر'ڈاکٹر عائشہ انور' درج ہے۔وہ سوچتا ہے کہ آخر ایسا کیا کیا جائے کہ لوگ اس مکان کو صرف ایک مسلمان کا گھر نہ سمجھیں،بلکہ اس شخص کا گھر تصور کریں جس

نے تر ویدی کے تحریر کردہ ڈرامے ''آ کرمن'' کو اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ یہ منظر نہایت علامتی ہے۔ یہاں نام کی تختی صرف شناخت کی علامت نہیں بلکہ اس سماجی الیے کی نمائندہ بن جاتی ہے جس میں ایک شہری کو اپنی وفاداری اور حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے مسلسل دلائل پیش کرنے پڑتے ہیں۔

اقبال مجید اس علامت کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ قومی یکجہتی محض ثقافتی سرگرمیوں یا رسمی نعروں سے قائم نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لیے دلوں سے نفرت، تعصب اور عدمِ اعتماد کا خاتمہ ضروری ہے۔ جب تک معاشرہ ایک دوسرے کو مذہبی شناخت کے بجائے انسان کی حیثیت سے قبول نہیں کرے گا، اس وقت تک حقیقی بھائی چارہ قائم نہیں ہوسکتا۔

اقبال مجید کے افسانوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی تصویر کشی محض واقعاتی نہیں بلکہ گہری نفسیاتی اور علامتی معنویت کی حامل ہے۔ وہ فساد کے ظاہری مظاہر سے زیادہ اس کے ان اثرات پر توجہ دیتے ہیں جو انسانی شعور، احساسِ تحفظ اور سماجی رشتوں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فسادات کی سب سے بڑی تباہی یہ ہے کہ انسان زندہ رہتے ہوئے بھی خوف، بے یقینی اور عدمِ اعتماد کی ایسی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ ان کے افسانے ''سوختہ ساماں'' اور ''چیلیں'' اسی فکری جہت کے بہترین مظاہر ہیں۔

''سوختہ ساماں'' فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں جنم لینے والے خوف، دہشت اور نفسیاتی کرب کی نہایت مؤثر داستان ہے۔ اس افسانے کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں فساد کی ہولناکی کو خون ریزی یا قتل و غارت کے مناظر سے زیادہ انسانی ذہن کی داخلی کیفیت کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے۔ افسانہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ فساد ختم ہوجانے کے بعد بھی اس کے اثرات دیر تک انسانی شعور پر مسلط رہتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار اگرچہ اپنے مکان کو بلوائیوں کے حملے سے محفوظ پالیتا ہے، لیکن اس کی نفسیاتی کیفیت یہ ہے کہ اسے اپنا گھر بھی جلے ہوئے مکانوں کی طرح ویران اور تباہ دکھائی دیتا ہے۔ گویا فساد پہلے اس کے مکان پر نہیں بلکہ اس کے باطن پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو اقبال مجید نہایت سادگی مگر بھرپور اثر انگیزی کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''بیوی کے بہت اصرار پر صاحبِ خانہ اس کا دل رکھنے کے لیے چلا تو گیا، مگر اسے اپنے دروازے کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی جستجو نہ ہوئی۔ سوچا، جیسے سب جلے ہوئے دروازے ہوا کرتے ہیں، ویسا ہی وہ بھی ہوگیا ہوگا۔''

یہ اقتباس اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ فسادات کی حقیقی تباہی عمارتوں سے زیادہ انسان کے ذہن اور احساسات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ خوف اس شدت سے انسان پر غالب آجاتا ہے کہ محفوظ رہنے کے باوجود وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اقبال مجید نے اسی نفسیاتی کیفیت کو ایک اور مقام پر

انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے:

''سناٹا پورے دن ایک ایسی زبان بولتا رہا تھا جس کا اپنی اپنی زبان میں لوگ خاموشی سے ترجمہ کرتے رہے۔ پھر شام آئی۔ شام جیسی بھی تھی، شام تھی، کیوں کہ وہ دن سے نجات دلا رہی تھی اور رات میں بدلنے والی تھی۔ اور کیسی بھی رات ہو، جب دن بھر کے سناٹے کے بعد آتی ہے تو اس کا آنا غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔''

یہ اقتباس محض ماحول نگاری نہیں بلکہ ایک علامتی اظہار ہے۔ یہاں 'سناٹا' خود ایک کردار بن جاتا ہے، جو خوف، اضطراب اور بے یقینی کی زبان بولتا ہے۔ دن، جو عام حالات میں امید، حرکت اور زندگی کی علامت ہوتا ہے، اب خوف اور وحشت کی علامت بن گیا ہے، جبکہ رات، جو عموماً اندیشوں کی علامت سمجھی جاتی ہے، نسبتاً سکون کا احساس دلاتی ہے۔ یہ معنوی الٹ پھیر اقبال مجید کی فنی بصیرت کا ثبوت ہے۔

''چیلیں''، اقبال مجید کے ان نمائندہ افسانوں میں شامل ہے جن میں فسادات کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت، بے وطنی، عدمِ تحفظ اور ریاستی بے حسی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بچپن ہی میں اپنے والدین کے ساتھ جان بچانے کے لیے ایک ایسے شہر ہجرت کرتا ہے جہاں اسے مذہبی اکثریت کی وجہ سے تحفظ کی امید ہوتی ہے۔ ہجرت کا منظر نہایت دردانگیز اور حقیقت سے قریب تر ہے۔

''وہ لڑکا جب بیس برس کا تھا تو ایک رات اس کا باپ گھر کے دروازے کے دونوں پٹ آندھی کے جھٹکے کے ساتھ کھولتے ہوئے حواس باختہ اندر داخل ہوا۔ گھر کا ہر فرد جس حال اور جن کپڑوں میں تھا، اسی حالت میں باہر نکل آیا۔ لڑکے کو جرابیں اور جوتے تک پہننے کی مہلت نہ ملی۔ چولہے پر دم لیتی ہوئی کھچڑی کی ہانڈی ویسے ہی رہ گئی۔ عورتوں نے پلنگ پوش چادروں کی طرح اوڑھ لیے۔ بستر، الماریاں، صندوق، برتن، حتیٰ کہ گھر کا ایک ایک تنکا اپنی جگہ چھوڑ کر سب لوگ رات کے اندھیرے میں مسافروں کے ہجوم کے ساتھ ایک ریل گاڑی میں بھوسے کی طرح بھر دیے گئے۔''

یہ منظر تقسیم ہند کے لاکھوں مہاجرین کی اجتماعی یادداشت کو تازہ کر دیتا ہے۔ اقبال مجید یہاں محض ایک خاندان کی داستان نہیں سناتے بلکہ پوری نسل کے دکھ کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن افسانے کا المیہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بیس برس بعد، جب یہی لڑکا چالیس سال کا ہو جاتا ہے، اسی شہر میں اس کی آنکھیں نکال لی جاتی ہیں۔ اس سانحے کے بعد بھی ریاست کی طرف سے انصاف اور مؤثر کارروائی کے بجائے محض صبر و تحمل کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس طرح افسانہ نہ صرف فرقہ وارانہ تشدد بلکہ انتظامی بے حسی اور

حکومتی ناکامی پر بھی گہرا سوال اٹھاتا ہے۔

اقبال مجید کی بڑی فنی خوبی یہ ہے کہ وہ فسادات کا سارا بوجھ کسی ایک مذہب یا طبقے پر نہیں ڈالتے۔ ان کی نگاہ میں فرقہ واریت ایک پیچیدہ سماجی، سیاسی اور انتظامی مسئلہ ہے، جس کے مختلف اسباب ہیں۔ ''انوکھا گھر'' میں وہ مذہبی تعصب اور باہمی بداعتمادی کو موضوع بناتے ہیں، ''سوختہ ساماں'' میں خوف اور دہشت کی نفسیات کو اجاگر کرتے ہیں، جب کہ ''چیلیں'' میں ریاستی بےحسی، انصاف کی عدم دستیابی اور عام انسان کی بےبسی کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہی متوازن اور حقیقت پسندانہ رویہ اقبال مجید کو اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز بناتا ہے۔

اقبال مجید کے افسانوں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کی تخلیقی فکر محض فرقہ وارانہ فسادات کے واقعاتی بیان تک محدود نہیں، بلکہ وہ ان سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی عوامل کو بھی بےنقاب کرتے ہیں جو ایسے سانحات کو جنم دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تشدد اور نفرت کے پس منظر میں کارفرما سیاسی مفادات، سماجی بےحسی اور انسانی اقدار کی شکست کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے وقتی واقعات کی رپورٹ نہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

افسانہ ''سرنگیں'' اس اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں خوف، عدمِ اعتماد اور غیر یقینی صورتِ حال کو علامتی پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ''سرنگ'' محض ایک راستہ نہیں بلکہ اس تاریک معاشرتی فضا کا استعارہ ہے جس میں انسان اپنے وجود، شناخت اور مستقبل کے حوالے سے مسلسل اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ افسانے کے کردار اس سرنگ سے نکلنے کی کوشش تو کرتے ہیں، لیکن ہر موڑ پر انہیں نئی تاریکی، نئے خدشات اور نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس علامتی اسلوب کے ذریعے اقبال مجید یہ باور کراتے ہیں کہ فرقہ واریت انسان کو ایسی نفسیاتی سرنگ میں دھکیل دیتی ہے جہاں روشنی کی تلاش ایک مسلسل جدوجہد بن جاتی ہے۔

اسی طرح ''دسترس'' میں بھی انسانی بےبسی، معاشرتی انتشار اور طاقت کے غیر منصفانہ استعمال کی مؤثر عکاسی ملتی ہے۔ یہ افسانہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ جب معاشرہ انصاف، رواداری اور مساوات کے اصولوں سے دور ہو جاتا ہے تو عام آدمی کی دسترس اپنے بنیادی حقوق تک بھی باقی نہیں رہتی۔ اقبال مجید اس صورتِ حال کو کسی جذباتی انداز میں نہیں بلکہ نہایت متوازن، حقیقت پسندانہ اور فنکارانہ پیرایے میں پیش کرتے ہیں۔ یہی ان کے افسانوی فن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

فنی اعتبار سے اقبال مجید کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو اظہار کے نئے امکانات سے آشنا کیا۔ ان کے یہاں علامت، استعارہ، داخلی خود کلامی، مکالمہ اور منظر نگاری نہایت فطری انداز میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر سامنے آتے ہیں۔ وہ نہ تو غیر ضروری منظر کشی سے کام لیتے ہیں اور نہ

ہی جذباتیت کو اپنے فن پر غالب آنے دیتے ہیں۔ان کی زبان سادہ،شستہ،رواں اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہوتی ہے،جس کے باعث قاری افسانے کے ماحول میں پوری طرح جذب ہوجاتا ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اقبال مجید منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کے کردار کسی مخصوص نظریے کے ترجمان بننے کے بجائے اپنے عہد کے زندہ انسان معلوم ہوتے ہیں۔انور شمیم،رشمی،ترویدی، سوختہ ساماں کا صاحبِ خانہ اور''چیلیں'' کا بے نام نوجوان ایسے کردار ہیں جو اپنے انفرادی وجود سے آگے بڑھ کر پورے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی نفسیاتی کشمکش،خوف،امید،محرومی اور اضطراب قاری کو اپنے عہد کی تلخ حقیقتوں سے روبرو کراتے ہیں۔

اقبال مجید کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کا غیر جانب دار اور انسان دوست رویہ ہے۔وہ فرقہ وارانہ فسادات کے لیے کسی ایک مذہب یا طبقے کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتے، بلکہ ان اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں جو معاشرے میں نفرت،تعصب اور تشدد کو فروغ دیتے ہیں۔ان کے نزدیک فساد کا سب سے بڑا شکار انسانیت ہے،اس لیے ان کی تخلیقات کا بنیادی پیغام بھی انسان دوستی، باہمی احترام اور قومی یکجہتی ہے۔یہی فکری اعتدال ان کے افسانوں کو محض احتجاجی ادب بننے سے بچاتا ہے اور انہیں دیرپا ادبی اہمیت عطا کرتا ہے۔

اقبال مجید اردو افسانے کے ان اہم اور معتبر تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے سیاسی،سماجی اور تہذیبی مسائل کو نہایت فنی بصیرت کے ساتھ افسانے کا موضوع بنایا۔خصوصاً فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے سے ان کی تخلیقات اردو افسانے میں ایک منفرد اور قابلِ قدر اضافہ ہیں۔''انوکھا گھر''،''سوختہ ساماں''،''چیلیں''،''سرنگیں اور''دسترس'' جیسے افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ محض واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے پس منظر میں کارفرما نفسیاتی،سماجی اور تہذیبی عوامل کو بھی پوری گہرائی کے ساتھ آشکار کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں جہاں ظلم،خوف، بے وطنی،عدمِ تحفظ اور انسانی بے بسی کی مؤثر تصویر ملتی ہے، وہیں محبت، رواداری،قومی یکجہتی اور انسان دوستی کی روشن اقدار بھی نمایاں ہیں۔یہی فکری توازن اور فنی پختگی انہیں اپنے عہد کے ممتاز افسانہ نگاروں کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔بلا شبہ اقبال مجید نے اپنے منفرد اسلوب، گہری سماجی بصیرت اور انسان دوست فکر کے ذریعے اردو افسانے کی روایت کو نہ صرف وسعت بخشی بلکہ اسے نئے فکری اور فنی امکانات سے بھی ہم کنار کیا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Research Scholar
University P.G. Department of Urdu, Munger University, Munger.
9162446502G email : jimmymd786@gmail.com

● **بادل بھگت**

جوگندر پال کے افسانوں میں تہذیبی شناخت کی تلاش

۱۹۵۰ء کے بعد اردو افسانہ نگاری نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی حالات نے اردو افسانے کے موضوعات اور اسلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے محض واقعاتی بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل، داخلی کشمکش، تنہائی، بے یقینی اور بدلتے ہوئے سماجی رویّوں کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔

جوگندر پال اردو افسانہ نگاری کے اہم اور منفرد ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے ۱۹۵۰ء کے بعد اردو افسانے کو روایتی کہانی گوئی سے نکال کر جدید نفسیاتی گہرائی، تجرباتی اسلوب اور علامتی اظہار کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اگرچہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے، لیکن ان کی تخلیقات میں پروپیگنڈے کے بجائے انسانی نفسیات کی سچائی، فنی پختگی اور تخلیقی انفرادیت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے اثرات اگرچہ اس دور میں بھی موجود تھے، لیکن رفتہ رفتہ جدیدیت کے رجحانات نے اردو افسانے کو نئی سمت عطا کی۔ افسانہ نگاروں نے انسان کی باطنی دنیا، نفسیاتی الجھنوں اور وجودی مسائل کو زیادہ اہمیت دی۔ علامت، استعارہ اور تجریدی اسلوب کے استعمال میں اضافہ ہوا اور افسانے کے فنی امکانات میں وسعت پیدا ہوئی۔ جوگندر پال اسی ادبی فضا کے ایک اہم نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔

جوگندر پال ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو موجودہ پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں ایک محنتی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیشے کے اعتبار سے دکاندار تھے۔ جوگندر پال نے بچپن ہی سے زندگی کی سختیوں اور معاشرتی مسائل کو قریب سے دیکھا، جس کا اثر بعد میں ان کی شخصیت اور ادبی فکر پر نمایاں ہوا۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی، جہاں وہ ایک ذہین اور مطالعہ پسند طالب علم کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد وہ ہندوستان منتقل ہو گئے۔ انہوں نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۲ء تک کینیا میں شعبۂ تعلیم سے وابستہ رہے اور ایجوکیشن آفیسر کے منصب پر فائز رہے۔ بیرونِ ملک قیام کے دوران انہیں مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور معاشرتی رویّوں کا

مشاہدہ کرنے کا موقع ملا، جس نے ان کے فکری افق کو مزید وسعت عطا کی۔

۱۹۶۴ء میں ہندوستان واپس آنے کے بعد انہوں نے اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے ایس۔ بی۔کالج میں انگریزی کے پروفیسر، شعبۂ انگریزی کے سربراہ اور بعدازاں پرنسپل کے طور پر خدمات انجام دیں۔۱۹۷۸ء میں انہوں نے ملازمت سے استعفادے دیا اور دہلی منتقل ہو گئے، جہاں اپنی باقی زندگی مکمل طور پر ادبی تخلیق کے لیے وقف کر دی۔۲۰۱۶ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

جوگندر پال کی زندگی ہجرت، جدوجہد اور مسلسل تلاشِ ذات کی داستان ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان سے بھارت ہجرت کے نتیجے میں انہیں شدید مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں کینیا میں طویل قیام کے دوران جلاوطنی، نسلی امتیاز اور تہذیبی بیگانگی کے مختلف تجربات سے گزرنا پڑا۔ یہی تجربات بعد میں ان کے افسانوں میں بے وطنی، شناخت کے بحران اور انسانی وجود کی تنہائی کی صورت میں نمایاں ہوئے۔

جوگندر پال کی زندگی کے بارے میں ابوظہیر ربانی لکھتے ہیں:

> ''فکشن کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد جوگندر پال نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور فکر و فن کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی راہیں تلاش کیں۔ بچپن سے جوانی تک انہوں نے جن مشکلات کا سامنا کیا اور زندگی کو جس انداز میں دیکھا، اس سے بہت کم فنکار دوچار ہوئے ہوں گے۔ کینیا میں ان کی طویل جلاوطنی محض معاشی مجبوری کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس تجربے نے انہیں انسان اور انسانیت کو سمجھنے کا ایک نیا شعور عطا کیا، جس نے ان کی تخلیقات کو آفاقی جہت بخشی۔''

(ابوظہیر ربانی، جوگندر پال کی افسانہ نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء، ص:۱۱)

جوگندر پال اردو افسانہ نگاری کے جدید دور کے ان چند ممتاز تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اس صنف کو روایتی کہانی گوئی کی حدود سے نکال کر نفسیاتی گہرائی، وجودی آگہی اور فنی تجربات کی نئی منزلوں تک پہنچایا۔ تقسیمِ ہند کے بعد کے ادبی منظرنامے میں جہاں ترقی پسند تحریک کا غلبہ تھا، وہاں جوگندر پال نے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ وہ نہ تو خالص ترقی پسند تھے اور نہ ہی ''فن برائے فن'' کے نظریے کے علم بردار، بلکہ ان کی افسانہ نگاری انسانی نفسیات کی صداقت، ہجرت کے کرب اور جدید انسان کی تنہائی کو فنی پیرائے میں پیش کرنے کی ایک مسلسل کاوش ہے۔

جوگندر پال کا افسانوی سفر ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے ''دھرتی کا کال'' سے شروع ہوتا ہے، جس میں معاشرتی بے حسی اور انسانی المیوں کی جھلک نمایاں ہے۔ اس کے بعد ''میں کیوں

سوچوں'' (۱۹۶۲ء)، ''رسائی'' (۱۹۶۹ء)، ''مٹی کا ادراک'' (۱۹۷۰ء)، ''لیکن'' (۱۹۷۷ء)، ''بے محاورہ'' (۱۹۷۸ء)، ''بے ارادہ'' (۱۹۸۱ء)، ''کھلا'' (۱۹۸۹ء)، ''کھودو بابا کا مقبرہ'' (۱۹۹۴ء) اور ''بستیاں'' (۲۰۰۰ء)** جیسے افسانوی مجموعوں نے اردو افسانے میں ان کے مقام کو مزید مستحکم کیا۔ ان مجموعوں میں موضوعات، اسلوب اور فنی تکنیک کے اعتبار سے مسلسل ارتقا دکھائی دیتا ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں کا سب سے نمایاں موضوع انسان اور اس کی داخلی کشمکش ہے۔ ان کے کردار بظاہر عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کے احساسات، نفسیاتی پیچیدگیاں اور وجودی سوالات آفاقی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تقسیمِ ہند اور ہجرت کے تجربات نے ان کی تخلیقی فکر کو گہرائی بخشی، اسی لیے ان کے افسانوں میں بے وطنی، شناخت کے بحران، اجنبیت اور انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ بار بار موضوع بنتی ہے۔

انہوں نے علامتی اور تجریدی اسلوب کو کامیابی کے ساتھ برتا اور افسانے کو نئے فکری اور فنی امکانات سے روشناس کرایا۔ ان کے ہاں واقعہ اپنی ظاہری شکل سے زیادہ داخلی معنویت رکھتا ہے اور کردار اپنی نفسیاتی کیفیتوں کے ذریعے قاری کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ انسانی وجود اور اس کے پیچیدہ تجربات کی معنوی تعبیر بن جاتے ہیں۔

جوگندر پال کے متعلق چندنادتا نے اپنی انگریزی کتاب'' writer's in Context,Joginder paul the writely writer'' میں لکھا ہے کہ:۔

"Paul's fiction has often been seen as philosophical, more about ideas than a traditionally told story. While this may be true, it is important to understand what is at work in them. A widely read and travelled writer, he was known to be surrounded by books and magazines, in step with the latest critical and literary offerings both in Urdu and Western literatures."(Writers in Context: Joginder Paul, the Writerly Writer, edited by Chandana Dutta, Routledge, New York, 2022, p. 9.)

(جوگندر پال کے افسانوں کو اکثر فلسفیانہ نوعیت کا حامل سمجھا گیا ہے، یعنی انہیں روایتی انداز میں بیان کی جانے والی کہانی کے بجائے خیالات اور افکار سے زیادہ وابستہ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بات کسی حد تک درست ہے، لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان کی تحریروں میں اصل کارفرما عناصر کیا ہیں۔ جوگندر پال ایک وسیع المطالعہ اور کثیر السفر ادیب تھے۔ وہ ہمیشہ کتابوں اور رسائل سے گھرے رہتے تھے اور اردو اور مغربی ادب دونوں میں سامنے آنے والی تازہ ترین تنقیدی اور ادبی پیش رفتوں سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ جوگندر پال کے افسانوں کو محض فلسفیانہ یا تجریدی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان کی تحریروں میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقیقی تجربات اور انسانی شعور کی پیچیدگیوں کی بھرپور عکاسی بھی موجود ہے۔

جوگندر پال نے اپنے افسانوں میں انسان کے باطنی احساسات، نفسیاتی کیفیات اور زندگی کے پیچیدہ مسائل کو غیر معمولی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک افسانہ صرف واقعات سنانے کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی وجود، اس کے دکھ، اس کی امیدوں اور اس کی معنوی تلاش کو سمجھنے کا وسیلہ ہے۔ ان کے کردار عام انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو مختلف سماجی، ذہنی اور جذباتی مسائل سے دوچار ہیں، لیکن ان کے تجربات ایک وسیع انسانی تناظر اختیار کر لیتے ہیں۔

اسی وجہ سے جوگندر پال کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو محض بیانیہ فن کے بجائے فکری، نفسیاتی اور وجودی اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ بنا دیا۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے خارجی حقائق کے ساتھ ساتھ انسان کے باطن کی دنیا بھی پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، جو ان کے فن کو منفرد اور دیرپا بناتی ہے۔ جوگندر پال کے افسانوں میں انسانی باطن، نفسیاتی پیچیدگیوں اور تہذیبی شعور کی گہری جھلک ملتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان محض خارجی حالات کا اسیر نہیں بلکہ اپنے اندر ایک وسیع کائنات سموئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں داخلی تجربات، وجودی سوالات اور انسانی شعور کی پرتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

افسانہ ''رسائی'' جوگندر پال کے اہم افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے انسانی وجود، شعور اور تقدیر کے پیچیدہ رشتوں کو علامتی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کا راوی انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک غیر معمولی بصیرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان کا مستقبل دراصل اس کے اپنے وجود کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں بھگوان نہیں ہوں کہ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو جو ہے، مگر میں انسان کا مستقبل تاحدِ نظر بآسانی دیکھ سکتا ہوں۔ آدمی کا مستقبل اس کے اپنے اندر سے ہی باہر پھوٹتا ہے، جیسے بیج سے پھول اور کانٹے۔ میں چپکے سے لوگوں کے بطن میں جا پہنچتا ہوں اور وہاں ان کے ماضی سے مستقبل تک سبھی واقعات ایک بڑے فطری سلسلے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں، جیسے اجنتا کی گپھاؤں میں تصویروں کا واقعاتی تسلسل۔''

(جوگندر پال، ''رسائی''، 'جوگندر پال کے منتخب افسانے'، مرتبہ: نریندر

ناتھ سوز، ۱۹۸۷ء، ص: ۵۷-۵۸)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ جوگندر پال انسان کی تقدیر کو کسی خارجی قوت کے بجائے اس کی داخلی ساخت، شعور اور تجربات سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا ماضی، حال اور مستقبل ایک مربوط زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ یہی تصور ان کے افسانوں کو محض سماجی بیانیے سے بلند کر کے فلسفیانہ اور وجودی سطح پر لے جاتا ہے۔

جوگندر پال کے ہاں تہذیبی شناخت کا مسئلہ بھی نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا افسانہ ''کھودو بابا کا مقبرہ'' اس حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں تہذیبی، ثقافتی اور سماجی تبدیلیوں کے اثرات کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے مشرقی تہذیب اور جدید مغربی طرزِ فکر کے تصادم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شناختی بحران کو علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔

افسانے میں یہ احساس شدت سے موجود ہے کہ جدید تہذیب کی چمک دمک نے انسان کو اپنی تہذیبی جڑوں سے دور کر دیا ہے۔ جوگندر پال تہذیب کو محض ظاہری ترقی یا مادی آسائشوں تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ اسے انسانی اقدار، رسوم و رواج، اجتماعی شعور اور طرزِ احساس کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار اپنی تہذیبی وابستگی اور جدید زندگی کے تقاضوں کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کا شکار نظر آتے ہیں۔

''کھودو بابا کا مقبرہ'' ایک علامتی اور فکری افسانہ ہے۔ اس میں ایک ایسی بستی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جہاں غریب اور محروم لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کھودو بابا اس بستی کے لوگوں کے لیے محض ایک فرد نہیں بلکہ محبت، ہمدردی، رہنمائی اور انسانی رشتوں کی علامت بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہتا ہے اور ان کے لیے ایک روحانی سہارا بن کر سامنے آتا ہے۔

افسانے میں زندگی اور موت، حقیقت اور علامت، اور فرد اور معاشرے کے تعلق کو نہایت گہرے فکری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جوگندر پال اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ انسان جسمانی طور پر فنا ہو جاتا ہے، لیکن اس کی محبت، کردار اور انسان دوستی کی یادیں زندہ رہتی ہیں۔ یہی یادیں دراصل تہذیبی تسلسل اور انسانی ورثے کی بنیاد بنتی ہیں۔

افسانے کے اختتام میں بندو، شیدا اور کھودو بابا کے کردار ایک خاص علامتی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ بندو کا بار بار بھونکنا اور کھودو بابا کے قریب آ کر کھڑا ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ محبت اور وابستگی موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوتیں۔ شیدا کے مکالمے اور بندو کی حرکات اس احساس کو مزید گہرا کرتے ہیں کہ کھودو بابا اب ایک فرد نہیں رہے بلکہ اجتماعی یادداشت کا حصہ بن چکے ہیں۔

افسانے کے اختتام پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ کھودو بابا کی طویل آوارگی اور تلاشِ منزل اپنے انجام کو

پہنچ چکی ہے۔ وہ جس سکون اور ٹھہراؤ کی جستجو میں عمر بھر سرگرداں رہے، بالآخر اسے پا لیتے ہیں۔ یہی سکون دراصل انسان کی تہذیبی شناخت، اجتماعی وابستگی اور روحانی اطمینان کی علامت بن جاتا ہے۔

اس طرح ''کھودو بابا کا مقبرہ'' محض ایک کردار یا ایک بستی کی کہانی نہیں بلکہ تہذیبی ورثے، انسانی رشتوں اور اجتماعی شعور کی بقا کا استعارہ ہے۔ جوگندر پال نے اس افسانے کے ذریعے یہ باور کرایا ہے کہ تہذیب صرف عمارتوں، رسوم یا تاریخی یادگاروں کا نام نہیں بلکہ انسانوں کے درمیان قائم محبت، اعتماد اور باہمی رشتوں کا دوسرا نام ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں میں تقسیمِ ہند، ہجرت اور گھر کی مسلسل تلاش ایک بنیادی اور ہمہ گیر موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کردار جسمانی طور پر اگرچہ نئی سرزمینوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی روح، یادیں اور احساسات ہمیشہ اپنے ماضی اور اپنے اصل وطن سے جڑے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں گھر صرف ایک مکان نہیں بلکہ شناخت، وابستگی اور تہذیبی یادداشت کی علامت بن جاتا ہے۔

ہجرت کا تجربہ جوگندر پال کے لیے محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک مستقل نفسیاتی کیفیت ہے۔ ان کے کردار اپنے ماضی، اپنے شہر، اپنی گلیوں اور اپنے لوگوں کو فراموش نہیں کر پاتے۔ وہ نئے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہوئے بھی اپنے ماضی کے حصار سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ اسی احساسِ بے وطنی نے ان کے افسانوں کو ایک منفرد تہذیبی اور نفسیاتی جہت عطا کی ہے۔

افسانہ ''گرین ہاؤس'' اس حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں مولو نامی کردار اپنے آبائی گھر کی یادوں میں اس قدر گم ہے کہ زمان و مکان کی دوریاں بھی اس کے ذہن سے اس گھر کا نقش مٹا نہیں پاتیں۔ جوگندر پال لکھتے ہیں:

> ''لیکن مولو کے ذہن میں اپنے گھر کا تصور صرف اسی ایک گھر سے بندھا ہوا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ ہمالیہ کے کوہستانی سلسلوں سے کچھ ہی فاصلے پر واقع اُس چھوٹے سے میدانی شہر سیالکوٹ میں ایک پرانا سا مکان، جو اتنا بڑا تھا کہ برسوں کی دوری کے باوجود مولو کو ویسے ہی صاف دکھائی دیتا تھا، اور اتنا مضبوط کہ ابھی تک اس کے دل و دماغ میں جوں کا توں کھڑا تھا۔''
>
> (جوگندر پال، ''گرین ہاؤس''، مشمولہ: 'کھودو بابا کا مقبرہ'، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۱-۱۲)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ جوگندر پال کے نزدیک گھر محض اینٹ اور پتھر کا ڈھانچہ نہیں

بلکہ یادوں، جذبات اور تہذیبی وابستگیوں کا مرکز ہے۔ ہجرت کے بعد بھی انسان کے ذہن میں اپنے وطن اور اپنے گھر کی تصویر زندہ رہتی ہے۔ یہی تصویر اس کی شناخت کا حصہ بن جاتی ہے۔ ''گرین ہاؤس'' دراصل اسی تہذیبی یادداشت اور داخلی وابستگی کی کہانی ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں میں تہذیبی شناخت کا ایک اور اہم پہلو علامتی کرداروں اور استعاروں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ افسانہ ''عفریت'' اس کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں ''راون'' کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ کہانی ایک بچے کے معصوم سوال سے شروع ہوتی ہے، لیکن آہستہ آہستہ ایک گہری سماجی اور اخلاقی معنویت اختیار کر لیتی ہے۔

افسانے میں بیٹا اپنے باپ سے پوچھتا ہے:

''کیا راون کاغذ کا بنا ہوا تھا؟''

باپ جواب دیتا ہے:

''نہیں، کیوں؟''

بچہ پھر سوال کرتا ہے:

''تو پھر یہ لوگ ہر سال کاغذ کا راون کیوں جلاتے ہیں؟''

اور باپ خاموشی سے سوچنے لگتا ہے:

''میں اسے کیا بتاتا؟... کیونکہ اصلی راون ہر سال بچ کر نکل جاتا ہے۔''

(جوگندر پال، ''عفریت''، مشمولہ: کھلا، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۷)

اس مختصر مگر بامعنی مکالمے کے ذریعے جوگندر پال انسانی معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک راون صرف ایک اساطیری کردار نہیں بلکہ انسان کے اندر موجود غرور، لالچ، نفرت، خودغرضی اور اقتدار پسندی کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال راون کا پتلا جلانے کے باوجود برائیاں ختم نہیں ہوتیں، کیونکہ اصل راون انسان کے باطن میں زندہ رہتا ہے۔

افسانے کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ معاشرتی برائیوں کا خاتمہ محض رسمی اقدامات سے ممکن نہیں۔ جب تک انسان اپنے اندر موجود تعصب، نفرت، ظلم اور خود پسندی کو ختم نہیں کرتا، تب تک عفریت مختلف شکلوں میں زندہ رہے گا۔ اس اعتبار سے ''عفریت'' محض ایک علامتی افسانہ نہیں بلکہ انسانی نفس اور معاشرتی رویّوں پر ایک گہرا فکری تبصرہ بھی ہے۔

جوگندر پال کے یہ دونوں افسانے اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تہذیبی شناخت صرف

خارجی رسوم ورواج یا تاریخی ورثے سے وابستہ نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق انسان کے داخلی شعور، یادداشت اوراخلاقی اقدار سے بھی ہوتا ہے۔ ''گرین ہاؤس'' میں یہ شناخت ماضی اور وطن کی یاد کے ذریعے سامنے آتی ہے، جبکہ ''عفریت'' میں یہ انسانی کرداراوراخلاقی شعور کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

اسی لیے جوگندر پال کے افسانے آج بھی اپنے عہد سے آگے بڑھ کر قاری سے مکالمہ کرتے ہیں۔ نقل مکانی، شناخت کے بحران، تہذیبی انتشاراورانسانی اقدار کے زوال جیسے مسائل آج بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے ان کے زمانے میں تھے۔ ان کا فن ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ حقیقی وطن صرف جغرافیہ نہیں بلکہ یادوں، رشتوں، اقداراورانسانی شعور کا مجموعہ ہے، اور جب تک یہ عناصر زندہ ہیں، تہذیبی شناخت بھی زندہ رہتی ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں میں کردارنگاری ایک نمایاں فنی خصوصیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے اپنے کرداروں کو نہایت باریک بینی، نفسیاتی شعوراور تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کردار زندگی کے مختلف طبقوں، تہذیبی پس منظراور سماجی حالات سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک انسانی وجود کی پیچیدگی اور داخلی کشمکش ہے۔

جوگندر پال کے کردار محض افسانوی پیکر نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی خوشیاں، محرومیاں، خوف، امیدیں، ناکامیاں اور ذہنی الجھنیں قاری کو اپنے اردگرد کے لوگوں کی یاد دلاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کرداروں میں ایک فطری سچائی اور زندگی کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ وہ کرداروں کے ظاہری اعمال و افعال کے ساتھ ساتھ ان کے باطنی احساسات، نفسیاتی کیفیتوں اور لاشعوری محرکات کو بھی بڑی مہارت سے اجاگر کرتے ہیں۔

تقسیمِ ہند اور ہجرت کے تجربات نے جوگندر پال کے کرداروں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے بہت سے کردار شناخت کے بحران، بے وطنی کے احساس، تنہائی اور وجودی اضطراب کا شکار نظر آتے ہیں۔ یہ کردار صرف اپنے ذاتی مسائل سے نہیں لڑتے بلکہ بدلتے ہوئے سماجی اور تہذیبی حالات کے دباؤ کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں ایک طرح کی داخلی ٹوٹ پھوٹ اور فکری بے چینی دکھائی دیتی ہے جو جدید انسان کی علامت بن جاتی ہے۔

جوگندر پال کی کردارنگاری میں علامت اور حقیقت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے بعض کردار اپنی انفرادی حیثیت سے آگے بڑھ کر ایک وسیع انسانی تجربے یا فکری رویّے کی نمائندگی کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''کھودو بابا''، ''مولو'' اور ''عفریت'' جیسے کردار اور علامتیں محض ایک افسانے تک محدود نہیں رہتیں بلکہ انسانی زندگی کے وسیع تر معانی کو اپنے اندر سمو لیتی ہیں۔ یہی خصوصیت ان کے کرداروں کو اردو

افسانے کے یادگار اور منفرد کرداروں میں شامل کرتی ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی جوگندر پال کا مقام منفرد ہے۔ان کی زبان سادہ، رواں، شستہ اور فطری ہے۔ وہ مشکل اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں اور عام فہم الفاظ کے ذریعے گہرے اور پیچیدہ خیالات کو بیان کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ کے بجائے بے ساختگی اور فطری روانی ملتی ہے، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

جوگندر پال کے جملے عموماً مختصر، بامعنی اور اثر انگیز ہوتے ہیں۔ وہ غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی زبان میں ادبی لطافت اور فکری گہرائی ایک ساتھ موجود رہتی ہے، جس کے باعث ان کے افسانے بیک وقت عام قارئین اور سنجیدہ ناقدین دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ابوظہیر ربانی جوگندر پال کے افسانوی فن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''جوگندر پال کے افسانوں کا خمیر بہت زیادہ ابھرا ہوا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے کرداروں کی روح کے اندر جھانکتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ اپنے کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے دیتے ہیں۔ جوگندر پال کی کہانی کسی خاص نظریے کی تابع نہیں ہوتی۔انسانی دکھ کا احساس ہی کردار بن کر کہانی کے وجود میں پھلتا پھولتا ہے۔ وہ کہانی لکھنے کے بجائے اپنے کرداروں کی زندگی کو پڑھتے ہیں۔''
>
> (ابوظہیر ربانی، جوگندر پال کی افسانہ نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء، ص:۱۰۱)

یہ اقتباس جوگندر پال کے تخلیقی رویّے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ کرداروں پر اپنے نظریات مسلط نہیں کرتے بلکہ انہیں آزادانہ طور پر اپنی زندگی جینے اور اپنے تجربات بیان کرنے کا موقع دیتے ہیں۔اسی وجہ سے ان کے کردار مصنوعی یا نمائشی محسوس نہیں ہوتے بلکہ اپنی فطری شکل میں قاری کے سامنے آتے ہیں۔

اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے جوگندر پال نے اردو افسانے کو نئی جہتیں عطا کیں۔ان کا اسلوب علامتی، تجریدی اور نفسیاتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ کرداروں کے باطن میں اتر کر ان کے خوابوں، خوفوں، خواہشوں اور احساسات کی دنیا کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس تجربے کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مکالمہ نگاری، منظر کشی اور داخلی خود کلامی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

مکالے مختصر مگر معنی خیز ہوتے ہیں، منظر کشی میں غیر ضروری تفصیل کے بجائے تاثر اور فضا پر زور دیا جاتا ہے، جبکہ داخلی خود کلامی کے ذریعے کرداروں کی نفسیاتی کیفیتیں قاری پر منکشف ہوتی ہیں۔ ان تمام عناصر کے امتزاج سے ان کا اسلوب ایک منفرد ادبی شناخت حاصل کرتا ہے۔

جوگندر پال کا اسلوب محض کہانی سنانے کا وسیلہ نہیں بلکہ انسانی شعور کی گہرائیوں تک رسائی کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے قاری کو صرف تفریح فراہم نہیں کرتے بلکہ اسے سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے وجود پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

جوگندر پال کے افسانے برصغیر کی مشترکہ تہذیبی روایت، گنگا جمنی ثقافت اور انسانی رواداری کے آئینہ دار ہیں۔ تقسیمِ ہند اور ہجرت کے تلخ تجربات نے ان کی شخصیت اور فن دونوں پر گہرا اثر ڈالا، لیکن انہوں نے ان تجربات کو نفرت، تعصب یا انتقام کے بجائے انسان دوستی، محبت اور باہمی احترام کے تناظر میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مذہبی، ثقافتی اور سماجی تنوع کے باوجود ایک ایسی انسانی وحدت کا احساس ملتا ہے جو تمام تفریقوں سے بالاتر ہے۔

جوگندر پال کے ہاں تہذیب محض رسوم و رواج، تاریخی روایات یا ثقافتی مظاہر کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ انسانی تجربہ ہے جو محبت، رواداری، باہمی احترام اور مشترکہ انسانی اقدار سے تشکیل پاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مختلف مذاہب، ثقافتوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے کردار ایک دوسرے کے ساتھ انسانی رشتوں کی بنیاد پر جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی رویہ ان کی تہذیبی فکر کا بنیادی وصف ہے۔

ان کے افسانوں میں برصغیر کی گنگا جمنی تہذیب کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ تہذیب صدیوں کے تہذیبی اختلاط، باہمی میل جول اور مشترکہ ثقافتی ورثے کا نتیجہ ہے۔ جوگندر پال نے اپنے افسانوں میں اسی مشترکہ تہذیبی شعور کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کردار مذہبی یا نسلی شناخت سے پہلے انسان کے طور پر سامنے آتے ہیں اور یہی ان کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

ان کی افسانہ نگاری اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ تہذیب کی اصل روح انسان دوستی اور رواداری میں مضمر ہے۔ جب معاشرے سے محبت، برداشت اور احترامِ آدمیت کا جذبہ ختم ہونے لگتا ہے تو تہذیب بھی اپنی معنویت کھونے لگتی ہے۔ جوگندر پال اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کو اسی انسانی اور تہذیبی شعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

مختصراً، جوگندر پال اردو افسانے کے ان عظیم اور منفرد فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی بصیرت، گہرے مشاہدے اور وسیع انسانی شعور کے ذریعے اردو افسانہ نگاری کو نئی وسعتیں عطا

کیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں، ہجرت کا کرب، انسان کی داخلی کشمکش، سماجی ناہمواریاں، تہذیبی تبدیلیاں اورانسانی رشتوں کی پیچیدگیاں پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔

انہوں نے انسان کو محض ایک سماجی کردار کے طور پر نہیں بلکہ ایک حساس، متفکر اور مسلسل جدوجہد کرنے والی ہستی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے انسان محسوس ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے مسائل، سوالات اور اضطرابات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات اپنے زمانے کی حدود سے نکل کر آفاقی معنویت اختیار کر لیتی ہیں۔

جوگندر پال کی زبان سادہ، رواں اور عام فہم ہونے کے باوجود فکری گہرائی اور معنوی وسعت سے بھرپور ہے۔ ان کے اسلوب میں علامت، استعارہ، تجرید اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جو قاری کو غور وفکر پر آمادہ کرتا ہے۔ انہوں نے روایت اور جدت کے درمیان ایک ایسا تخلیقی رشتہ قائم کیا جس کے باعث ان کے افسانے محض واقعات کی کہانیاں نہیں رہتے بلکہ انسانی وجود، معاشرت اور زمانے کے مختلف پہلوؤں کی معنویت کو آشکار کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں انسان دوستی، رواداری، محبت اور بقائے باہمی کا جذبہ نمایاں طور پر موجود ہے، جو ان کے فن کو عالمگیر حیثیت عطا کرتا ہے۔ یہی عناصر ان کی تخلیقات کو عصری معنویت بھی بخشتے ہیں اور انہیں آج کے قاری کے لیے بھی اتنا ہی اہم بناتے ہیں جتنا وہ اپنے عہد میں تھے۔

جوگندر پال کی افسانہ نگاری اردو ادب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے جس نے اردو افسانے کو فنی اور فکری دونوں سطحوں پر مالا مال کیا۔ ان کی تخلیقات نہ صرف اپنے عہد کی ترجمان ہیں بلکہ آج بھی اپنی تازگی، معنویت اور فنی خوبیوں کے باعث قارئین اور ناقدین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ اردو افسانے کی تاریخ میں جوگندر پال کا نام ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ لیا جائے گا اور ان کا ادبی سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی، فکرانگیزی اور تخلیقی تحریک کا سرچشمہ بنا رہے گا۔

◀◀ ● ▶▶

Research Scholar
Department of Urdu
University of Jammu ,J & K
P. H . N. O .. 9622028736
E. Mail. bhagatbadal84@gmail.com

تبصرے

- نام کتاب:انوارعشق (غزلیہ دیوان)
صنف: شاعری
مؤلف: پیر طریقت حضرت علامہ ومولان سید شاہ حماد احمد صابری قادری رزاقی (مرحوم)
مرتب: محمد عباس حسین رضوی قادری (پوکھر یروی)
اشاعت اول: 1428ھ مطابق 2007
ناشر: سید مظاہر الحسن وجیہ قادری، داؤدنگر (بہار)
مبصر: اقبال حسن آزاد

''انوارِعشق'' حضرت علامہ مولانا سید شاہ احمد صابر قادری رزاقی (مرحوم) کا شعری مجموعہ ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں عشق کو ہمیشہ مرکزی مقام حاصل رہا ہے۔ یہی عشق کبھی مجازی پیرائے میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی حقیقی رنگ میں ڈھل کر تصوف و معرفت کی منزلوں کو روشن کرتا ہے۔ حضرت علامہ مولانا سید شاہ احمد صابر قادری رزاقی مظہر العالی کا شعری مجموعہ ''انوارِعشق'' اسی روحانی روایت کی توانا کڑی ہے، جس میں عشقِ حقیقی کی تجلیات، انسانی احساسات کی لطافت اور صوفیانہ واردات کی چمک ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

''انوارِعشق'' بنیادی طور پر غزلیہ دیوان ہے۔ اس میں ایک سو ایک غزلیں شامل ہیں۔ اس میں شامل کلام کلاسیکی غزل کی روایت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی عصرِ حاضر کے فکری اور روحانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ، شستہ اور رواں ہے، جو قاری کو بے تکلف اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف عشق و محبت کے جذبات کا آئینہ دار ہے بلکہ اس میں اخلاقی تربیت، صبر و رضا، توکل، اور انسانی قدروں کی پاسداری کا پیغام بھی نمایاں ہے۔

کتاب کے عنوان ہی سے واضح ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق محض انسانی جذبہ نہیں بلکہ ایک نورانی کیفیت ہے۔ یہ عشق بندے کو خالق سے جوڑتا اور اس کی روح کو منور کرتا ہے۔ متعدد اشعار میں وصال و فراق کی کیفیات دراصل روحانی سفر کی علامت بن جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تجھی کو میں نہاں پایا تجھی کو میں عیاں پایا   یہاں پایا وہاں پایا، جدھر پایا، جہاں پایا
اس کا ہی ذکر ہوتا ہے محفل میں بار بار   موسیٰ کو جس نے ایک جھلک سی دکھا دیا
خواجہ و قطب و غوث پہ تیرا کرم ہوا   تو نے نواز کر انہیں سب کا بنا دیا

بطور خانقاہی شخصیت، شاعر کی شاعری میں تصوف کی گہری چھاپ موجود ہے۔ اشعار میں ذکر، فکر، مجاہدہ اور فنا فی اللہ جیسے مضامین لطیف پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ تصوف واعظانہ نہیں بلکہ ذوقی اور وجدانی ہے۔ اشعار دیکھئے:

تمہیں عرش پر ہو تمہیں فرش پر ہو   مجھے اور ہی کچھ بتاتے ہو صاحب
دل کی دنیا دیکھئے میری منور ہو گئی   میں نے سن لی جب سے صابر ایک مستانے کی بات
زاہد نہ روک اپنا قدم راہ عشق میں   اب تو پہنچ چلا، ہوئی منزل قریب آج

کلام میں انسانی محرومیوں، جدائیوں اور زمانے کی بے ثباتی کا احساس بھی موجود ہے۔ بعض اشعار میں حالاتِ زمانہ پر لطیف انداز میں تبصرہ ملتا ہے، جو شاعر کے وسیع مشاہدے اور حساس دل کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

وہ ہوا مجھ سے خفا کس باعث   جھٹکا ہے میرا ہاتھ کس باعث
منتظر صبح سے تھا میں جس کا   غیر حاضر وہ رہا کس باعث
ہے وفادار تمہارا صابر   اس پہ کرتے ہو جفا کس باعث

شاعر کی حیثیت ایک روحانی پیشوا کی ہے، اس لیے ان کی شاعری میں اخلاقی اصلاح اور کردار سازی کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ وہ محبت، رواداری اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ اشعار دیکھئے:

زبان سادہ مگر پراثر ہے۔ مشکل تراکیب اور ثقیل الفاظ سے اجتناب کیا گیا ہے، جس سے کلام عام قاری کے لیے بھی قابلِ فہم ہو جاتا ہے۔ اشعار دیکھئے:

مقام حشر میں بھی دیکھو اس کو   سر محشر بھی ہے اس کی ادا شوخ
مری اس کی نبھے گی کہیے کیسے   میں ہوں خاموش وہ کرتا دغا شوخ
پڑھے گا جو بھی صابر مست ہوگا   ہوا ہر صفحہ اس دیوان کا شوخ

بحور اور اوزان کی پابندی، ردیف و قافیہ کی صحت اور مصرعوں کی روانی اس بات کا ثبوت ہیں کہ شاعر کلاسیکی شعری سرمائے سے بخوبی واقف ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تری خبر سے مری جا رہی ہے جاں قاصد   نہیں خبر نہیں کوئی یار کا نشاں قاصد

جو آیا خیریت کا یار کاغذ — نہ اس کو جانئے بیکار کاغذ
ذرا آنکھیں اٹھا کر دیکھ تو بھی — بنا خوش رنگ ہے زردار کاغذ

''انوارِعشق'' ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو روحانی واردات اور فکری پختگی کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔اس میں عشق کی روشنی قاری کے دل میں امید، یقین اور سکون کی شمع روشن کرتی ہے۔ یہ کتاب خانقاہی روایت اور اردو شعری سرمایہ کے درمیان ایک مضبوط پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعر نے اپنی روحانی وابستگی کو شاعرانہ اظہار کے ذریعے جس سلیقے سے پیش کیا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔کلام میں ایک دردمندی اور سوز ہے جو دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ تاثیر محض لفظی نہیں بلکہ داخلی تجربے کی دین ہے۔

اردو ادب میں جہاں ایک طرف جدید رجحانات کی یلغار ہے، وہیں ''انوارِعشق'' جیسے مجموعے کلاسیکی اور روحانی روایت کی بقا کا ثبوت ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف اہلِ تصوف بلکہ عام قارئین کے لیے بھی روحانی تسکین اور ادبی لطف کا سامان فراہم کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''انوارِعشق'' اپنے عنوان کی طرح واقعی عشق کے انوار سے منور ایک قابلِ قدر ادبی سرمایہ ہے، جو اردو شاعری کے سنجیدہ قارئین کے لیے باعثِ کشش اور فکر و وجدان کا سرچشمہ ہے۔

◂◂ ● ▸▸

- انجیر کا پھول......ایک انوکھا افسانوی مجموعہ

مبصر: اقبال حسن آزاد

ڈاکٹر خالدہ نسیم (اووک ویل ،کینیڈا) کا افسانوی مجموعہ ''انجیر کا پھول'' میرے پیش نظر ہے۔اس مجموعے میں سات افسانے اور ایک افسانچہ شامل ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ ایک گہرے روحانی، نفسیاتی اور وجودی تجربے کا عکاس ہے۔ دورانِ مطالعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنفہ نے محض کہانی سنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انسان کے باطن، عشقِ حقیقی، خودی کی تلاش اور روحانی ارتقا جیسے پیچیدہ موضوعات کو فنی انداز میں پیش کیا ہے۔اس مجموعے میں شامل افسانے عام افسانوں سے ہٹ کر ایک صوفیانہ اور علامتی فضا قائم کرتے ہیں۔

''شہرِ تمثیل'' اس مجموعے کا مرکزی اور سب سے زیادہ صوفیانہ رنگ رکھنے والا افسانہ ہے۔اس افسانے میں زہرہ نامی کردار اپنی داخلی بے چینی اور شناخت کی تلاش میں ایک روحانی سفر پر نکلتی ہے۔قونیہ (رومی کا شہر) اس کے لیے ایک علامتی مقام بن جاتا ہے جہاں وہ عشق، فنا اور خودی کے راز سمجھتی ہے۔ رومی اور شمس تبریز کے افکار اس کے ذہنی و روحانی ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اس افسانے

کا مرکزی خیال، خودی کی تلاش، عشقِ حقیقی اور خود کو کھو کر پانا ہے۔انسان کی اصل پہچان باہر نہیں بلکہ اس کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔اس افسانے میں مرکزی کردار زہرہ مراد کی داخلی کشمکش، خود شناسی کی جستجو اور رومی و شمس تبریز کے افکار سے متاثر روحانی سفر کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

زہرہ ایک متحرک اور ارتقا پذیر کردار ہے۔ابتدا میں وہ الجھن، تنہائی اور تلاش میں مبتلا ہے۔پھر روحانی تجربات سے گزرتی ہے اور آخر میں وہ ایک داخلی سکون اور ادراک تک پہنچتی ہے۔یہ تبدیلی بتدریج اور فطری انداز میں دکھائی گئی ہے، جو افسانے کی بڑی خوبی ہے۔اس افسانے میں گہری علامت نگاری، صوفیانہ فضا کی کامیاب تشکیل، داخلی کیفیات کی عمدہ عکاسی اور فلسفہ و ادب کا حسین امتزاج ہے

''وہ اور میں'' ایک نفسیاتی اور علامتی افسانہ ہے۔اس کہانی میں ایک پراسرار کردار ''وہ'' ہے جو اپنے ہی باطن، خوف اور خواہشات کی نمائندگی کرتا ہے۔اس افسانے میں ''دروازہ'' ایک علامت ہے...... یہ وہ موقع ہے جہاں انسان اپنی زندگی بدل سکتا ہے، مگر خوف اسے روک دیتا ہے۔انسان اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتا ہے، اور تبدیلی کا دروازہ بھی وہ خود ہی کھولتا ہے۔

افسانہ ''دھندلے سائے'' تنہائی اور ذہنی اضطراب کو بیان کرتا ہے۔ایک عورت شدید تنہائی اور بے چینی کا شکار ہے۔اس کی زندگی میں انتظار، محرومی اور خالی پن نمایاں ہے۔اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح تنہائی انسان کے ذہن کو خوف اور اندیشوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔یہ افسانہ یہ بتاتا ہے کہ انسانی تعلقات کی کمی انسان کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔

باقی افسانوں میں بھی ملتے جلتے موضوعات مختلف انداز میں پیش کیے گئے ہیں لیکن ہر افسانہ کسی نہ کسی داخلی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔کردار زیادہ تر تنہا، سوچنے والے اور حساس ہیں۔کہانیوں میں علامتیں بہت زیادہ ہیں۔یہ افسانے روایتی کہانیوں سے مختلف ہیں کیونکہ ان میں پلاٹ سے زیادہ خیال اور کیفیت اہم ہے۔ان افسانوں میں قاری کو اپنے سوالوں کا سیدھا جواب نہیں ملتا بلکہ وہ خود سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ہر افسانہ ایک اندرونی سفر ہے۔

مصنفہ نے اپنے افسانوں میں درج ذیل موضوعات کو مرکزی حیثیت دی ہے......خودی کی تلاش، عشق کا فلسفہ............مجازی سے حقیقی تک، تنہائی اور داخلی مکالمہ،
روحانی بیداری اور فنا کا تصور وغیرہ۔

افسانوں کی زبان نہایت ادبی، شاعرانہ اور علامتی ہے۔کئی مقامات پر نثر، شاعری کے قریب محسوس ہوتی ہے......مثلاً کردار کے باطن میں ابھرنے والی آوازیں اور روحانی مکالمے قاری کو ایک وجدانی

کیفیت میں لے جاتے ہیں۔

جملوں میں تصوف کی جھلک نمایاں ہے۔مکالمے کم مگر اثر انگیز اور معنی خیز ہیں۔

یہ افسانوی مجموعہ سنجیدہ اور فکری ادب کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ ان قارئین کے لیے خاص طور پر موزوں ہے جو تصوف، فلسفہ اور داخلی زندگی کے موضوعات میں دلچسپی رکھتے ہیں. یہ مجموعہ قاری کو صرف کہانی نہیں سناتا بلکہ سوچنے، محسوس کرنے اور خود کو تلاش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

- نامِ کتاب: صدیوں کا رقص

صنف: ناول

ناول نگار: شائستہ یوسف

صفحات: 570

قیمت: 799 روپے

سنِ اشاعت: 2025

ناشر: ریختہ پبلی کیشنز، نوئیڈا (اتر پردیش)

مصنفہ کا پتہ:

201، فوردھام ہاؤس، پیرس روڈ، بینسن ٹاؤن،

بنگلور–560046

مبصر: اقبال حسن آزاد

ناشر نے شائستہ یوسف کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''شائستہ یوسف اردو دنیا کی ایک شہرت یافتہ شخصیت ہیں۔معروف شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی، سماجی اور ثقافتی میدانوں میں بھی سرگرمِ عمل رہی ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں: گل خودرو (۱۹۸۴)، جس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں، سونی پر چھائیاں (۲۰۱۱) اور آبِ آئینہ (۲۰۲۲)، جو نظموں کے مجموعے ہیں۔ان کا کلام ریاست کی نصابی کتابوں میں بھی شامل ہے۔انہوں نے ۲۰۱۰ء میں محمود ایاز پر مونوگراف تحریر کیا، ۲۰۱۳ء میں وچناس کا کنڑ سے اردو میں ترجمہ کیا، اور ۲۰۱۹ء میں ساہتیہ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام TomorrowofTales کا اردو ترجمہ کیا۔ان کی کتاب اردو غزل کا نظم پر اثر زیرِ اشاعت ہے۔انہیں متعدد ادبی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے، جن میں کرناٹک اردو اکیڈمی ایوارڈ

(۱۹۴۸)، اردو اکیڈمی اعزاز (۲۰۱۰)، اردو شیدائی ایوارڈ، بنگلور (۲۰۱۴)، قرۃ العین حیدر ایوارڈ (۲۰۲۲ء) شامل ہیں۔ ٹمکور یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لاز (LLD) کی اعزازی سند سے بھی سرفراز کیا ہے۔''

کتاب کے فلیپ پر خالد جاوید اور م۔ن۔سعید کی گراں قدر آرا شامل ہیں، جبکہ مقدمہ شافع قدوائی نے تحریر کیا ہے۔

خالد جاوید لکھتے ہیں:

''شائستہ یوسف کی شناخت نثری نظم کے حوالے سے بے حد معتبر ہے۔ صدیوں کا رقص ان کا پہلا ناول ہے اور مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ واقعی ان کا پہلا ناول ہی ہے، کیونکہ اپنی تھیم، کردار نگاری اور پلاٹ کے اعتبار سے یہ ناول پختہ کاری کی عمدہ مثال ہے۔ اگر میں اسے اردو کا ایک اچھوتا ناول کہوں تو غلط نہ ہوگا۔''

م۔ن۔سعید کی رائے ہے:

''صدیوں کا رقص اردو فکشن میں ابھی تک نگاہوں سے اوجھل ایک باب کا بھرپور افتتاح ہے۔ عصری اردو فکشن میں اس ناول پر مدتوں گفتگو ہوتی رہے گی۔''

شافع قدوائی اپنے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''اس نوعیت کا ناول اردو میں شاذ ہی لکھا گیا ہے۔ شائستہ یوسف کا یہ ناول روایتی بیانیے کے مقبول اور مروجہ اسالیب کو فنی بلوغ کے ساتھ شکست دیتا ہے، جس کی پذیرائی ناگزیر ہے۔''

صدیوں کا رقص سائنس فکشن، فلسفہ، یوٹوپیا، ڈسٹوپیا، مصنوعی ذہانت، ٹیکنالوجی، تاریخ اور انسانی تہذیب کے باہمی رشتوں کو موضوع بناتا ہے۔ یہ عصرِ حاضر کے ان چند اردو ناولوں میں شمار کیے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے جو روایتی بیانیے سے آگے بڑھ کر سائنس، فلسفہ اور انسانی تہذیب کے مستقبل پر ایک سنجیدہ اور بامعنی مکالمہ قائم کرتے ہیں۔

شائستہ یوسف نے مصنوعی ذہانت، کارپوریٹ طاقت، تہذیبی ارتقا، یوٹوپیائی اور ڈسٹوپیائی تصورات جیسے پیچیدہ موضوعات کو محض نظری مباحث تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہیں ایک مربوط، تخلیقی اور فکری بیانیے میں ڈھال دیا ہے۔ ناول کے ابتدائی صفحات ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مصنفہ انسانی وجود، اختیار، آزادی اور مستقبل سے متعلق بنیادی سوالات اٹھانا چاہتی ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد یہ دکھانا ہے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں انسان اپنی شناخت، اخلاقی اقدار اور روحانی اساس کو کس طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ یہی وصف اس ناول کو محض سائنس فکشن کے دائرے سے نکال کر ایک فکری اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت عطا کرتا ہے۔

ناول کی زبان شستہ، رواں اور علمی وقار کی حامل ہے۔ فلسفیانہ مباحث کے باوجود اسلوب میں

ادبی لطافت برقرار رہتی ہے، جس کے باعث قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر فکری گہرائی عام قاری سے غیر معمولی توجہ اور ارتکاز کا تقاضا کرتی ہے، لیکن سنجیدہ ادب کے قارئین کے لیے یہی اس ناول کی اصل قوت ہے۔

خالد جاوید اور م۔ ن۔ سعید کی آرا بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ صدیوں کا رقص اردو سائنس فکشن کے افق کو وسعت دینے والی ایک اہم تخلیقی کاوش ہے۔ اس میں مستقبل کی محض تصوراتی دنیا پیش نہیں کی گئی بلکہ موجودہ انسانی صورتِ حال، ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے غلبے اور تہذیبی بحران پر گہری تنقید بھی کی گئی ہے۔

مختصراً، صدیوں کا رقص اردو ناول میں ایک خوش آئند اور قابلِ توجہ اضافہ ہے۔ یہ ناول محض ایک دلچسپ کہانی نہیں سناتا بلکہ اپنے عہد، ٹیکنالوجی، تہذیب اور انسان کے مستقبل پر نئے زاویہ نظر سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ توقع ہے کہ یہ تخلیق اردو میں سائنس فکشن اور فکری ناول نگاری کی روایت کو مزید استحکام بخشنے میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔

◀ ● ▶

- نامِ کتاب: شاہد جمیل: مکالمے اور بازگشت (انٹرویوز)

مرتب: ڈاکٹر اشرف النبی قیصر

پہلا ایڈیشن: اکتوبر 2025ء

صفحات: 216

قیمت: 449 روپے

مرتب کا پتہ: نیو عظیم آباد کالونی، صندل نگر، پٹنہ۔ 800006

رابطہ: 9430831832

مبصر: اقبال حسن آزاد

شاہد جمیل جدید شعراء کی فہرست میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب نثر نگار بھی ہیں۔ اب تک ان کی نو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ ماہیے، کہہ مکرنیاں اور دوہے بھی کہے ہیں۔ بچوں کے لیے نظمیں، کہانیاں اور ایک ناول بھی تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے فلمی گیت بھی لکھے ہیں۔ مزید برآں وہ ادبی رسالہ ''جدید اسلوب'' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔

ان کے فن اور شخصیت پر اب تک آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان پر خامہ فرسائی کرنے والوں

میں مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالمنان طرزی، شان بھارتی، ملیح بدر، سہیل اختر سہرامی، اشرف النبی قیصر اور ڈاکٹر اسلام عشرت کے نام شامل ہیں۔

ادبی انٹرویو نثر کی ایک اہم صنف ہے جس میں کسی ادیب، شاعر یا نقاد کی زندگی، فکر، فن اور ادبی نظریات کے بارے میں سوال و جواب کی صورت میں گفتگو کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے ادیب کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو اس کی تخلیقات سے پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے۔ ادبی انٹرویوز میں تخلیقی عمل، ادبی تحریکوں، سماجی حالات اور زبان و ادب کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ صنف تحقیق و تنقید کے لیے نہایت مفید سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس سے ادیب کے اصل خیالات براہِ راست معلوم ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں مختلف رسائل اور کتابوں کے ذریعے ادبی انٹرویوز کی ایک مضبوط روایت قائم ہو چکی ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب 'شاہد جمیل: مکالمے اور بازگشت' (انٹرویوز) کو اشرف النبی قیصر نے مرتب کیا ہے۔ اس کا انتساب اردو تحریک کے روحِ رواں اور آبروئے صحافت جناب ایس ایم اشرف فرید، مدیرِ اعلیٰ روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ کے نام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شاہد جمیل کی ادبی شخصیت، فکر، تنقیدی نظریات اور تخلیقی سفر کو سمجھنے کے لیے اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

''عرضِ مرتب'' کے تحت ڈاکٹر اشرف النبی قیصر لکھتے ہیں:

''یہ بات متواتر میرے مطالعے میں رہی ہے کہ شاہد جمیل سے لیے گئے انٹرویوز نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ ان کے پیش رووں اور ہم عصروں میں بہت کم ایسے شعراء ہیں جن کے اس نوع کے انٹرویوز میں نے پڑھے ہوں۔ میں نے غور کیا تو خیال آیا کہ کیوں نہ ان تمام مکالموں کو یکجا کر کے ایک کتاب مرتب کر دی جائے تا کہ علم و ادب کے قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔''

فہرست کے مطابق اس کتاب میں شاہد جمیل سے لیے گئے مختلف انٹرویوز، مکالمے اور تاثرات شامل ہیں، مثلاً:

شاہد جمیل سے مصاحبہ...... پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
شاہد جمیل اور ژرف گوئی...... پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
شاہد جمیل سے دو سوال...... پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
شاہد جمیل سے ایک طویل مکالمہ...... نثار احمد صدیقی
شاہد جمیل سے گفتگو...... ڈاکٹر سید احمد قادری
شاہد جمیل کے ساتھ ایک شام...... ڈاکٹر قیصر زاہدی

شاہد جمیل سے تفصیلی باتیں...... پروفیسر سید شبیہ الحسن
شاہد جمیل سے خصوصی بات چیت......ڈاکٹر محمد ارمغان ساحل سہسرامی
شاہد جمیل سے انٹرویو......شکیلہ سحر
شاہد جمیل سے دوٹوک سوالات رقیہ مظفر پوری
شاہد جمیل سے ایک ملاقات......ڈاکٹر اشرف النبی قیصر

اگر چہ تمام انٹرویوز دلچسپ اور معلوماتی ہیں، تاہم مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر شبیہ الحسن، قیصر زاہدی اور شار احمد صدیقی کے انٹرویوز خصوصی توجہ کے مستحق ہیں، کیونکہ ان میں شاہد جمیل کی شخصیت کے کئی پوشیدہ پہلو نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔ ان مکالموں میں وہ قاری کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

شاہد جمیل حاضر جواب اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی یادداشت بھی غیر معمولی ہے۔ دورانِ گفتگو انہوں نے کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں جنہیں پڑھ کر بے اختیار لبوں پر تبسم آ جاتا ہے، بلکہ بعض مقامات قہقہہ بار بھی ہیں۔ خصوصاً ''کتے والے واقعے'' کی پیش کش نہایت دلچسپ ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر شاہد جمیل انشائیہ نگاری میں باقاعدہ طبع آزمائی کریں تو اردو ادب کو ایک عمدہ انشائیہ نگار بھی میسر آ سکتا ہے۔

یہ کتاب ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی ہے، اس لیے اس طباعت، کتابت اور صوری حسن نہایت معیاری اور دیدہ زیب ہے۔

◂◂ ● ▸▸

- سہ ماہی ''زبان و بیان'' (معاصر افسانہ نمبر، جلد اول) معاصر اردو افسانے کی تازہ جہتیں

نام رسالہ: زبان و بیان (جموں و کشمیر)
جولائی تا دسمبر 2025
معاصر افسانہ نمبر (اوّل)
جلد: 1 -مشترکہ شمارہ 5-6
مدیر: ڈاکٹر جگ موہن سنگھ
سرپرست: ڈاکٹر شریعہ بخشی
صفحات-224

قیمت:400روپے

مبصر:اقبال حسن آزاد

اردو ادب کی روایت میں ادبی رسائل ہمیشہ تخلیقی اور فکری تحریک کے سرچشمے رہے ہیں۔ یہی رسائل نئی آوازوں کو سامنے لاتے اور ادبی رجحانات کی سمت متعین کرتے ہیں۔ جموں و کشمیر سے شائع ہونے والا سہ ماہی ادبی رسالہ ''زبان و بیان'' اسی سلسلے کی ایک معتبر اور سنجیدہ کاوش ہے۔ اس کا تازہ شمارہ ''معاصر افسانہ نمبر (اوّل)'' اردو افسانے کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے فکری و فنی امکانات کو سامنے لانے کی ایک اہم ادبی کوشش کے طور پر سامنے آتا ہے۔

اس شمارے کے مدیر ڈاکٹر جگ موہن سنگھ نے اداریے میں اردو افسانے کی روایت، اس کے فکری پس منظر اور اس کے عصری امکانات پر نہایت سنجیدہ اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ اداریے کا اسلوب محض تعارفی نوعیت کا نہیں بلکہ اس میں افسانے کی تہذیبی معنویت اور اس کے بدلتے ہوئے بیانیے پر ایک تنقیدی نظر بھی موجود ہے۔ مدیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جدید عہد میں افسانہ محض قصہ یا واقعہ نگاری کا نام نہیں بلکہ انسانی وجود کی پیچیدہ کیفیات، سماجی تضادات اور تہذیبی بحرانوں کی ترجمانی کا ایک موثر وسیلہ بن چکا ہے۔

اس شمارے میں شامل افسانوں کا تنوع اردو افسانے کی ہمہ جہتی کا احساس دلاتا ہے۔ یہاں مختلف نسلوں اور مختلف جغرافیائی خطوں سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقات یکجا ہوئی ہیں۔ ان افسانوں میں عصری زندگی کے کرب، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، معاشرتی ناانصافیوں اور تہذیبی تغیرات کی بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ کہیں جدید انسان کی تنہائی اور وجودی اضطراب کی جھلک ہے تو کہیں بدلتی ہوئی سماجی قدروں کے باعث پیدا ہونے والی بے یقینی کا احساس شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔

فنی اعتبار سے بھی یہ افسانے مختلف اسالیب اور بیانیاتی تجربات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بعض افسانوں میں حقیقت نگاری کی روایت اپنے پورے وقار کے ساتھ جلوہ گر ہے، جب کہ بعض میں علامتی اور استعاراتی اسلوب کے ذریعے عصرِ حاضر کے پیچیدہ تجربات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ تنوع اس بات کی علامت ہے کہ اردو افسانہ اب ایک محدود فنی سانچے کا پابند نہیں رہا بلکہ اس میں اظہار کے نئے امکانات مسلسل پیدا ہو رہے ہیں۔

رسالے میں کئی معروف اور معتبر افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں، جن میں نور شاہ، جیلانی بانو، وحشی سعید، علی امام، اسرار گاندھی، قمر جمالی، نور الحسنین، مشتاق احمد نوری، بشیر مالیر کوٹلوی، نگار عظیم، صدیق عالم، عبد الصمد، غضنفر، نعیمہ جعفری پاشا، طارق چھتاری، اقبال حسن آزاد، صادقہ نواب سحر، شبیر احمد اور دیگر اہلِ قلم شامل ہیں۔ ان ادیبوں کی موجودگی رسالے کی ادبی وقعت کو بڑھاتی ہے اور قاری کو

معیاری ادب فراہم کرتی ہے۔

افسانوں کے علاوہ فن افسانہ کے تعلق سے کئی اہم مضامین بھی شامل اشاعت ہیں، جن میں ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر علی عباس اور ڈاکٹر جگموہن کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔

رسالے کے مدیر ڈاکٹر جگموہن نے اداریے میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اس شمارے میں صرف سینیئر قلم کاروں کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ معاصر افسانہ نمبر دوم میں تازہ تخلیق کاروں کی نگارشات کو جگہ ملے گی۔

رسائل کی کامیابی میں مواد کے ساتھ ساتھ پیشکش بھی اہم ہوتی ہے۔ زبان و بیان کی ترتیب و تدوین میں سنجیدگی اور سلیقہ نمایاں ہے۔ سرورق سادہ مگر بامعنی ہے، جس میں قلم اور پر کا استعارہ تخلیق اور اظہار کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

کتاب کی طباعت صاف اور معیاری ہے، جبکہ فہرست اور ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر نے مواد کی تنظیم میں خاصی محنت کی ہے۔

یہ شمارہ اردو افسانے کی معاصر صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شامل افسانے نہ صرف فنی اعتبار سے اہم ہیں بلکہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے بھی عصرِ حاضر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ "معاصر افسانہ نمبر (اوّل)" اردو افسانے کے موجودہ رجحانات کا ایک بھرپور آئینہ ہے اور ادبی حلقوں میں اسے ایک قابلِ قدر اضافہ سمجھا جائے گا۔

مجموعی طور پر "زبان و بیان" کا یہ شمارہ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین اور محققین کے لیے ایک اہم سرمایہ ہے۔ مدیر اور مجلسِ ادارت نے جس محنت اور لگن سے اس شمارے کو مرتب کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ شماروں میں بھی یہی معیار برقرار رہے گا اور یہ رسالہ اردو افسانے کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔

◀◀ ● ▶▶

- نام رسالہ: سہ ماہی ''سیما''
  کتابی سلسلہ-16
  جنوری تا مارچ-2026
  مدیر: صغیر افراہیم

معاون مدیر: ثنا فاطمہ
صفحات:-312
قیمت: فی شمارہ:/Rs.250
زر سالانہ:Rs.1000
پتہ: خیابان ادب، 776 ثمر ہاؤس، نزد گل افراہیم، گلی نمبر 4/B،
دھرامعافی، علی گڈھ-202002
موبائل:9358257696
مبصر: اقبال حسن آزاد

سہ ماہی ''سیما''......ایک وقیع ادبی دستاویز

اردو کے ادبی منظر نامے میں ایسے رسائل کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے جو محض اشاعت نہیں بلکہ ایک فکری موقف، ایک تہذیبی شعور اور ایک ادبی ذمہ داری کا اعلان ہوں۔ سہ ماہی ''سیما'' کا تازہ شمارہ (جنوری تا مارچ 2026ء، کتابی سلسلہ نمبر 16) اسی سنجیدہ روایت کا امین دکھائی دیتا ہے۔ یہ شمارہ معروف ادیب کیدار ناتھ اگروال کے نام معنون ہے اور بجا طور پر ایک وقیع ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

مدیر صغیر افراہیم کا اداریہ محض رسمی کلمات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک باقاعدہ فکری بیانیہ ہے۔ اس میں کیدار ناتھ اگروال کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ اداریہ میں اعتدال، استدلال اور اخلاص کی وہ فضا موجود ہے جو کسی بھی معیاری ادبی جریدے کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ اداریہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ادب محض تخلیقی مشغلہ نہیں بلکہ سماجی شعور کی تعمیر کا ذریعہ بھی ہے۔

شمارے کا سرورق سادگی اور وقار کا حسین امتزاج ہے۔ کیدار ناتھ اگروال کی شبیہ محض ایک تصویر نہیں بلکہ ایک عہد، ایک نظریے اور ایک ادبی جہدِ مسلسل کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ رنگوں کی مدھم آمیزش اور ترتیب کی سلیقہ مندی رسالے کے باطنی مزاج کی پیشگی اطلاع دیتی ہے کہ یہاں شور نہیں، شعور بولتا ہے۔

گوشۂ کیدار ناتھ اگروال میں احسان آوارہ کا تحریر کردہ تعارف اور چار تراجم موجود ہیں۔ اور ساتھ ہی شبانہ رفیق کا مضمون ''کیدار ناتھ جی کی یاد میں'' شامل ہے۔

اس گوشے میں شامل مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شخصیت پرستی کے بجائے فکری تجزیے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیدار ناتھ اگروال کی شاعری کو محض جذباتی وابستگی کے تحت نہیں بلکہ اس کے لسانی، اسلوبیاتی اور نظریاتی تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں زمینی حقیقتوں کا ادراک، عوامی حسیت کی ترجمانی، ترقی پسند شعور

کی جھلک، اور علاقائی ثقافت کی خوشبو صاف محسوس ہوتی ہے۔ مختلف قلم کاروں نے ان پہلوؤں کو اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اجاگر کیا ہے، جس سے شمارہ یک رنگی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ایک فکری تنوع پیدا کرتا ہے۔

اس اہم گوشے کے علاوہ دو اور گوشے...... گوشۂ شہناز کنول اور گوشۂ مہر الٰہی ندیم بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ گوشۂ شہناز کنول میں نجمہ محمود، صبیحہ ناز لاری، شمع افروز زیدی اور عبید اقبال عاصم کے مضامین شامل ہیں جبکہ گوشۂ مہر الٰہی ندیم میں خواجہ محمد شاہد، ابوسفیان اصلاحی، ارتضٰی کریم، ابرار عبدالسلام، اسعد فیصل فاروقی اور ثنا فاطمہ کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ سبھی مضامین وقیع اور لائق مطالعہ ہیں۔

''سیما'' کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف تحقیقی مضامین تک محدود نہیں رہتا بلکہ افسانے، نظم، غزل اور دیگر اصناف کو بھی باوقار جگہ دیتا ہے۔ اس شمارے میں شامل تخلیقی تحریریں اس امر کی دلیل ہیں کہ رسالہ روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئے لہجوں اور نئے امکانات کا خیر مقدم بھی کرتا ہے۔ مشتاق احمد نوری، اکرم شیروانی اور عارف انصاری کے افسانے خوب ہیں جبکہ عارف حسن خاں، عالم خورشید، آصف اظہار علی، قدسیہ انجم علیگ، نیاز جیراج پوری ب، شاہد اختر، مرغوب اثر فاطمی کی شعری تخلیقات روح کو سرشار کرتی ہیں۔ عاصم شہنواز شبلی کی رباعیات ''صغیر نامہ'' بھی خوب ہیں۔ شعری اور نثری تخلیقات کا یہ حسین امتزاج رسالے کو محض یادگاری نمبر بننے سے بچاتا ہے اور اسے زندہ ادبی مکالمے کا حصہ بنا دیتا ہے۔

''کتابوں کی دنیا'' اور تنقیدی گوشوں کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ''سیما'' معاصر ادبی سرگرمیوں سے باخبر اور مربوط ہے۔ نئے مطبوعات پر سنجیدہ تبصرے قاری کو ادبی منظر نامے کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔

طباعتی معیار، ترتیب کی صفائی اور مواد کی منظّم پیشکش اس رسالے کی سنجیدہ مزاجی کو تقویت دیتے ہیں۔ صفحات کی ترتیب میں تسلسل اور موضوعاتی ربط نمایاں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مواد کو محض جمع نہیں کیا گیا بلکہ سوچ سمجھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔

''سیما'' کا یہ شمارہ محض ایک خصوصی نمبر نہیں بلکہ ایک تہذیبی دستاویز ہے۔ اس میں تحقیق کی گہرائی، تخلیق کی تازگی، تنقید کی سنجیدگی اور ادارت کی دیانت ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

یہ شمارہ کیدار ناتھ اگروال، شہناز کنول اور مہر الٰہی ندیم کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اردو دنیا میں سنجیدہ ادبی مکالمے کی روایت کو بھی مستحکم کرتا ہے۔ ایسے رسائل ہمارے ادبی افق پر چراغ کی مانند ہیں جو روشنی کم سہی، مگر مسلسل دیتے رہتے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

- نامِ رسالہ: جہانِ اردو (سلور جوبلی خصوصی شمارہ: دبستانِ عظیم آباد نمبر، حصہ اول وحصہ دوم)

حصۂ اول:

جلد:25

شمارہ:100-101

اکتوبر تا دسمبر 2025ء اور جنوری تا مارچ 2026ء

صفحات:حصۂ اول:688

حصۂ دوم:390

کل صفحات:1078

قیمت:600روپے (دو جلدیں)

مدیر: پروفیسر مشتاق احمد

پتا: محلّہ رحم گنج، پوسٹ لال باغ، دربھنگہ۔846004

رابطہ:9431414586

مبصر: اقبال حسن آزاد

کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اردو کا رسالہ نکالنا گویا پاگل پن ہے۔ میں اسے پاگل پن تو نہیں کہوں گا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایک جنون ہے، اور جب تک کسی کام میں جنون شامل نہ ہو، وہ شاہکار نہیں بن پاتا۔ پروفیسر مشتاق احمد بھی ایسے ہی ایک صاحبِ جنون مدیر ہیں۔۱۰۷۸صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں شائع ہونے والا ''دبستانِ عظیم آباد نمبر'' ان کے اسی علمی جنون کی زندہ مثال ہے۔

ان دونوں خصوصی شماروں میں نہ صرف عظیم آباد (پٹنہ) بلکہ متحدہ بہار کی ادبی روایت، اس کے شعرا، ناقدین، محققین اور تہذیبی وفکری خدمات پر نہایت جامع اور مستند مواد پیش کیا گیا ہے۔

جہانِ اردو کے ''دبستانِ عظیم آباد نمبر'' کے یہ دونوں خصوصی شمارے اس زرخیز ادبی روایت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جس نے شاد عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، مظہر امام، لطف الرحمٰن، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر وہاب اشرفی، قاضی عبد الودود، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، کلیم عاجز، شکیل الرحمٰن، غیاث احمد گدی، شبنم کمالی، ایس۔ ایم۔ عمر فرید، ابو الکلام قاسمی، قیصر شکروی، غلام سرور، سہیل عظیم آبادی، حسن نعیم، شاداں فاروقی، ذکیہ مشہدی، مشرف عالم ذوقی، محمد حسنین سید، اویس احمد دوراں اور متعدد دیگر اہلِ علم وادب کے ذریعے اُردو زبان وادب کو گراں قدر سرمایہ عطا کیا۔

ان دونوں شماروں میں مجموعی طور پر۶۴ مضامین شامل ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں تحقیقی وتنقیدی مضامین کو یکجا کرنا، ان کی ترتیب وتدوین کرنا اور پھر انہیں قرینۂ سلیقہ کے ساتھ زیورِطبع سے آراستہ کرنا یقیناً بڑے حوصلے، عزم اور محنت کا متقاضی ہے۔ تاہم یہ شمارے محض مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ دبستانِ عظیم آباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک جامع مرقع بھی ہیں۔

حصۂ اول میں دبستانِ عظیم آباد کی شعری روایت، غزل کے ارتقا، ممتاز شعرا کی فنی انفرادیت، زبان و بیان، تہذیبی شعور اور شخصی وفکری جہات پر تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ساتھ ہی دیگر اصناف سخن میں بھی بہار کی خدمات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ مختلف اہلِ قلم نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اس دبستان کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے، جس سے قاری کو عظیم آباد کی ادبی روایت کا ایک مربوط اور واضح تصور حاصل ہوتا ہے۔

حصۂ دوم اس سلسلے کو مزید وسعت دیتا ہے۔ اس میں تحقیق، تنقید، تاثرات، تاریخی مباحث، ادبی اسناد اور اہم شخصیات سے متعلق مضامین شامل ہیں، جن کے ذریعے دبستانِ عظیم آباد کے مختلف پہلو نہایت سنجیدگی اور علمی دیانت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ دونوں جلدیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور مل کر ایک ایسی وقیع علمی دستاویز کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، جس سے محققین، طلبہ اور ادب کے سنجیدہ قارئین یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

مدیر، پروفیسر مشتاق احمد، کی محنت، علمی بصیرت اور اداراتی صلاحیت قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے مختلف نسلوں کے محققین، ناقدین اور ادیبوں کو یکجا کر کے ایسا وقیع مجموعہ مرتب کیا ہے جو دبستانِ عظیم آباد کی ادبی شناخت کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ مضامین کی عمدہ ترتیب، موضوعات کا تنوع اور مجموعی علمی معیار اس خصوصی اشاعت کو غیر معمولی اہمیت عطا کرتے ہیں۔

اگر آئندہ اشاعتوں میں آخر میں اشاریہ، منتخب کتابیات، اہم شخصیات کا زمانی خاکہ اور نادر تصاویر کے ساتھ مختصر تعارف بھی شامل کر دیا جائے تو ان شماروں کی تحقیقی افادیت مزید بڑھ سکتی ہے۔

مجموعی طور پر جہانِ اردو کے ''دبستانِ عظیم آباد نمبر'' (حصۂ اول و حصۂ دوم) اردو صحافت اور تحقیقی ادب میں ایک نہایت اہم اور قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ یہ دونوں شمارے دبستانِ عظیم آباد کی ادبی روایت کو محفوظ کرنے، اس کی نئی تعبیر پیش کرنے اور آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کی ایک کامیاب، سنجیدہ اور لائقِ تحسین کوشش ہیں۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں یہ خصوصی شمارے ایک اہم حوالہ اور مستند علمی دستاویز کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔

- نامِ کتاب:صوتیات کے اصول

مصنف:سید شہاب حیدر

صفحات:122

قیمت:250روپے

اشاعت:2024

مصنف کا پتہ:C-2الریان انکلیو، بریاتو، رانچی-834009

حال مقام:دبئی

رابطہ:+971556186259

ای میل:ss_haider2@yahoo.com.in

ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر:اقبال حسن آزاد

سید شہاب حیدر ایک علمی و ادبی شخصیت کا نام ہے۔موصوف الفاتح یونیورسٹی ،ٹریپلی، لیبیا اور رانچی یونیورسٹی، رانچی میں انگریزی زبان کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔

اردو زبان کی تدریس اور لسانی مطالعے میں صوتیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ زبان کا اولین اظہار آواز کی صورت میں ہوتا ہے۔آواز ہی وہ بنیاد ہے جس پر زبان کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔سید شہاب حیدر کی کتاب ''صوتیات کے اصول''اسی اہم لسانی شعبے سے متعلق ایک مفید، جامع اور فکر انگیز تصنیف ہے،جس میں صوتیات کے بنیادی مباحث کو سادہ،منظّم اور علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے نہایت سادہ، رواں اور تدریسی انداز میں صوتیات کے بنیادی مباحث کو پیش کیا ہے،جس سے طلبہ،اساتذہ اور لسانیات کے شائقین یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب کا آغاز صوتیات کے تعارف سے ہوتا ہے جہاں صوت،صوتیات کی اقسام،اہمیت اور تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے بعد گویائی کا عمل،اعضائے نطق، زبان کی آوازیں،اردو کی صوتیاتی خصوصیات،صوتی بیان،صوتی نظام، صامت اور مصوت،فوقِ قطع خصوصیات اور مفصل کلام کی خصوصیات جیسے اہم موضوعات کو مرحلہ وار بیان کیا گیا ہے۔مصنف نے صوتیاتی اصطلاحات کی وضاحت مثالوں کے ساتھ پیش کی ہے جس سے موضوع کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔

کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں نظری مباحث کے ساتھ عملی پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا گیا

ہے۔اردو آوازوں کی ساخت،ان کی درجہ بندی اوران کے تلفظی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب محض نصابی ضرورت پوری نہیں کرتی بلکہ تحقیق کے ابتدائی مراحل میں بھی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

اسلوب علمی ہونے کے باوجود خشک نہیں ہے۔مصنف نے پیچیدہ لسانی مباحث کو عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ابواب کی ترتیب منطقی اور مربوط ہے جس سے قاری کو موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر''صوتیات کے اصول''اردو صوتیات کے میدان میں ایک اہم اور کارآمد کتاب ہے۔یہ نہ صرف طلبہ کے لیے معاونِ مطالعہ ہے بلکہ اساتذۂ اردو اور لسانیات کے محققین کے لیے بھی مفید ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔اردو زبان کے صوتی نظام کو سمجھنے کے خواہش مند افراد کے لیے یہ کتاب ضرور قابلِ مطالعہ ہے۔

◄◄ ● ►►

- نامِ کتاب:اندازِ سخن(شعری مجموعہ)
  شاعر:سلطان شمسی
  صفحات:200
  قیمت:300روپے
  سالِ اشاعت:2022
  ناشر:غضنفر جلال
  پتہ:پوسٹ برداہا،وایا کمتول ضلع مدھوبنی(بہار)۔847304
  موبائل:9534775330/7255914061
  مبصر:اقبال حسن آزاد

اردو شاعری کی روایت میں ایسے شعرا کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جو زندگی کے مشاہدات،سماجی مسائل،دینی اقدار اور انسانی جذبات کو سادہ مگر مؤثر پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔سلطان شمسی کا شعری مجموعہ''اندازِ سخن''بھی اسی روایت کی ایک قابلِ قدر کڑی ہے۔اس مجموعے میں غزلیں،نظمیں،نعت،منقبت اور قطعات شامل ہیں،جن سے شاعر کی فکری وسعت،فنی تنوع اور شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر احسان عالم(پرنسپل،الحراء پبلک اسکول،دربھنگہ)اور مصطفیٰ کمال پاشا(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی)کی گراں قدر آرا شامل ہیں،جبکہ بیک کور پر پروفیسر مشتاق احمد(سابق رجسٹرار،ایل۔این۔متھلا یونیورسٹی،دربھنگہ)کے تاثرات درج ہیں۔علاوہ ازیں کتاب کے

ابتدائی صفحات شاعر کے تعارف، ان کے تحریر کردہ پیش لفظ اور پروفیسر محمد آفتاب اشرف و ڈاکٹر ایم صلاح الدین کے مضامین سے مزین ہیں، جو اس مجموعے کی ادبی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہیں۔

سلطان شمسی بنیادی طور پر عوامی زندگی سے وابستہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تصنع اور لفظی بازی گری کے بجائے سادگی، خلوص اور جذبے کی صداقت نمایاں ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے مسائل، انسانی رشتوں کی نزاکتوں، اخلاقی اقدار اور معاشرتی رویّوں کو نہایت سہل اور دلنشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام عام قاری کے دل تک آسانی سے رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

مجموعے کی غزلوں میں عشق و محبت کے روایتی مضامین کے ساتھ عصری حسیت بھی جلوہ گر ہے۔ شاعر داخلی کیفیات، امید و یاس، وصل و ہجر اور زندگی کے نشیب و فراز کو سادہ مگر پراثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ نظموں میں سماجی شعور، قومی احساس اور اصلاحی فکر نمایاں ہے، جبکہ نعتیہ کلام میں محبتِ رسولؐ، عقیدت اور روحانی وارفتگی کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ''اندازِ سخن'' ایک رواں، سلیس اور عام فہم شعری مجموعہ ہے۔ شاعر نے ثقیل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے اظہار کی سادگی کو ترجیح دی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر فنی پختگی اور شعری تراش خراش کی مزید گنجائش محسوس ہوتی ہے، تاہم مجموعی طور پر کلام میں خلوصِ احساس، فکری صداقت اور جذبے کی حرارت قاری کو متاثر کرتی ہے۔

''اندازِ سخن'' سلطان شمسی کی شعری کاوشوں کا ایک خوب صورت اور قابلِ مطالعہ اظہار ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف شاعر کے تخلیقی سفر کا آئینہ دار ہے بلکہ اردو شاعری کے سنجیدہ قارئین کے لیے بھی دلچسپی اور استفادے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور شاعر کی ادبی شناخت کو مزید مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

◀◀ ● ▶▶

ادب میں اہمیت اس بات کی نہیں ہوتی کہ کون کتنا سینئر ہے یا کب سے لکھ رہا ہے، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ اس کی تخلیق کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے اور آیا وہ فن کے بنیادی تقاضوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اقبال حسن آزاد

''ثالث'' پر تبصرے

● **ثناء اللہ ثناء دوگھروی**

اپنوں کو یاد کرنا بھی زندہ دلی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور زندہ لوگ ہی اپنوں کو یاد کرتے بھی ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات اور نیک فال بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں بھی اپنوں کو یاد کرنے کا ایک سلسلہ چلا آ رہا ہے جسے ادب کی توانا روایت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا 'مر جانے کے بعد ہزاروں لکھتے ہیں افسانے لوگ'۔ ٹھیک ہے، کسی حد تک ان کا موقف بھی درست ہے لیکن مر جانے کے بعد بھی مرنے والوں کو ان کے کارناموں کے ساتھ یاد کرنا اور انہیں سراہنا بھی کچھ کم بڑی بات نہیں، وہ اس لیے کہ آج بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ اہم کارنامے انجام دے کر دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے لیکن انہیں آج یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے میں ان کے کارناموں پر وقت اور حالات کی گرد کی موٹی پرت جم جاتی ہے جس کی طرف جلد کسی کی نگاہ نہیں جاتی جو المیہ سے کم نہیں۔ ایسے میں اگر کوئی کسی کو یاد کرتا ہے اور اس کارناموں کو سامنے لاتا ہے تو اسے یقینی طور سے سراہا جانا چاہئے۔ ایسے لوگوں کو یاد کرنے کے کئی طریقے ہیں جن میں ہمارے ادبی رسائل کا بھی اوائل سے ہی اہم کردار رہا ہے اور اہم شخصیات پر رسائل میں نمبر یا گوشے شائع کیے جاتے رہے ہیں جن میں ان کے ذریعہ کی گئی خدمات اور ان کی مختلف جہتوں کو سامنے لایا جاتا ہے تا کہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ کارنامے مشعل راہ ثابت ہوں۔

پیش نظر رسالہ ''ثالث'' (جلد نمبر:۲۱۔ شمارہ:۳۱ سے ۳۴) بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے جس نے معروف شاعر و ادیب طارق متین پر گوشہ شائع کر کے اس خوب صورت روایت کو کامیابی کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھانے کا مستحسن کارنامہ انجام دیا ہے۔ ۴۰۳۔ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم شمارہ ہے، جس کا سرورق بھی کافی دیدہ زیب ہے۔ سرورق پر طارق متین کی ایک تصویر ہے جو اپنے آپ میں ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے ایک پوری کہانی بیان کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رسالہ کی پشت پر 'اس شمارے کے قلم کار' کے عنوان سے بیس نامور اور معتبر شعرا و ادبا کی تصاویر ان کے نام کے ساتھ ہیں جن کی تخلیقات اس شمارے میں کسی نہ کسی طور پر شامل کی گئی ہیں۔ 'ثالث' روز اول سے ہی معیاری اور صحت مند ادب کا ترجمان رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رسالے نے کبھی اپنے معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس میں ان ہی چیزوں کو شامل کیا جاتا ہے

جو کسی نہ کسی صورت اس کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور جس سے ایک تندرست و توانا ادب کی تصویر سامنے آتی ہے۔ اس معاملے میں مدیر ثالث آفاق صالح، نائب مدیر نشاط پروین اور مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی کاوشوں سے اس قدر معیاری، عمدہ اور 'زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان' رسالہ منظر عام پر آپاتا ہے اور ادب کے قارئین کی تشنگی کو بجھانے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ پیش نظر شمارہ بھی اپنے معمولات کے مطابق ہی تمام مشمولات کے جواہر پارے اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ ہاں اس کی نوعیت عام شماروں سے اس لیے ممتاز ہے کہ اس میں اپنے عہد کے معروف شاعر و ادیب طارق متین کے تعلق سے 'گوشۂ طارق متین' کی شمولیت ہے جس میں طارق متین کی ادبی خدمات کے حوالے سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس گوشہ کو کم و بیش سو صفحات سے زائد دیے گئے ہیں۔ اس ضخیم رسالے میں گرچہ یہ گوشہ کے نام سے یا دکیا گیا ہے ورنہ تو بہت سے رسالوں کا اس سے کم میں بھی خصوصی نمبر شائع ہو جاتا ہے۔

اس شمارے کے اداریے میں جہاں اردو کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے وہیں اس رسالے، اس کے مشمولات اور خاص طور سے گوشۂ طارق متین اور اس کے حوالے سے مختصر اور جامع گفتگو کی گئی ہے اور اس شمارے کے تعلق سے خاص طور گوشہ طارق متین کے حوالے سے پروفیسر صفدر امام قادری کے تعاون کو مدیر کے ذریعہ بھرپور انداز میں سراہا گیا ہے جسے خوش آئندہ کہا جائے گا اور ایسے کاموں میں تعاون کرنے کا آئندہ اوروں کو بھی حوصلہ ملے گا۔

اداریے کے بعد مشمولات کی ابتدا طارق متین کی حمد اور ماہر القادری کی نعت پاک سے ہوتی ہے۔ حمد کا پہلا شعر اس طرح ہے:

خلوت دل ہے تری قریۂ جاں تیرا ہے　　　جس میں محفوظ ہوں میں کنج اماں تیرا ہے

اس کے بعد ماہر القادری کی معروف نعت پاک جس کی ابتدا کچھ یوں ہوتی ہے کہ:

سلام اس پر کہ جس نے بےکسوں کی دستگیری کی　　　سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

حمد و نعت کے بعد اپنے عہد کے معروف اور اپنے طرز کے حوالے سے منفرد شناخت رکھنے والے شاعر خورشید اکبر اور ارشد عبدالحمید کی متواتر کئی غزلیں شامل اشاعت کی گئی ہیں جس سے ان حضرات کی شاعری کے مختلف زاویے روشن ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ریشا قمر کی ایک آزاد نظم بعنوان ''محبت سیکھ لیں'' ہے۔ یہ نظم بھی معیاری ہے اور اپنے دامن میں معنویت کا اک جہان رکھتی ہے۔ ان مشمولات کے بعد یہاں سے طارق متین کے حوالے سے باتیں شروع ہوتی ہیں جس میں پہلے طارق سے ڈاکٹر تسلیم عارف کا طویل انٹرویو ہے، جس کا عنوان ہے'' ادیبوں اور شاعروں کو ہم عصر تقاضوں کے تحت اپنی تخلیقات کو ڈھالنا ضروری

ہے:طارق متین'' ،طارق متین سے ڈاکٹر تسلیم عارف کی خصوصی گفتگو' ۔عنوان کے نیچے باکس میں یہ وضاحت ہے''تسلیم عارف نے طارق متین کا یہ انٹرویو۲۰۲۱ء میں لیا تھا، جب وہ پٹنہ میں قیام پذیر تھےاور اپنا رسالہ 'علم وادب' دوبارہ نکالنا شروع کیا تھا۔'' چونکہ یہ انٹرویو کافی طویل ہےاس سبب سے اس میں طارق متین کے حوالے سے،ان کی خدمات اوران کی ذاتی زندگی کے تعلق سے بھی قاری کے علم میں بہت اضافہ ہوتا ہے،جس میں طارق متین کی پیدائش،ان کے والد،بہن، بھائی،اہلیہ اور بچے،ان کی تعلیم وتربیت،ان کی شاعری کی ابتدائی کیسے ہوئی، ان کے خانوادے میں کیاان سےقبل بھی شعری روایت رہی ہے،ان کے کلام ابتدائی زمانے میں کن کن رسائل میں شائع ہوئے، کیا وہ اردو ادب کی کسی تحریک سے وابستہ ہوئے،ان کی شاعری پر کسی تحریک کا اثر ہے یا نہیں،قدیم اور جدید شاعروں میں ان کے پسندیدہ شاعر کون ہیں،عرفان صدیقی کے یہاں کیا چیز انہیں متاثر کرتی ہے،ان کی شاعری پر کن شعراء کے اثرات ہیں،وہ خود اپنے آپ کو کس قبیل کے شعرا میں شمار کرتے ہیں،سیاست کے حوالے سے ان کی کیا رائے ہے،مونگیر میں ان کی علمی وادبی سرگرمیاں کیا رہی ہیں،ان کے پسندیدہ ناقدین کون ہیں،مدیر کی حیثیت سے وہ کن تحریروں کو آئیڈیل مانتے ہیں،شمس الرحمٰن فاروقی سےلڑائی کا کیا سبب ہوا،ہم عصر ناقدین میں انہیں کون کون ناقدین اچھے لگتے ہیں،موجودہ ادبی صورت حال خاص کر شاعری کے حوالے سے وہ اپنا کیا تاثر رکھتے تھے، یہ اوران جیسے کئی دیگر اور بھی سوالات کے مفصل جواب اس انٹرویو ملتے ہیں۔کسی سے انٹرویو لینا بھی ایک بڑا فن ہےاور یہ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی ،صرف دورچار عامیانہ سوالوں کے جواب حاصل کر لینا انٹرویو نہیں کہلاتااور اگر بفرض محال اسے انٹرویو کے زمرے میں رکھا بھی جائے گا تو ادب میں اس کی کوئی اہمیت اور معنویت نہیں ہوگی۔انٹرویو لینے والے کوبھی بڑی صلاحیتوں والا ہونالازمی ہےاوراسی کے ساتھ اس کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ جس شخص کا انٹرویو لے رہا ہےاس کے اندرون میں جا کر اپنی مرضی کے سوالوں کے جواب حاصل کرلےاور جس کا انٹرویو لے رہا ہے اسے اس کا جواب دینے پر مجبور کردے۔دراصل یہی چیز کسی انٹرویو کی روح کہلاتی ہے۔پیش نظر انٹرویو اس طرح کیا وصاف سے مزین وآراستہ نظر آتا ہےاورانٹرویو لینے والے نے طارق متین سے بہت سے سوالات کرکے اردو ادب کے عام قارئین کے لئے ڈھیروں معلومات کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔یہ تسلیم عارف صاحب کا بڑا کمال ہے۔کوئی قاری صرف اس انٹرویو کا مطالعہ کرلےتو اسے طارق متین کی زندگی،ان کی ادبی خدمات اور ادب کے حوالے سے ان کے افکار ونظریات کے متعلق بہت ہی اہم معلومات حاصل ہو جائیں گی۔یہی وجہ ہے کہ پیش نظر شمارے میں طارق متین کے حوالے سے یہ انٹرویو اپنی اہمیت آپ بتاتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔

انٹرویو کے بعد پروفیسر صفدر امام قادری صاحب کے دو کافی وقیع مضامین ہیں جو قاری کو بہت کچھ

دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پہلا مضمون ایک یادنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا عنوان ہے ’’بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغ آرزوٗ دوست طارق متین کی یاد میں‘‘ ۱۷ صفحات میں پھیلا ہوا کافی طویل مضمون ہے جس میں صفدر صاحب نے اپنے دوست طارق متین کے حوالے سے بہت سی یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس وجہ سے یہ مضمون بڑا جذباتی بھی ہو گیا ہے، کہیں تو ایسا موقع بھی آتا ہے کہ مطالعے کے دوران قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہ صفدر امام قادری صاحب کے طارق متین سے جذباتی لگاؤ اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار اوقات اور ان اوقات میں شعر و ادب کی محفل اور اسی نوعیت کی ان دونوں صاحبان کی گفتگو، گنگا کنارے کی سیر، اس کے بعد گرین ٹی اور پھل بسکٹ کا ہلکا ناشتہ اور خوش گپیاں، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے سبب بھی یہ مضموا پنی امتیازی شان رکھتا ہے۔ مضمون طارق متین کی زندگی، ان کے افکار اور انداز و اطوار کے حوالے سے بہت ہی معلومات اور بہت سی روشن یادیں جنہیں شاید کبھی بھلایا نہیں جا سکتا کے جواہر پارے اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ مجموعی طور سے اس مضمون میں ایک الگ طرح کی دردمندانہ فضا قائم ہے اور پورا مضمون ہی ایک طرح سے اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے، جو قاری کو بھی اپنے حصار میں لیے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہوں دو اقتباسات:

’’میں دوست کے آخری دیدار کے لئے صبح سویرے لکھمنیا جانے کا فیصلہ کیا۔ رات بھر ۳۰۔۳۵ برس کی رفاقتوں کے شب و روز چین نہ لینے دیتے رہے۔ ہزاروں واقعات، طارق متین کی ادائیں، ہم لوگوں کی آپسی نوک جھونک اور ایک ساتھ زندگی کے خواب اور تمناؤں کی تعبیر تلاش کرنے کی مہمات میں الجھتا رہا۔ آنکھیں بند ہیں مگر ۸۹۔۱۹۸۸ سے لے کر اب تک کی زندگی بداماں واقعات لہراتے رہے۔‘‘ (ص:۱۴)

’’......تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر چل کر طارق متین کے گھر پہنچا۔ میت کو غسل دینے کا عمل آنگن میں چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے والد بزرگوار سے اجازت لے کر اپنے دوست کو آخری بار دیکھ لینے کے لئے گھر کے آنگن میں پہنچا تو طارق متین اسی طرح سفید لباس میں مجسم تھا جیسے وہ ہم سب کے بیچ ہمیشہ ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے پہ کوئی شکن نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ بے شکن لباس طارق متین کے لئے آخری لباس تھا۔ میں نے ایک پہلو سے ہی چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی کہ اس سے زیادہ کچھ اور حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔‘‘ (ص:۲۴)

یہ مضمون طارق متین کی زندگی اور صفدر امام قادری صاحب کے ان کے دوستانہ تعلقات و روابط کے حوالے سے بہت سے اہم واقعات کے بیش قیمتی موتی اپنے دامن میں رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اس گوشے میں صفدر صاحب کے اس مضمون کی اپنی جگہ مسلم ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ انٹرویو اور صفدر صاحب کا یہ مضمون گوشہ کی جان ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

’’بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغ آرزوٗ‘‘ کے بعد صفدر امام قادری صاحب کا ہی دوسرا مضمون بعنوان

''ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں: عہد نو اور شعر تازہ یعنی ریاضتیں طارق متین کی'' اپنی شاندار موجودگی درج کراتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور مطالعے سے تعلق رکھتا ہے جس میں مضمون نگار نے طارق متین کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کی ہے، جس میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعری کس انداز کی ہے اور اس میں کیا کیا کچھ ہے، اب تک طارق متین کی شاعری پر کیا کچھ کام ہوا اور جو کام ہوا ہے وہ کس نوعیت کا ہے کیا ان کاموں سے طارق متین کی شاعری کے تنقیدی مطالعے کا حق ادا ہوجاتا ہے۔ اس حوالے سے اس مضمون میں صفدر صاحب نے کئی اہم سوالات کئے ہیں، تمام سوالات تحریر کرنے کا یہاں محل تو نہیں ہے پھر بھی چند سوالات یہ ہیں کہ طارق متین کے شعری امتیازات کے کون کون سے خاص پہلو ہیں، اپنے ہم عصروں سے وہ کن باتوں میں مختلف ہیں، کیا طارق متین نے غزل کی کوئی نئی زبان ایجاد کی ہے، کیا طارق متین نے اپنا کوئی نیا شعری استعاراتی نظام قائم کیا، جس سے انہیں الگ سے پہچانا جاسکے، کیا طارق متین کے یہاں کوئی ذاتی شعری فلسفہ یا فکری نظام مرتب ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے کئی دیگر سولات قائم کرکے صفدر صاحب نے اس مضمون میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ طارق متین کی شاعری کے حوالے سے جب ان سوالوں کے پیش نظر کام نہیں ہوتا اور اس نہج پر جب ان کے کلام کا تنقیدی مطالعہ پیش نہیں کیا جاتا ہے اس وقت ان کی شاعری کی تنقید کا کما حقہ حق ادا نہیں ہوسکتا۔ یہ مضمون اور اس میں قائم کئے گئے سوالات طارق متین کی شعری کائنات کا تنقیدی مطالعہ کرنے والے ناقدین ادب اور ریسرچ اسکالروں کو ایک روشن نہج فراہم کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے جس کی روشنی میں کام کرکے طارق متین کی شعرگوئی کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ طارق متین کی شعرگوئی کے حوالے سے میرے خیال سے صفدر صاحب کا یہ قول بالکل حق بجانب ہے کہ:

> ''......طارق متین کے یہاں حشو و زوائد اور برائے بیت اشعار بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ اشعار کی بھیڑ لگانے اور قادرالکلامی کے لئے دادِ سخن پانے کی تمنا میں شاعری کو ایک میکانیکی تجربہ بنا دینے میں طارق متین کا کبھی یقین نہیں تھا۔ طارق متین نے اپنی شاعری کو کلاسیکی بنیادوں پر سجایا اور عصری تقاضوں کے زیر اثر اپنی شاعرانہ شخصیت کی شیرازہ بندی کی۔'' (ص:۸۶)

اس کے بعد ''طارق متین کی شعری کائنات'' کے عنوان سے پروفیسر لطف الرحمٰن کا ایک جامع مضمون نظر آتا ہے جس میں انہوں نے طارق متین کی شاعری کے حوالے سے بڑی عمیق اور عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور ان کی شاعری میں کیا ہے، ان کی شاعری کس انداز کی ہے اور اس کی کیا کیا جہتیں روشن ہوتی ہیں، ان کی شاعری کی انفرادیت کیا ہے جس کی وجہ سے وہ شاعری کی دنیا میں

اپنی شناخت رکھتے ہیں، ان تمام امور کے حوالے سے اپنا موقف واضح کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوا یک اقتباس:

''طارق متین انگریزی ادب کے اسکالر رہے ہیں۔ انہوں نے انگریزی جمالیاتی روایت سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا ہے لیکن ترسیل و ابلاغ کی منزلوں میں انہوں نے غزل کی کلاسیکی رچاؤ کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے لفظوں کے استعمال و انتخاب میں ان کے یہاں ایک مخصوص تہذیب کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری فارمولہ، فیشن پرستی یا سکہ بند نئے پن کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ ان کے یہاں روایت و جدت میں ایک معتدل امتزاج ملتا ہے، جس نے ان کو اپنی نسل کا ایک معتبر نمائندہ بنا دیا ہے۔'' (ص: ۳۷)

پروفیسر لطف الرحمٰن کے مضمون کے بعد طارق متین کی شاعری کے حوالے سے جو مضمون ہے وہ ہے پروفیسر علیم اللہ حالی کا۔ اس مضمون میں انہوں نے طارق متین کے کلام کا جائزہ لینے کے لئے پہلے ہی اپنا زاویہ متعین کر لیا ہے اور اسی زاویے کی روشنی میں موصوف نے طارق مین کی غزلوں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو علیم اللہ حالی کا اقتباس:

''آج غزل گویوں کی بھیڑ بھاڑ میں بہت کم ایسی شخصیتیں ملتی ہیں جو غزل کے صحیح تیور سے آشنا ہوں جو میرؔ اور ناصر کاظمی کے تخلیقی تیور کا عرفان رکھتے ہوں، جن کے اشعار تعلق سے زیادہ تاثر پر کے راستے پر آگے بڑھتے ہوں، جن کے اشعار اندرون کی سچائیوں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ طارق متین کی غزلیں پورے طور پر اس معیار کی حامل ہو چکی ہیں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تخلیق کا رخ غزل کی سچی شاعری کی طرف ہے جو ہمیشہ قائم رہتی ہے اور جو غزل کو نا غزل نہیں بننے دیتی۔'' (ص: ۴۷ سے ۵۷)

موصوف نے ان کی غزلوں کا گہرائی سے جائزہ لے کر ان کی غزلوں کی شناخت اور اس میں پوشیدہ شعری و فنی عناصر کو بڑی ہی عالمانہ انداز میں سامنے لاتے ہوئے اس حوالے سے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو طارق متین کو طارق متین بناتی ہیں، نیز ان کی غزلوں میں خواہ داخلی سطح پر یا خارجی سطح پر کس طرح کی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے اور طارق متین ان کیفیات کو اپنی غزلوں کا حصہ بنانے میں کس حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر منظر اعجاز کا بھی ایک مضمون ''مشکِ سخن۔ ایک مطالعہ'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں انہوں نے ان کے مجموعہ ''مشکِ سخن'' میں پیش کئے گئے کلام کا مطالعہ کر کے اس کی روشنی میں طارق متین کی شاعری کے حوالے سے اپنا موقف اور تنقیدی زاویہ پیش کیا ہے جس سے قاری کو بہت کچھ اہم باتیں معلوم

ہوجاتی ہیں اور قاری ''مشک سخن'' میں پیش کئے گئے کلام کی تفہیم کے قریب قریب پہنچنے میں کامیابی حاصل کر پاتا ہے۔ یہ بھی اچھا اور جامع مضمون ہے جس میں طارق متین کی غزلوں میں ان کیا رویہ رہا ہے اپنی باتوں، اپنے خیالات اور تجربات ومشاہدات کو پیش کرنے کا کیا انداز ہے، ان کے یہاں کس طری کی لفظیات کا استعمال کیا گیا جس کی وجہ سے ان کے اشعار معنوی نزاکت اور حسن پیدا ہوا ہے، نیز ان کی غزلیں دوسروں کو کس حد تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، یہ تمام امور بخوبی واضح کئے گئیہیں۔

ایک مضمون اقبال حسن آزاد کا بعنوان ''طارق متین کی شاعری 'قندیل ہنر' کی روشنی میں'' شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون بھی گرچہ بہت طویل نہیں ہے مگر جامع ہے جس میں اقبال حسن آزاد نے ان کی غزلوں کو'' قندیل ہنر'' کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ، ساتھ ہی ان کے کلام کا گہرا مطالعہ پیش کر کے'' قندیل ہنر'' میں پیش کئے گئے کلام کے زاویے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی قاری پر یہ روشن کرنے کی کوشش کی گئی کہ'' قندیل ہنر'' میں جو کلام پیش کئے گئے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں اس کلام سے طارق متین کی کیا شناخت بنتی ہے، انہوں نے اپنی غزلوں میں کیا رنگ وآہنگ اختیار کیا ہے اور ان کی غزلیں ان کے ہم عصروں میں کہاں تک اپنا منفرد اختصاص رکھتی ہیں۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ طارق متین نیا پنی غزلوں میں کیا انداز اختیار کیا ہے، ان کا تیور کیا ہے، وہ کس قدر سادگی کے ساتھ حسین پیرائے میں اپنا کلام پیش کرنے اور سامنے والے کو متاثر کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

''طارق متین کے شعری رویے اور تعین قدر'' ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی کا بہت وقیع مضمون ہے جس میں انہوں نے طارق متین کی غزلوں کے حوالے سے مختلف نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھرپور گفتگو کی ہے جس سے طارق متین کی شاعری کی جہات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہیں، نیز ان کی شاعری کی جمالیات، ان کی شاعری پر کن اکابرین کے اثرات پائے جاتے ہیں، ان کی شاعری کا اسلوب کیا ہے، کسی خیال کو پیش کرنے میں وہ کہاں تک ندرت فن سے کام لیتے ہیں اور کہاں تک اس میں معنویت کا جہان آباد ہوتا ہے، ان کی شاعری میں کیا کیفیت کی فضا پائی جاتی ہے، کہاں تک روایت کی پاسداری ہے اور کہاں تک جدت سے رشتہ ہے۔ اپنے عہد سے کس حد تک ان کی شاعری ہم آہنگ نظر آتی ہے، آج کے عہد کے کیا کیا مسائل پیش کئے گئے ہیں اور کس انداز میں پیش کئے گئے ہیں، نیز ان کی شاعری قاری پر کس طرح اپنا سحر قائم رکھنے میں کامیاب رہتی ہے، ان تمام باتوں کا تفصیلی احاطہ اس مضمون میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''طارق متین نے غزل کو اپنے فکری اظہار کا وسیلہ بنا کر جو تخلیقی نمونے پیش کئے ہیں، وہ نئے شعری احساس اور لب ولہجہ کے ضامن ہیں۔ علاوہ بریں زبان و

بیان پر مکمل گرفت کے ساتھ ہی جس شعری زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے، اس کی جاذبیت اور اثر پذیری قاری کو مسحور کر دینے کے فن اور سلیقے سے مزین ہے۔ تجربات کی پیشکش اور تہذیبی و ثقافتی اشارے جس سلیقے سے طارق متین کے یہاں بروئے کار آتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کے اشعار باطن میں اتر کر جمالیاتی احساس اور کیفیات پیدا کرنے کے وصف سے متصف ہیں۔ (ص ۴۹)

اس کے بعد ڈاکٹر تسلیم عارف کا مضمون ''طارق متین کی غزلیہ شاعری: ایک جائزہ'' ہے۔ یہ مضمون بھی طارق متین کی غزلیہ شاعری کے مطالعے کے حوالے سے اچھے خاصے تجزیاتی مواد پر محیط ہے۔ مضمون میں ڈاکٹر تسلیم عارف نے طارق متین کی غزلوں کا اپنے مخصوص زاویے سے تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان کی غزلوں میں پوشیدہ خواص کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون نگار نے مضمون میں مختلف نہج سے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور قاری کو طارق متین کی شاعری کی مختلف جہتوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی اپنے موقف کے ثبوت میں طارق متین کے کلام سے ڈھیروں اشعار پیش کئے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تسلیم عارف نے طارق متین کی غزلوں کا تنقید جائزہ لینے کے لئے کس قدر گہرائی سے مطالعہ کیا ہوگا۔

ایک مضمون ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کا بھی ہے جو رسالے میں اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے ''طارق متین کی حریت فکر، غزال درد کے آئینے میں''۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے طارق متین کے کلام کا حریتی افکار و نظریات کے حوالے سے مطالعاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون سے جہاں طارق متین کی شاعری میں حریت فکر کے جذبے روشن ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں مضمون نگار کی بے پایاں علمی صلاحیتوں کا بھی اندازہ خوب خوب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے ان کے کلام سے اپنی باتوں کو استحکام بخشنے کے لئے کئی شعری حوالے پیش کیے ہیں جو قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ اخیر میں ذاکر حسین صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

''طارق متین کی شاعری میں حریت فکر کے جذبے اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس جذبے میں آگ ہے، تڑپ ہے، ولولہ ہے، جوش ہے، سرمستی ہے اور ترنگ میں لپٹی ہوئی موجود ہیں۔'' (۱۰۸)

اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور و معروف شاعر و ادیب ظفر کمالی جو رباعیات میں خاصی مہارت رکھتے ہیں، ان کی انیس رباعیاں ہیں جس سے طارق متین کی زندگی، شخصیت اور ان کی خدمات کی جہتیں روشن ہوتی ہیں اور طارق متین کو سمجھنے میں یہ رباعیاں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان رباعیوں کے بعد نمونے کے طو

ر پر طارق متین کی مسلسل کئی غزلیں شامل کی گئی ہیں تا کہ طارق متین کی شعری خدمات کے حوالے سے جو باتیں تنقیدی مضامین میں ناقدین ادب نے کہی ہیں ان میں کہاں تک صداقت ہے قاری پر یہ پوری طرح روز روشن کی طرح واضح ہو جائے اور کلام کے مطالعے کے بعد قاری خود فیصلہ کر لے کہ طارق متین کی شاعری کس نوعیت کی ہے اور ان کی کیا جہتیں ہیں، نیز ان میں کیا چیزیں پیش کی گئی ہیں اور کس انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

یوں تو ''ثالث'' کے اس شمارے میں بھی معمول کی تمام چیزیں شامل اشاعت ہیں اور تمام مشمولات بھی حسب سابق معیاری ہیں، کیونکہ مشمولات کے معاملے میں ''ثالث'' کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا ہے۔اس رسالے کا اپنا شعار رہا ہے کہ جو چیزیں شامل کرتا ہے وہ چھان پھٹک کر شامل کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادبی حلقے میں اس رسالے کا اپنا ایک اہم مقام ہے۔ان میں رشیدہ منصوری کا ''خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری اقبال حسن آزاد کی غزلوں کی روشنی میں''، ڈاکٹر زین رامش کا ''معاصر اردو ادب کا تخلیقی منظرنامہ اور عین تابش''، ڈاکٹر گلاب سنگھ کا ''شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید: ایک مفصل جائزہ''۔اسی طرح مولانا عبداللہ بخاری کا شہرنامہ کے تحت ''مونگیر کا تاریخی وثقافتی منظرنامہ'' یہ تمام مضامین مطالعے تعلق رکھتے ہیں اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی وقیع ہیں اور قارئین کو بہت کچھ معلومات فراہم کراتے ہیں۔اسی طرح شمارے میں شامل افسانے اور کتابوں پر تبصرے بھی بڑے جامع ہیں جس سے ان کتابوں پر قاری کو بہتر معلومات فراہم ہو جاتی ہے ساتھ ہی ان کتابوں کے مصنفین ومولفین کے متعلق بھی وہ تبصرے قاری کو خاصی معلومات عطا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مجموعی طور سے اپنے تمام مشمولات کے باوجود ثالث کا یہ شمارہ ۳۴۔۳۱ گوشۂ طارق متین کے سبب اپنی خاص اہمیت منوانے میں کامیاب ہے کیوں کہ طارق متین کے حوالے سے جو مضامین شامل اشاعت ہیں ان میں طارق متین کی حیات اور ان کی خدمات کے حوالے سے بھرپور روشنی ہی نہیں پڑتی ہے بلکہ ان کی خدمات کو استنادی طور پر سراہا گیا ہے اور اس کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے۔یہ بڑی بات ہے اور یہی اس شمارے کی خصوصیت اور روح ہے۔لہٰذا یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ''ثالث'' کے اس شمارے کو پیش نظر گوشہ کے علاوہ بھی تمام تر مشمولات کے حوالے سے ادبی دنیا میں تادیر یاد رکھا جائے گا اور ادبی حلقے سے اس شمارے کو اس کا واجب حق ضرور مل جائے گا۔اس کے لئے جناب اقبال حسن آزاد اور ان کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔

◀◀ ● ▶▶

● کوثر تسنیم

عہد حاضر کے معروف شعرا میں ایک نمایاں نام طارق متین کا بھی ہے، جنہوں نے اپنے منفرد انداز بیان اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اردو شاعری میں ایک خاص مقام حاصل کیا اور اپنے بہت سارے

ہم عصروں سے پہلے اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ طارق متین ۱۰ جولائی ۱۹۶۸ء میں لکھمنیا (بیگوسرائے) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد متین الدین اور والدہ کا نام شمیمہ خاتون تھا۔ انھوں نے بنیادی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ میٹرک اور آئی اے کے بعد انہوں نے آنرس اور ماسٹرس کی ڈگری انگریزی مضمون میں حاصل کی۔ ۱۵ سال کی عمر سے ہی انھوں نے اشعار کہنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'مشک سخن' منظر عام پر آیا۔ ان کا دوسرا مجموعہ 'قندیل ہنر' ۲۰۰۸ء میں اور تیسرا مجموعہ 'غزالِ درد' ۲۰۱۶ء میں ظہور پذیر ہوا۔ 'ریاضتِ نیم شب' طارق متین کی کلیات ہے جو ۲۰۱۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ۱۹۹۲ء میں انہوں نے لکھمنیا سے ایک رسالہ 'علم وادب' نکالا تھا۔ طارق متین کچھ عرصہ سیاست سے بھی جڑے رہے۔ بہر حال، ان سے دنیائے ادب کی مزید آبیاری ہونی تھی، لیکن محض ۵۷ سال کی عمر میں ۱۷ جنوری ۲۰۲۵ء کو وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات سے اردو ادب اور ان کے چاہنے والوں کو شدید رنج وغم ہوا۔

طارق متین کا شمار موجودہ دور کے قابل ذکر شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے باعث ادبی حلقوں میں ایک نمایاں پہچان بنائی۔ انھیں صرف بہار میں ہی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ ان کے کلام کو ملک و بیرون ملک میں بھی خوب پذیرائی ملی۔ ان کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہمیں زندگی کے مختلف پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں، ان کے یہاں موضوعات کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ عشقیہ موضوعات ہوں یا سماجی وسیاسی مسائل، وہ سبھی کو اپنی شاعری میں انتہائی ہنرمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ طارق متین کی زبان سادہ اور رواں ہے، وہ عموماً مشکل الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں اور آسان الفاظ کے ذریعے اپنے خیال کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ابتدا سے انتہا تک غزل کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کے یہاں غزل محض ایک صنف نہیں بلکہ ان کے اظہار کا بنیادی وسیلہ ہے۔

طارق متین کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے مشہور ادبی رسالہ 'ثالث' بابت نومبر دسمبر ۲۰۲۵ء میں ان کا خصوصی گوشہ شامل کیا گیا ہے۔ 'ثالث' اردو کے ہم عصر رسائل میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ہر شمارے میں بڑی تعداد میں ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ گذشتہ تیرہ برسوں سے یہ رسالہ مسلسل اپنے ادبی سفر کو اعتماد اور وقار کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔ تازہ شمارہ ۳۴-۳۱ میں ۳۰۴ صفحات ہیں، جس کی نمایاں خصوصیت معروف شاعر طارق متین کا خصوصی گوشہ ہے۔ اس میں شامل مضامین طارق متین کی شخصیت اور شاعری کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہیں یادوں کے حوالے سے، کہیں فنی مطالعے کی صورت میں اور کہیں تنقیدی نقطۂ نظر سے طارق متین کے شعری قد وقامت پر گفتگو ہوئی ہے۔ ان مضامین سے قاری کو مرحوم شاعر کا ایک جامع تعارف حاصل ہوتا ہے۔

رسالے کا آغاز مشہور افسانہ نگار اور نقاد، مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد کے اداریے سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ طارق متین کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔اداریے کے بعد طارق متین کا حمدیہ کلام شامل ہے۔

گوشۂ طارق متین کا اصل آغاز 'تسلیم عارف سے طارق متین کی خصوصی گفتگو' سے ہوتا ہے۔ یہ انٹرویو ڈاکٹر تسلیم عارف نے ۲۰۱۲ء میں لیا تھا، جب طارق متین پٹنہ تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر تسلیم عارف نے اس انٹرویو میں پہلے طارق متین سے ان کے خاندان، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی ابتدائی شاعری کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عارف نے ان کے پسندیدہ شعرا و ناقدین کے بارے میں، اور آخر میں موجودہ ادبی صورت حال، خصوصاً شعری منظر نامے پر ان کے تاثرات پیش کیے ہیں۔

اس شمارے میں معروف ادیب و ناقد پروفیسر صفدر امام قادری کی تحریر 'بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغِ آرزو' اور 'ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں' شامل ہیں۔ پہلے مضمون میں پروفیسر صفدر امام قادری نے تین دہائیوں پر مشتمل طارق متین سے وابستہ اپنی یادوں کو قلم بند کیا ہے۔ 'ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں' مضمون میں پروفیسر صفدر امام قادری نے طارق متین کی شاعری کے فکری و فنی پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ ساتھ ہی اشعار کے تجزیے سے طارق متین کی شاعرانہ اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔

'طارق متین کی شعری کائنات' مضمون پروفیسر لطف الرحمٰن مرحوم کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے طارق متین کی شاعری کے فکری پس منظر پر گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون طارق متین کے حوالے سے غالباً ایک دہائی پہلے لکھا گیا ہوگا کیوں کہ لطف الرحمٰن صاحب کی وفات ۲۰۱۳ء میں ہوئی تھی۔

اگلا مضمون 'طارق متین میری نظر میں' میں پروفیسر علیم اللہ حالی نے مختصر مگر مؤثر انداز میں طارق متین کی شاعری کے اہم پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ مضمون 'مشکِ سخن: ایک مطالعہ' میں ڈاکٹر منظر اعجاز مرحوم نے طارق متین کے پہلے شعری مجموعے 'مشکِ سخن' کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے ایسا شعری مجموعہ قرار دیا ہے جس میں قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ اس گوشے میں شامل مضمون 'طارق متین کی شاعری: ''قندیل ہنر'' کی روشنی میں' میں رسالے کے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں:

''شاعری طارق متین کے لیے زندگی بھی ہے اور زندگی کا جواز بھی۔ یہ ان کی شناخت کا وسیلہ بھی ہے اور اظہار کا ذریعہ بھی۔ طارق متین اگر شاعر نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتے۔''

مضمون 'طارق متین کے شعری رویے اور تعین قدر' ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے طارق متین کے شعری پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے اسلوب اور جدیدیت سے متعلق

خیالات پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر تسلیم عارف کا مضمون 'طارق متین کی غزلیہ شاعری: ایک جائزہ' ہے جس میں طارق متین کی غزلوں کا مجموعی مطالعہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی غزلوں میں ہمیں زندگی کے مختلف شیڈس نظر آتے ہیں۔ اس گوشے میں شامل ایک مضمون 'طارق متین کی حریت فکر' ہے، جو ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کی تحریر ہے۔ جیسا کہ عنوان سے معلوم ہوتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے طارق متین کی شاعری میں حریت فکر کے جذبے کو 'غزال درد' کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

اس رسالے میں 'اعتراف' عنوان سے ظفر کمالی کی ۱۹ رباعیات شائع ہوئی ہیں اور طارق متین کی ۲۰ منتخب غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ شمارہ صرف گوشۂ طارق متین تک محدود نہیں ہے بلکہ حسب روایت مختلف موضوعات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس شمارے میں کئی اہم اور دلچسپ مضامین موجود ہیں، جن میں رشیدہ منصوری کا 'خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری...... اقبال حسن آزاد کی غزلوں کی روشنی میں'، ڈاکٹر زین رامش کا 'معاصر اردو ادب کا تخلیقی منظر نامہ اور عین تابش' اور ڈاکٹر گلاب سنگھ کا 'شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید: ایک مفصل جائزہ' شامل ہیں۔ اس شمارے میں مولانا عبداللہ بخاری کا شہر نامہ 'مونگیر کا تاریخی و ثقافتی منظر نامہ' بھی ہے جو اس شمارے کو مزید بامعنی بناتے ہیں۔

مذکورہ بالا تخلیقات کے بعد اس شمارے میں چند افسانوں کا متن اور ان کے تجزیوں کا سلسلہ موجود ہے۔ اس میں شامل پہلا افسانہ اقبال حسن آزاد کا 'مردم گزیدہ' ہے جس کا تجزیہ عشرت ظہیر نے کیا ہے۔ آگے ہمیں عشرت ظہیر کا افسانہ 'بابا جان' بھی پڑھنے کو ملتا ہے جس کا تجزیاتی مطالعہ رشیدہ منصوری نے کیا ہے۔ مرحوم قاسم خورشید کا افسانہ 'اندر آگ ہے' بھی اس شمارے میں شامل ہے، جس کا تجزیہ محمد مرجان علی نے کیا ہے۔ ان سب کے علاوہ تنویر احمد تماپوری کا افسانہ 'جنم دن مبارک' اور ہما فلک کا 'خدا ابابیل نہیں بھیجتا' بھی اس شمارے میں شامل ہیں۔ اس شمارے میں تبصروں کا حصہ بھی موجود ہے جہاں ۲۱ کتابوں پر مختلف اہل قلم نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

طارق متین نے جس طرح بہ عجلت قدرت کے بلاوے پر لبیک کہا، اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے کوئی مستقل کتاب یا رسالے کا خاص شمارہ منظرِ عام پر آئے۔ یہ اچھا ہوا کہ طارق متین کے وطن مونگیر سے ہی اقبال حسن آزاد نے اپنے رسالے کا ایک بھرپور گوشہ شائع کر کے اس جواں مرگ شاعر کے تئیں بہترین خراجِ عقیدت پیش کر دیا ہے۔ یہ گوشہ خلوص، محبت اور اپنائیت سے مرتب ہوا ہے جسے رسالے کے ہر صفحے پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اقبال حسن آزاد نے پوری اردو دنیا کی جانب سے طارق متین کا یہ قرض اتار دیا اور اس خصوصی اشاعت کو ساری دینا میں پھیلا دیا۔ اس گوشے میں

نئے اور پرانے دونوں انداز کے مضامین مل کر طارق متین کی مجموعی خدمات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ رسالہ نئی غزل بالخصوص طارق متین کے سلسلے سے تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا۔

●

● **طارق شبنم (سری نگر، کشمیر)**

گزشتہ دنوں کتابی سلسلہ ''ثالث'' کا تازہ تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سب سے پہلے اس محبت وعنایت کے لئے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد صاحب کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ حق بات یہ ہے کہ مونگیر بہار سے شایع ہونے والا رسالہ ''ثالث'' میرے ان پسندیدہ رسالوں میں شامل ہے جن کا مطالعہ میں وقت کی قلت کے باوجود بڑے شوق سے کرتا ہوں۔ اس شمارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گوشہ طارق متین شامل اشاعت ہے جس میں مرحوم طارق متین کے حالات زندگی اور شاعری کے حوالے سے تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ دور حاضر میں کسی ادبی شخصیت کو اس کے انتقال کے بعد یاد کرنا واقعی لائق ستائش ہے اور ثالث کی پوری ٹیم اس کارنامے کے لئے مبارک باد کی مستحق ہے۔

۳۰۴ صفات پر مشتمل زیر نظر ضخیم شمارے کا آغاز مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد کے تحریر کردہ جاندار اداریے سے ہوتا ہے جس میں آپ نے بڑے دلچسپ انداز میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کو درپیش مسائل کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی ہے اور مرحوم طارق متین کے حوالے سے بھی اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے، آپ لکھتے ہیں۔

> ''ہندوستان میں اردو آج بھی زندہ ہے، اور اس کے زندہ رہنے میں مدارس کا کردار نمایاں ہے، مگر مدارس سے باہر بھی اسے سہارے اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت تعلیمی وثقافتی سطح پر عملی اقدامات کرے اور عوام اردو کو اپنی مشترکہ شناخت کے طور پر اپنائیں تو یہ زبان ایک بار پھر اپنے سنہرے دور کو حاصل کر سکتی ہے۔ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی روح ہے...... جو محبت تہذیب اور انسانی رشتوں کی خوشبو بکھیر دیتی ہے۔''

آگے آپ طارق متین کے بارے میں بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں......

> ''طارق متین ہمارے عہد کے ایک بہترین شاعر تھے۔ اردو فورم مونگیر کے رکن، میرے دوست اور خاصے بے تکلف انسان تھے۔ اکثر بغیر اطلاع آجاتے اور فرمائش کر کے خاطر تواضع کرواتے۔ مجھے بھی ان سے باتیں کرنے میں لطف آتا۔ ذہین آدمی تھے، مگر افسوس کہ ان کی لاابالی طبعیت نے انہیں بہت

جلد شعر و ادب کی دنیا سے دور کر دیا۔ وہ گوشہ نشین ہو گئے اور پھر اسی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی...... ان کے انتقال کے بعد میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی شاعری کے اعتراف میں ثالث میں ان پر ایک بھر پور گوشہ شایع کیا جائے۔ ثالث کو دوبارہ جاری کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ اس گوشہ کی ترتیب میں پروفیسر صفدر امام قادری نے میری خاصی مدد کی ہے، جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔'' (بحوالہ ثالث، جلد نمبر ۱۲ ص......۷)

اداریے کے بعد مرحوم طارق متین کا حمدیہ کلام اور ماہر القادری کی خوبصورت اور راقم کی پسندیدہ نعت شامل اشاعت ہیں۔

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے سلام اس پر کہ اسرار محبت جس نے سکھلائے

اس کے بعد خورشید اکبر اور ارشد عبدالحمید کی خوبصورت غزلیں شمارے کی شان بڑھاتی ہیں جب کہ ''محبت سیکھ لیں'' کے عنوان ڈاکٹر ریشا قمر کی ایک نظم بھی شامل ہے۔

گوشہ طارق متین میں سن ۲۰۱۲ میں طارق متین سے لیا گیا طویل انٹرویو بعنوان ''طارق متین سے تسلیم عارف کی خصوصی گفتگو'' شامل اشاعت ہے۔ جس میں طارق متین کی حالات زندگی اور شاعری کے حوالے سے دلچسپ انداز میں تفصیلی گفتگو ہوئی ہے اس کے علاوہ صفدر امام قادری کا مضمون ''بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغ آرزو'' اور مضمون ''ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں''، ''طارق متین کی شعری کائنات'' پروفیسر لطیف الرحمٰن ، ''طارق متین میری نظر میں'' پروفیسر علیم اللہ حالی، ''مشک سخن ایک مطالعہ'' ڈاکٹر منظر اعجاز ''طارق متین کی شاعری :قندیل ہنر کی روشنی میں'' اقبال حسن آزاد ''طارق متین کے شعری رویے اور تعین قدر'' ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی، ''طارق متین کی غزلیہ شاعری ایک جائزہ'' ڈاکٹر تسلیم عارف، ''طارق متین کی حریت فکر'' ڈاکٹر محمد ذاکر حسین۔ حصہ نظم میں اعتراف کے عنوان سے ظفر کمال کی کچھ رباعیاں بھی شامل ہیں ملاحظہ فرمائیں یہ رباعی......

لہجے میں کتابت ہے کہ وہ خود ہے متین باتوں میں ذہانت ہے بہت ہے وہ ذہین
ہم کیوں نہ کہیں اس کو اماموں کا امین ہونا تھا زمانے میں سرفراز اسے

مرحوم طارق متین کی منتخب غزلیں بھی شمارے کی زینت بڑھا رہی ہیں۔ دیکھئے یہ اشعار......

روح کالی ہے مرے یار تو کالی دنیا ہم نے مانا کہ بہت تم نے اجالی دنیا
دے بھی سکتی ہے ہمیں کیا یہ سوالی دنیا یہی بہتر ہے کہ ہم چھوڑ دیں پیچھا اس کا

طارق متین کی حالات زندگی، شخصیت اور ان کی شاعری کے حوالے سے محنت سے لکھے گئے مضامین پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی انہوں نے دل کے تاروں کو چھیڑنے والے شعر تخلیق کئے ہیں اور قاری کے دل میں نہ صرف بحیثیت ایک شاعر ان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان شاعری کا مطالعہ کرنے کا بھی شوق پیدا ہوتا ہے۔ان کی شاعری کے حوالے سے پروفیسر لطف الرحمان میں لکھتے ہیں۔

''اب وہ فیض ہوں کہ فراق، جمیل مظہری ہوں کہ اجتبیٰ رضوی، جگر ہوں کہ حسرت و فانی، خلیل الرحمان اعظمی ہوں کہ بانی غرض کہ ایک پوری نسل جس نے گزشتہ صدی کے تغزل کی روایت کو نئے آفاق و جہات سے آشنا کرتے ہوئے پوری کمیت و کیفیت کے ساتھ بیسویں صدی کے آخر میں نئی نسل کے حوالے کیا تھا اس پوری نسل سے گہری شناسائی کی جھلک طارق متین کے کلام میں موجود ہیجو ان کے وسیع مطالعے اور حساس تخلیقی ایجاب وقبول اور استخراج وترمیم کی صلاحیت کو روشن کرتی ہے۔'' بحوالہ (ثالث ص۔۔۔۔۱۷)

اسی طرح ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی رقم طراز ہیں......

''طارق متین کے یہاں صوفیا کی طرح بے نیازی کا انداز ملتا ہے۔وہ دنیاوی عیش وعشرت سے بے نیاز اپنی ذات میں درویشانہ صفات رکھتے ہیں۔جو ان کی شخصیت کا اہم پہلو ہے۔''

گوشہ طارق متین کے بعد اس شمارے میں ایک سے بڑھ کر ایک مضامین شامل ہیں جن میں ''خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری......اقبال حسن آزاد کی غزلوں کی روشنی میں'' از رشیدہ منصوری، ''معاصر اردو ادب کا تخلیقی منظر نامہ اور عین تابش'' ڈاکٹر زین رامش، ''شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید: ایک مفصل جائزہ''، ڈاکٹر گلاب سنگھ، اس کے علاوہ مولانا عبداللہ بخاری کا تحریر کردہ مضمون ''مونگیر کا تاریخی و ثقافتی منظر نامہ'' جس میں مونگیر شہر کے تاریخ و تہذیب، ثقافت، علم و ادب، تعلیمی ادارے، مدارس، خانقاہیں، تجارت، نامور سیاسی شخصیات، نامور وکلا اور دیگر شعبوں کے حوالے سے دلچسپ انداز میں بہترین جانکاری فراہم کی ہے۔

مضامین کے بعد چند افسانے اور ان کے بہترین و دلچسپ تجزیے شمارے میں شامل ہیں جن میں اقبال حسن آزاد کا افسانہ ''مردم گزیدہ'' جس کا تجزیہ عشرت ظہیر نے کیا ہے، عشرت ظہیر کا افسانہ ''بابا جان'' تجزیہ رشیدہ منصوری، قاسم خورشید کا افسانہ ''اندر آگ ہے'' تجزیہ محمد مرجان علی۔جب کہ تنویر احمد تما پوری کا افسانہ ''جنم دن مبارک'' اور ہما فلک کا افسانہ ''خدا اب ابابیل نہیں بھیجتا'' بھی شامل اشاعت ہیں۔

افسانوں کے بعد شمارے میں بیسیوں کتابوں پر تبصرے شامل ہیں...... جب کہ۔آخر میں ثالث کے گزشتہ شمارے پر ادبی شخصیات کے تبصرے اور مکتوبات شامل اشاعت ہیں جو نہ صرف اس شمارے کی شان بڑھا رہے ہیں بلکہ ثالث کے گزشتہ شمارے غضنفر نمبر کی شان میں بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

الغرض انتہائی محنت سے ترتیب دیا گیا یہ شمارہ شاندار ہے اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اور ضرور یہ شمارہ اردو ادب میں ایک مثبت اضافہ ثابت ہوگا۔رسالے کے مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد اور ثالث کی پوری ٹیم کو مبارک باد۔

◀◀ ● ▶▶

● **ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی (مغربی بنگال)**

خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان 'ثالث' اپنی اشاعت کا تیرہواں سال مکمل کر چکا ہے۔اس درمیان اس رسالے کے کئی نمبر اور گوشے نکلے جو اپنا نقش ایوان ادب میں چھوڑ گئے۔زیر نظر شمارے میں گوشہ طارق متین شامل ہے جس نے میں کل ۱۱ مضامین ان کی شاعری کی خصوصیات اور زندگی کے شب و روز کا احاطہ کرتے ہیں۔

طارق متین وہ صاحب قلم ہیں جن کے اب تک تین شعری مجموعے مشک سخن،قندیل ہنر اور غزال درد منظر عام پر آ کر سرخ رو ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ ''ریاضت نیم شب'' کے نام سے ان کی کلیات بھی طباعت کے مرحلے سے گزر چکی ہے اور سو غزلوں کا انتخاب بعنوان ''مسافت ہجر'' بھی شائع ہو چکا ہے۔اس طرح ان کا ادبی سرمایہ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ان کی شاعری کے حوالے سے پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی، ڈاکٹر تسلیم عارف، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کے پر مغز مضامین اس گوشے میں شامل ہیں۔ان مضامین میں مذکورہ ناقدانِ ادب کی سنجیدہ و قابل قدر کاوشوں کی قوس قزح پورے آب و تاب کے ساتھ بکھری ہے۔

پروفیسر صفدر امام صاحب نے طارق متین کے شعری سرمایے پر جو معروضی مضمون لکھا ہے وہ متین کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے میں معاون ہے۔اس مضمون میں انہوں نے طارق متین شناسی کے لیے 13 رہنما اصول مرتب کیے ہیں۔یہ اصول دیگر شعراء و ادباء کے فن پاروں کو پرکھنے کے لیے بھی پیمانہ بن سکتے ہیں۔شعراء و ادباء کے ادبی مقام کے تعین میں اگر اس رہنما اصول پر عمل کیا جائے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ذاتی طور پر مجھے یہ مضمون بہت اچھا اور پر مغز لگا۔ساتھ ہی ساتھ ذہن کے پردے پر تمام مضمون نگاروں کے رشحات قلم اپنا اپنا تاثر چھوڑ گئے۔بقول ڈاکٹر محمد ذاکر حسین:

''ان کی زندگی جتنی ناہموار ہے،اس کی شاعری اتنی ہی ہموار ہے۔
اچھی شاعری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ زندگی کی حقیقتوں کو فلسفہ اور منطق کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا جائے اور قاری کو اس پر مجبور کر دیا جائے کہ اس حقیقت کی تلاش میں اس کا ذہن بھٹی بن جائے۔شاعری کا اصل وصف اس کی اثر انگیزی اور ترسیل ہے۔عام فہم اور ہلکے پھلکے انداز میں بھی بات اثر انداز ہوتی ہے۔طارق متین کے شعری مجموعہ ''غزال درد'' کی یہ خوبی ہے۔''ص:۱۰۵

ظفر کمالی نے متین کی شاعری اور شخصیت کو منظوم شکل میں رباعی کے فارم میں 'اعتراف' کے عنوان سے لکھا ہے جو قابل داد ہے۔

باتوں میں ذہانت ہے بہت ہے وہ ذہین — لہجے میں کتابت ہے کہ وہ خود ہے متین
ہونا تھا زمانے میں سرفراز اسے — ہم کیوں نہ کہیں اس کو اماموں کا امین

صفحہ نمبر۱۱۳پر صاحبِ گوشہ کی ۲۰ منتخب غزلوں کا گلدستہ خوشبو بکھیر رہا ہے۔

اقبال حسن آزاد کے خوش فکر اداریہ کے بعد شمارے کا آغاز طارق متین کی حمد سے ہوتا ہے جس میں اس بات کا اعتراف ہے کہ روئے زمیں وفلک سب کے سب اللہ جل شانہ کے دست ہنر میں ہیں جس کی رحمت سے ابر کرم برستا ہے۔المختصر یہ گوشہ طارق متین کو بہترین خراج عقیدت ہے جن کا انتقال بہ رضائے الٰہی گذشتہ سال ۱۶ جنوری ۲۰۲۵ کو ہو گیا تھا۔متین کے یہ اشعار دل کے پار ہوئے:

تخت شاہی کی رعونت کو مری مسندخاک — یوں بھی ہوتا ہے کہ آئینہ دکھا دیتی ہے
ایک قطرہ خوں میں رکھ دیا طوفان غم کا شور — کیسا سکوت اس نے سمندر میں رکھ دیا
زندگی میری کٹی ایک سزا کے مانند — چین سے دنیا میں پل بھر بھی بسر کر نہ سکا
خرد کی آنکھ حیراں ہے،جنوں کی سر بلندی پر — کہ اس کے واسطے جبریل کا پر جاگ اٹھتا ہے
ہم فقیروں کا کوئی کام نہیں اس کے سوا — فاقہ کش ہو کے بھی ہم دیدہ وری میں گم ہیں

صفحہ نمبر۱۲۳ پر رشیدہ منصوری صاحبہ کا مضمون اقبال حسن آزاد کی غزلوں کی روشنی میں ان کے خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری سے روشناس کراتا ہے۔شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید پر ڈاکٹر گلاب سنگھ نے مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔مونگیر کا تاریخی وثقافتی منظر نامہ،قاری کو شہر مونگیر کے روبرو کھڑا کرتا ہے۔افسانے کے گوشے میں مردم گزیدہ (اقبال حسن آزاد)،باباجان (عشرت ظہیر)،اندر آگ ہے (قاسم خورشید)،جنم دن مبارک (تنویر تماپوری)،خدا اب ابابیل نہیں بھیجتا (ہما فلک) شامل ہیں جو اپنے موضوع

کے اعتبار سے پر اثر ہیں۔ ان افسانوں میں فسوں او? رفصاحت کے ساتھ افسانویت اور بیانیے کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ افسانہ 'مردم گزیدہ' 'بابا جان' اور 'اندر آگ ہے' پر خوش فکر تجزیے بھی شامل کئے گئے ہیں جو ان کے ادبی مقام کے تعین میں معاون ہیں۔

ڈاکٹر ریشا قمر کی نظم، خورشید اکبر اور ارشد عبدالحمید کی غزلیں رسالے کے اوراق پر صندل کی خوشبو لٹاتی ہیں۔

اس شمارے میں متفرق کتابوں پر کل ۲۱ تبصرے بھی شامل ہیں جو ان کتب کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہیں، جن سے ان کتابوں کی ادبی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ثالث کے غضنفر نمبر پر ۱۱ر تبصرے کو پڑھ کر ممتاز افسانہ نگار غضنفر صاحب کے فن اور فکر کے علاوہ ان کے ادبی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں ۱۲ر مکتوبات اس روایت کو زندہ رکھنے میں معاون ہیں کہ خط سے آدھی ملاقات ہوتی ہے۔ ادار یہ اردو زبان وادب کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے مسئلے کو پیش کر کے اردو کے سپاہی و سخن شناس گلزار دہلوی کے اس خیال پر مہر ثبت کرتا ہے کہ:

درس اردو زبان دیتا ہوں   اہل ایماں پہ جان دیتا ہوں
میں عجب ہوں امام اردو کا   بت کدے میں اذان دیتا ہوں

● **ڈاکٹر منصور خوشتر (مدیر دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ)**

اردو دنیا میں ثالث کا شمار ان رسائل میں ہوتا ہے جنہوں نے کم وسائل، محدود امکانات اور بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کے باوجود اپنے معیار اور وقار کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ابتدا ہی سے تخلیقی حرارت، فکری پختگی اور تہذیبی شائستگی کا حامل رہا ہے۔ اس کی اشاعت کے پیچھے اقبال حسن آزاد جیسی متوازن، سنجیدہ اور تخلیقی ذہنیت رکھنے والی شخصیت کی دیرینہ محنت ہمیشہ کارفرما رہی ہے۔ وہ نہ صرف ممتاز افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک معتبر ادبی منتظم اور صاحبِ بصیرت مدیر بھی ہیں۔ ان کی سرپرستی میں ثالث نے ادب کے ہر شعبے کو نہ صرف جگہ دی ہے بلکہ نئی نسل کو بھی یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنی آواز کو ایک مستند پلیٹ فارم پر پیش کر سکے۔

اس شمارے کا سب سے بڑا امتیاز طارق متین کے نام سے منسوب گوشہ ہے۔ یہ گوشہ محض ایک شاعر کو خراجِ عقیدت نہیں، بلکہ ایک ایسی آواز کی بازیافت ہے جو وقت کی دھول میں دب کر رہ گئی تھی، مگر جس کی تازگی اور فکری لطافت آج بھی دلوں پر اثر کرتی ہے۔ طارق متین ہمارے عہد کے ان نمائندہ شعرا میں شامل تھے جن کی شاعری میں داخلی کرب، زندگی کا جمال، عصری شعور اور نازک احساسات کی روحانی لطافت نمایاں ہے۔

افسوس کہ ان کی طبیعت کی بے ترتیبی اور دنیا سے کٹ جانے کی کیفیت نے ان کے فن کو وہ

پذیرائی نہ ملنے دی جس کے وہ حقیقی طور پر مستحق تھے۔لیکن ثالث نے اپنے تازہ شمارے میں ان پر جو گوشہ شائع کیا ہے، وہ ایک ادبی احسانِ عظیم سے کم نہیں۔

اقبال حسن آزاد نے اس گوشے کی تیاری میں جس گہرے جذباتی رشتے کا اظہار کیا ہے، وہ اداریے کے ہر لفظ میں جھلکتا ہے۔انہوں نے طارق متین سے اپنی قربت، ان کی محفلوں کی گرمی، اور ان کے اچانک انتقال کے زخم کو نہایت سادگی مگر گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔یہی جذبہ اس گوشے کو ایک تخلیقی روح عطا کرتا ہے۔

گوشے میں شامل مقالات اور تاثرات طارق متین کی شاعری، شخصیت اور فکری جہات کا ایک متوازن اور جامع خاکہ پیش کرتے ہیں۔

☆ پروفیسر صفدر امام قادری صاحب نے ان کے شعری مزاج پر مدلل اور پختہ گفتگو کی ہے۔
☆ مرحوم پروفیسر لطف الرحمٰن نے ان کی شخصیت کے تہذیبی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔
☆ پروفیسر علیم اللہ حالی صاحب نے ان کے اسلوب کی تکنیکی باریکیوں پر روشنی ڈالی ہے۔
☆ مرحوم ڈاکٹر منظر اعجاز نے ان کے فکری رویوں کو "قندیلِ ہنر" کی روشنی میں پرکھا ہے۔
☆ ڈاکٹر شہزادہ نجم برہانی اور ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کے مقالات بھی ان کے شعری سروکار کو گہرائی سے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

یوں یہ گوشہ محض تاثراتی نہیں بلکہ تحقیقی وتنقیدی اعتبار سے بھی ایک مستند ماخذ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اقبال حسن آزاد نہ صرف اس گوشے کی روح ہیں بلکہ پورے رسالے کی فکری سمت بھی انہی کی مرہونِ منت ہے۔انہوں نے اداریے میں اردو کی موجودہ صورتِ حال پر جو گفتگو کی ہے، وہ نہایت فکر انگیز ہے۔اردو کے علمی و تعلیمی پس منظر، نصابی مسائل، سرکاری بے نیازی اور نئی نسل کی زبان سے دوری جیسے پہلوؤں پر ان کی گفتگو نہ صرف حقیقت پسندانہ ہے بلکہ حل کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

ان کی باتوں میں محبوب زبان کے لیے درد بھی ہے اور امید بھی۔

ثالث کے اس شمارے میں شامل ''شہر نامہ'' کے تحت مونگیر کے تاریخی وتہذیبی پس منظر پر شائع شدہ مضمون ادب، تاریخ اور تہذیب کا خوبصورت امتزاج ہے۔اس طرح کی تحریریں رسالے کو محض ادبی نہیں بلکہ تہذیبی کل کا حصہ بنا دیتی ہیں۔

افسانوں، غزلوں، نظموں، رباعیوں، تبصروں اور دیگر اصناف پر مبنی مواد اس شمارے کی ہمہ جہتی کا ثبوت ہے۔ نئے لکھنے والوں کو جس طرح موقع دیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ تحسین ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ثالث نہ صرف روایت کا امین ہے بلکہ نئے تخلیقی ذہنوں کا مربی بھی ہے۔

یہ امر بھی اہم ہے کہ طارق متین کے انتقال کے بعد یہ پہلا باقاعدہ شمارہ ہے جس نے ان کی شاعری، ان کے مزاج، اور ان کی فکری زندگی کو اس وسعت سے سمیٹا ہے۔ گویا ثالث نے ان کے نام ایک ایسا ادبی عہد نامہ پیش کیا ہے جو آنے والے برسوں تک محققین اور قارئین کے لیے رہنما رہے گا۔ ثالث کا یہ شمارہ محض ایک ادبی رسالہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی دستاویز، ایک تخلیقی اعتراف اور ایک ادبی شعور کی زندہ مثال ہے۔ اقبال حسن آزاد کی علمی پختگی، مدیران کی محنت اور معاونین کی سنجیدگی اس شمارے کے ہر صفحے سے جھلکتی ہے۔

یہ شمارہ طارق متین کی یاد میں ایک چراغ ہے جو دیر تک ادب کی فضاؤں کو روشن رکھے گا۔

◄● ►

● **شاذیہ تبسم** (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ)

''ثالث'' اردو ادب کا ایک سنجیدہ، معتبر اور فکری سطح پر فعال ادبی جریدہ ہے جو اپنی فکری سمت، تحقیقی مزاج اور انتخابِ مضامین کے سبب اہلِ ادب میں پہچانا جاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ اس روایت کو نہ صرف برقرار رکھتا ہے بلکہ بعض جہات میں اسے مزید مضبوط کرتا نظر آتا ہے۔

مدیرِ اعزازی اقبال حسن آزاد کی ادارت میں یہ شمارہ فکری توازن، موضوعاتی تنوع اور علمی سنجیدگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ادارت کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ شمارے میں شامل تحریریں محض اظہارِ ذات تک محدود نہیں بلکہ عصری شعور، تنقیدی آگہی اور ادبی ذمہ داری کا احساس بھی رکھتی ہیں۔ رسالے کی ادارت سے وابستہ ٹیم کی محنت انتخاب اور ترتیب میں واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔

حسب دستور رسالے کی ابتدا حمد (طارق متین) اور نعت (ماہر القادری) سے ہوئی ہے۔ خورشید اکبر اور ارشد عبدالحمید کی تازہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ریشا قمر کی ایک نظم پیش کی گئی ہے۔

اس شمارے میں اردو کے جواں مرگ شاعر طارق متین پر ایک بھرپور گوشہ بھی شامل ہے۔ اس گوشے میں کئی اہم لکھنے والوں کی تحریریں شامل ہیں مثلاً پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر تسلیم عارف ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی اور ڈاکٹر محمد ذاکر حسین۔ علاوہ ازیں ظفر کمالی کی رباعیات طارق متین کا ڈاکٹر تسلیم عارف کے ذریعے لیا گیا انٹرویو بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ ساتھ ہی طارق متین کی بیس غزلیں بھی شامل اشاعت ہیں۔

اس گوشے کے علاوہ تین مضامین ایک شہر نامہ دو نئے افسانے اور تین مشہور افسانے مع تجزیہ بھی پیش کیے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس شمارے میں نظم، غزل، افسانہ، تنقید، مضامین، یادیں، انٹرویو اور تبصرے جیسے

اصناف شامل ہیں، جو اس کو ہمہ جہت بناتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ہر صنف میں شامل تحریریں محض خانہ پری نہیں بلکہ فکری و تخلیقی معیار پر پوری اترتی ہیں۔

غزل اور نظم کے حصے میں نئے اور معتبر شعرا کی تخلیقات شامل ہیں۔ غزلوں میں کلاسیکی روایت کی خوشبو کے ساتھ جدید حسیت کی آمیزش نظر آتی ہے، جب کہ نظموں میں موضوعاتی وسعت، علامتی اظہار اور فکری گہرائی قابلِ توجہ ہے۔ شاعری محض جذباتی سطح پر نہیں رکتی بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

افسانوی حصے میں زندگی کے سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی پہلوؤں کو مہارت سے برتا گیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے علامت، بیانیہ اور کردار نگاری کے ذریعے عہدِ حاضر کے مسائل کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ نثر رواں، بامعنی اور فنی شعور سے لبریز ہے۔

یہ شمارہ تنقیدی مضامین کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مضامین میں ادبی نظریات، شخصیات اور متون کا سنجیدہ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ تنقید کا لہجہ متوازن ہے...... نہ حد سے زیادہ مدح سرائی اور نہ ہی غیر ضروری سختی۔ تحقیقی مضامین میں حوالہ جاتی دیانت اور فکری استدلال نمایاں ہے۔

یادوں کے مضامین میں شخصی تاثر کے ساتھ ادبی تاریخ کے بعض گوشے بھی روشن ہوتے ہیں۔ انٹرویو حصے میں سوال و جواب کے ذریعے ادبی فکر اور تخلیقی عمل کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ کتب پر تبصرے مختصر مگر بامقصد ہیں، جو قاری کو کتاب کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہیں۔

مجلّے کی زبان شستہ، معیاری اور ادبی ہے۔ اغلاطِ طباعت نہ ہونے کے برابر ہیں، جو ادارتی محنت کا ثبوت ہے۔ اسلوب میں سنجیدگی، شائستگی اور فکری وقار جھلکتا ہے۔

مجموعی طور پر ''ثالث'' کا یہ شمارہ اردو ادب کے سنجیدہ قاری، طالبِ علم اور محقق کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ یہ شمارہ نہ صرف تخلیقی سطح پر مضبوط ہے بلکہ فکری اور تنقیدی اعتبار سے بھی اپنی جگہ بناتا ہے۔ ایسے دور میں جب ادبی مجلّات کی تعداد تو زیادہ ہے مگر معیار کم ہوتا جا رہا ہے، ثالث ایک خوش آئند استثنا کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ شمارہ اردو ادبی روایت اور جدید فکری تقاضوں کے درمیان ایک مضبوط پل ہے۔ مدیر، معاونین اور تمام قلم کار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک باوقار، معیاری اور دیرپا ادبی دستاویز پیش کی ہے۔

◄● ►

● محمد خورشید اکرم سوز

چند روز قبل اردو کے ممتاز افسانہ نگار، شاعر و ادیب اقبال حسن آزاد کی زیرِ سرپرستی شائع ہونے والا مؤقر اور وقیع کتابی سلسلہ ''ثالث'' موصول ہوا۔ علمی و ادبی حلقوں میں یہ رسالہ پہلے ہی اپنی سنجیدہ روایت، فکری

بالیدگی اور معیاری مشمولات کے باعث ایک معتبر حوالہ بن چکا ہے۔ ''ثالث'' کا یہ تازہ شمارہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ اس میں تقریباً نوّے صفحات پر مشتمل ''گوشۂ طارق متین'' شامل کیا گیا ہے، جس نے اس شمارے کو ایک تاریخی اور فکری دستاویز کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

اس گوشے کا آغاز طارق متین کی روح پرور حمد سے کیا گیا ہے، ان کی بیس منتخب غزلیں بھی اس گوشے میں شامل ہیں۔ یہ انتخاب نہایت سلیقے اور فنی شعور کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، جو طارق متین کے شعری مزاج، فکری وسعت اور تخلیقی گہرائی کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

طارق متین ہمارے عہد کے ان نمائندہ شعرا میں شامل تھے جن کی شاعری میں داخلی کرب، حیاتِ انسانی کا جمال، عصری شعور، فکری اضطراب اور نازک احساسات کی روحانی لطافت نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف فرد کے باطنی تجربات کی ترجمان ہے بلکہ اپنے عہد کے اجتماعی شعور سے بھی گہرا ربط رکھتی ہے۔ ''ثالث'' کا یہ گوشہ طارق متین کو محض ایک رسمی خراجِ تحسین نہیں بلکہ ان کی ادبی خدمات اور تخلیقی مقام کا باوقار اعتراف بھی ہے۔

گوشۂ طارق متین میں شامل تحقیقی و تنقیدی مقالات میں پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر اقبال حسن آزاد، پروفیسر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر تسلیم عارف جیسے معتبر اہلِ قلم نے طارق متین کی شاعری کے فنی، فکری اور شخصی پہلوؤں پر مدلل گفتگو کی ہے۔ ان تحریروں کے ذریعے قاری کو طارق متین کے فن اور شخصیت کی فکری جہات کا ایک جامع اور مربوط خاکہ میسر آتا ہے۔

مزید برآں، طارق متین کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہوئی ڈاکٹر ظفر جمالی کی انیس رباعیات اس گوشے کو ایک منفرد اور یادگار حیثیت عطا کرتی ہیں۔ یہ رباعیات نہ صرف جذباتی وابستگی کا اظہار ہیں بلکہ فنی سطح پر بھی ایک خوشگوار تاثر چھوڑتی ہیں۔

''گوشۂ طارق متین'' کے علاوہ بھی اس شمارے کے تمام مشمولات نہایت قابلِ مطالعہ ہیں بالخصوص مولانا عبداللہ بخاری کا مضمون ''مونگیر کا تاریخی و ثقافتی منظرنامہ'' معلومات، تحقیق اور اسلوب کے اعتبار سے ایک نہایت وقیع اور چشم کشا تحریر ہے۔ اسی طرح افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی فکری سنجیدگی اور تنقیدی بصیرت کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔

رسالہ کے اداریہ میں اردو زبان و ادب کی موجودہ صورتِ حال پر نہایت فکرانگیز اور سنجیدہ گفتگو کی گئی ہے، جو اہلِ قلم کو غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے اور مستقبل کی ادبی سمتوں کی طرف اشارہ بھی فراہم کرتی ہے۔
بجا طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اہلِ ذوق قارئین اس معیاری اور وقیع کتابی سلسلے کی قدر

کریں گے اور ''ثالث'' کے اس شمارے کو اس کی ادبی اہمیت کے مطابق خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

●

● اسلم رحمانی

اردو ادب کے باذوق قارئین، محققین اور سنجیدہ علمی حلقوں کے لیے ایک اہم ادبی اطلاع یہ ہے کہ معروف ادبی و تحقیقی مجلّہ ''ثالث'' کا شمارہ نمبر ۳۱ تا ۳۴ (خصوصی گوشہ: طارق متین) شائع ہو چکا ہے اور بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ میں دستیاب ہے۔ اس اہم اشاعت سے متعلق اطلاع مجلّہ ثالث کے مدیرِ اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے سوشل میڈیا پلیٹ فارم فیس بک کے ذریعے دی ہے، یہ شمارہ اپنی معنوی گہرائی، تحقیقی معیار اور فکری تنوع کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصی گوشہ طارق متین نہ صرف ان کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ معاصر اردو تحقیق میں ان کے مقام و مرتبے کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس گوشے میں شامل مضامین فکری بالیدگی، تنقیدی بصیرت اور تحقیقی استناد کی عمدہ مثال ہیں۔ اس وقیع شمارے میں اردو ادب کے ممتاز اور معتبر قلم کاروں کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں، جن میں ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ظفر کمالی، صفدر امام قادری اور لطف الرحمٰن کے ساتھ ساتھ متعدد دیگر اہلِ قلم کے سنجیدہ اور وقیع مقالات بھی شامل ہیں۔ یہ مضامین اردو ادب کی روایت، جدید رجحانات، فکری مباحث اور تحقیقی امکانات پر گہرے اور مدلل مباحث پیش کرتے ہیں، جو طلبہ، اساتذہ اور محققین کے لیے یکساں طور پر مفید ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ادبی مجلّہ ''ثالث'' ''گزشتہ تیرہ برسوں سے مسلسل علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ مجلّہ شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر، بہار سے شائع ہوتا ہے اور اپنی سنجیدہ ادبی سمت، تحقیقی وقار اور فکری استقلال کی بدولت اردو دنیا میں ایک معتبر شناخت قائم کر چکا ہے۔ مجلّہ کے مدیرِ اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، مدیر ثالث آفاق صالح اور نائب مدیرہ نشاط پروین کی مشترکہ ادبی کاوشوں نے ثالث کو ایک معیاری اور قابلِ اعتماد ادبی پلیٹ فارم بنایا ہے۔ اردو ادب کے قارئین کے لیے یہ بھی اطلاع ہے کہ مجلّہ ثالث کے گزشتہ شمارے کے مطالعے کے لیے اس کی ویب سائٹ (www.salismagazine.in) پر بھی وزٹ کیا جا سکتا ہے۔ مجلّہ کی آن لائن موجودگی نے قارئین اور محققین کو جدید تقاضوں کے مطابق استفادے کا موقع فراہم کیا ہے۔ آخر میں اردو کے تمام سنجیدہ قارئین، اساتذہ، طلبہ اور محققین سے گزارش ہے کہ وہ مجلّہ ثالث کے اس تازہ شمارے کا مطالعہ ضرور کریں، جو نہ صرف تحقیقی معیار کی ایک مضبوط مثال ہے بلکہ معاصر اردو ادب کے فکری منظرنامے کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

●

● ڈاکٹر سیفی سرونچی (مدیر 'انتساب')

''ثالث'' پچھلے بارہ سال سے پابندی کے ساتھ شایع ہورہا ہے۔ہاں! یہ شمارہ ضرور تاخیر سے آیا۔اتنا ضخیم اور معیاری پرچہ نکالنے کے لئے تو ہمت چاہیے۔اول تو اردو والے خرید کرنہیں پڑھتے، دوسرے اتنا معیاری مواد حاصل کرنے کے لیے بھی وقت چاہیے لیکن جب بھی پرچہ آتا ہے قارئین کی تمام تر تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔آجکل معیاری تخلیقات بہت مشکل سے ہی دستیاب ہوتی ہیں۔دوسرے یہ کہ اقبال حسن آزاد چونکہ خود بہت مشہور افسانہ نگار ہیں، وہ تخلیقات کا انتخاب بھی بہت جانچ پرکھ کر شایع کرتے ہیں۔خاص طور سے افسانے بہت خوب ہوتے ہیں۔

تازہ شمارہ مشہور جدید شاعر طارق متین کی شخصیت اور فن پر مشتمل ہے۔طارق متین ایک اچھے اور سنجیدہ شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔وہ رسالہ بھی بہت پیارا نکالتے تھے.....علم وادب۔میری ان سے خط و کتابت بھی تھی۔انتساب میں وہ چھپتے رہے ہیں۔اقبال حسن آزاد نے واقعی طارق متین پر گوشہ نکال کر ایک اہم کام کیا ہے۔تسلیم عارف کا انٹرویو بہت معلوماتی ہے۔حالانکہ کچھ مضامین پرانے ہیں۔صفدر امام قادری، پروفیسر لطف الرحمان،علیم اللہ حالی،منظر اعجاز،اقبال حسن آزاد،شہزاد انجم،اور ذاکر حسین کے مضامین پڑھ کر اور طرق متین کی شاعری پڑھ کر ساری یادیں تازہ ہوگئیں۔ڈاکٹر منصور خوشتر،رونق شہری اور مشتاق احمد کے تبصرے خوب ہیں۔قاسم خورشید،عشرت ظہیر کے افسانوں کے تجزیے کا جواب نہیں۔تبصرے تو سارے ہی اچھے ہیں۔صحیح بات تو یہ ہے کہ ابھی مکمل پڑھا نہیں ہے۔اقبال حسن آزاد صاحب کی ہمت کو مبارکباد دیتا ہوں۔

◀◀ ● ▶▶

'ثالث' کے خصوصی شمارے

☆ **فکشن نمبر**

☆ **عالمی خواتین نمبر**

☆ **شوکت حیات نمبر**

☆ **عالمی افسانہ نمبر**

کے لیے آج ہی ادارے سے رابطہ کریں۔

مکتوبات

- ''ثالث'' دستیاب ہوا تو ایک حیرت انگیز مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے بھی اچانک دھماکہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ آپ چپکے چپکے تیاری کر رہے ہیں۔ آپ کی مشکلات اور بد دلی کا سب کو پتہ ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے سد باب کے لئے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ بہر کیف اس کے سوا اور کیا تمنا کر سکتا ہوں کہ خدا آپ کو بھر پور حوصلہ دے۔ ''ثالث'' نے ادبی رسالوں کی خوفناک کمی کو بہت حد تک دور کیا ہے۔ آپ جس طرح اس پر محنت کرتے ہیں وہ تو اس کے ہر صفحے سے ظاہر ہوتا ہے۔ تازہ شمارے میں تبصروں کا حصہ بہت عمدہ ہے۔ مجھے تقریباً سارے تبصرے معروضی لگے۔ رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگے رہئے، جو آپ کر بھی رہے ہیں۔

عبد الصمد (پٹنہ)

◄◄ ● ►►

- ثالث کا تازہ شمارہ ملا۔ طارق متین کا گوشہ شائع کر کے ایک اہم کام کیا ہے۔ پچھلے نمبروں پر پیش کیے گئے منتخب تاثرات بھی اس شمارے کو وقیع بنا رہے ہیں۔ خدا ثالث کو قائم و دائم رکھے۔ واقعی آپ خوب محنت کرتے ہیں اور جوکھم اٹھانے سے نہیں ڈرتے۔ بہت بہت مبارکباد اور بے حد شکریہ۔ **غضنفر (علیگڑھ)**

◄◄ ● ►►

- عہدِ حاضر میں اردو کے جن ادبی رسائل نے اپنے معیار اور پیشکش کے اعتبار سے قارئین کی پسندیدگی اور پذیرائی کا شرف حاصل کیا ہے ان کی اولین صف میں کتابی سلسلہ ''ثالث'' بھی شامل ہے۔ موضوعات کے انتخاب سے لے کر تخلیق و تنقید کے طریقۂ کار تک ''ثالث'' اپنے آپ میں منفرد نظر آتا ہے۔ ''ثالث'' کے خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے ہیں اور متعدد ادبی شخصیات کے علمی و تنقیدی گوشے بھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ''ثالث'' کا ہر شمارہ ایک خاص اشاعت ہوتا ہے جس میں

تحقیق، تنقید اور تخلیق سے متعلق متنوع تحریروں کو شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔ تازہ شمارے کی بھی یہی صورت حال ہے۔ اس میں معروف شاعر جناب طارق متین کے لیے ایک حصہ مختص کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعری، مضامین، افسانے اور کتابوں پر تبصرے بھی شامل اشاعت ہیں۔ فہرست ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شمارے میں شمولیت کے لیے اردو کے معتبر لکھنے والوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اور ادبی معیار پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔ میں اس قیمتی ادبی تحفے کے لیے جناب اقبال حسن آزاد صاحب کا ممنون ہوں اور ایسے خوبصورت و خوب سیرت رسالے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ **ارشد عبدالحمید (ٹونک)**

◀ ● ▶

- محترم! نئے شمارے کے ساتھ ثالث کی ادبی رمق پہنچانے کے لیے میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ طارق متین صاحب کے انٹرویو کو فوراً پڑھ گیا تھا۔ میں نے ان کے اسم گرامی کے تعلق سے انجان ہی تھا لیکن انٹرویو میں بہت سی باتوں پڑھ کر نئی معلومات سے فیض یاب ہوا اور شاعر کے فکر و فن کے متعلق تفصیلی نقطہ نظر سے بھی آگاہی ہوئی۔ ہر بار اتنا ضخیم نمبر ترتیب دیتے ہوئے ایک معیار کی پاس داری رکھنا ہمیشہ مجھے حیران کرتا رہا ہے اور متاثر بھی۔ علم و تشریح کے نام پر ہونے والے ہنگاموں اور شور کے بیچ آپ کے فکری اور تخلیقی توازن کو ہی اس رسالے کی روح رواں کہا جا سکتا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ **رویندرا جوگلیکر**، **(بھوپال)**

◀ ● ▶

- رسالہ ''ثالث'' شمارہ ۳۱-۳۴ موصول ہوا۔ شکریہ۔ معروف افسانہ نگار اور ادیب و شاعر اوب اقبال حسن آزاد کی ادارت اور ترتیب و تدوین سے مزین اس رسالہ میں حسن سلیقگی اور فکر و انبساط کی مقناطیسیت نمایاں ہے۔ مشمولات کی ابتدا میں طارق متین کی حمد اور ماہر القادری کی مشہور زمانہ نعت شامل ہے:

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

اس شمارہ میں ''گوشۂ طارق متین'' اقبال حسن آزاد کی ادب شناسی اور ادب نوازی

کی گواہ ہے۔اس حصہ میں کل دس مضامین کے علاوہ طارق متین کی منتخب غزلیں بھی شامل اشاعت ہیں۔رشیدہ منصوری کا اقبال حسن آزاد کی غزل گوئی کے تناظر میں تحریر کردہ مضمون ''خیال کے جمال وجلال کی پیغمبری'' میں انوکھے اور موثر انداز سے غزلوں کی ندرت فکر کو اجاگر کیا گیا ہے۔کل پانچ افسانے اس شمارے کی زینت بنے ہیں،جن میں تین افسانوں کے ساتھ ان کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ خورشید اکبر اور ارشد عبدالحمید کی غزلیں اور ڈاکٹر ریشا قمر کی نظم ''محبت سیکھیں'' شعری حصہ کی رونقیں ہیں۔نوے صفحات پر پھیلے ہوئے مختلف اصناف کی کتابوں اور رسالوں کے تبصرے بھی لائق مطالعہ ہیں۔ثالث کا یہ شمارہ ادبی ذوق کی تسکین کا بہترین وسیلہ ہے۔ **عشرت ظہیر (گیا)**

◄ ● ►

- ثالث کا نیا شمارہ کئی روز قبل مل گیا تھا۔ اپنی مصروفیات کے باعث acknowledge کرنے سے قاصر رہے ہم۔ ایک تیز اور سرسری نظر ڈالنے پر بھی آپ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔صرف مشمولات کی فہرست ہی آپ کو سیراب کر دیتی ہے۔اتنے بڑے بڑے نام،اردو کے اتنے سارے لکھاری ایک ہی شمارے میں۔ یہ محترم اقبال حسن آزاد صاحب کا خاصہ ہے۔میگزینوں کے حوالے سے بچپن سے ہی ایک عادت رہی ہے کہ سب سے پہلے فہرست دیکھتے ہیں اور جو عنوان بہ یک نظر ٹھائیں سے دل پر گولی مار دیتا ہے اسکو کسی بھی حال میں فرصت نکال وکال کر پڑھ ہی ڈالتے ہیں۔ثالث کے اس شمارے میں تو ایک نہیں بلکہ کئی ایسے عنوانات تھے جو آنکھوں کے رستے دل میں اتر رہے تھے۔سو صاحب ہم نے کالج کے یومِ بانی کے پروگراموں، ۲۶ جنوری کی تقریبات اور ۲۷ جنوری کے کالج سپورٹس ڈے؛ ان تمام مصروفیات میں سے وقت چرا چرا کر کل سات عنوانات پڑھ ڈالے۔ا۔ گوشۂ طارق متین میں موجود پروفیسر صفدر امام قادری کا مضمون بعنوان ہمارے شعر بھی کچھ مختلف تو ہوتے ہیں ۔۲۔ رشیدہ منصوری کا مضمون بعنوان خیال کے جلال و جمال کی پیغمبری ۔۳۔ قاسم خورشید صاحب کا افسانہ بعنوان اندر آگ ہے۔۴۔ ہما فلک کا افسانہ خدا اب ابابیل نہیں بھیجتا اور

صاحب ہمارے محترم المقام جناب اقبال حسن آزاد صاحب کے تین تبصرے:۵۔ شجرۃ الیقین فی جنت النعیم ۔۶۔قندزقند، قندمکرر، بال کی کھال۔لیکن صاحب جو سب سے غضب کا عنوان تھا وہ تھا۔۷۔غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے۔یقین مانیے صرف عنوان نے ایسی صورت حال پیدا کردی کہ پورے شمارے میں ہم نے سب سے پہلے اسی تبصرے کو پڑھا۔ایسا شاید ہمارے لٹریری ہسٹری کے لگاؤ کی وجہ سے تھا یا شاید اردو کی جو چاروں خانقاہیں ہیں (دہلوی اسکول، دکنی اسکول، لکھنوی اسکول اور عظیم آبادی اسکول) ان سے ہماری عقیدت کی وجہ سے۔ تبصرہ پڑھ کر فخرالدین عارفی صاحب کی کتاب تک پہنچ بنانے کا دل کررہا ہے۔پٹنہ کے لوگ مدد فرماویں؛ ہدیہ تشکّر حاضر رہیگا۔

ڈاکٹر ایس۔ایم۔یحیٰ ابراھیم (جمشید پور)

◀◀ ● ▶▶

- ثالث کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔اس کرم فرمائی کے لئے میں برادرمکرم پروفیسر اقبال حسن آزاد صاحب کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔حسب روایت تمام مشمولات معیاری اور لائق مطالعہ ہیں۔بطور خاص گوشۂ طارق متین کے لئے میں ادارے کا بے حد شکر گزار ہوں کہ منتظمین رسالہ نے طارق متین جیسے جواں مرگ شاعر اور ادب دوست شخصیت کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک بزرگ شاعروں اور ادیبوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔اور اس مطلبی ماحول میں ثالث نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔طارق متین ایک نہایت ہی مخلص انسان کے ساتھ ساتھ خوش فکر اور تازہ کار شاعر تھے۔ان کی شاعری امکانات سے بھرپور تھی۔انھیں ابھی بہت کچھ لکھنا، پڑھنا تھا۔مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔مگر پھر بھی ان کا جو شعری سرمایہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ انھیں اعتبار بخشنے کے لئے کافی ہے۔اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔)

نوشاد احمد کریمی (بتیا)

◀◀ ● ▶▶

- فتح پور کے پتے پر ''ثالث'' کا ۳۱-۳۴واں شمارہ بہت پہلے موصول ہو چکا تھا۔ یہ

شمارہ اس لیے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں میرے دیرینہ رفیق طارق متین پر گوشہ شامل ہے۔ میری طارق متین سے شناسائی اس وقت کی ہے جب بہار اردو اکیڈمی کی دعوت پر منعقدہ کل ہند مشاعرے میں ہم دونوں شریکِ محفل تھے۔ اس زمانے میں طارق متین ایک دبلے پتلے، سادہ مزاج نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ صحت میں خرابی آتی گئی، لیکن شاعری میں نکھار بڑھتا چلا گیا۔ حالیہ برسوں میں اتفاقاً دو مرتبہ پٹنہ میں ملاقات ہوئی۔ صحت کی خرابی کے با وجود وہ بدستور حساس اور بشاش نظر آئے۔ خیر، اب اپنی گفتگو کا رخ ''ثالث'' کی طرف موڑتا ہوں۔ محترم اقبال حسن آزاد نے گوشۂ طارق متین شائع کر کے غزلیہ شاعری کے ایک اہم دستخط کے تئیں اپنی پرخلوص رفاقت کا ثبوت دیا ہے، جو دورِ حاضر میں نایاب تو نہیں، مگر کم یاب ضرور ہے۔ ۳۰۴ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ اپنی پروقار اشاعت اور معیاری طباعت کے اعتبار سے قابلِ داد ہے۔ آج جب کہ ادبی صحافت کاروباری ذہنیت سے آلودہ ہوتی جا رہی ہے، ایسے میں ''ثالث'' کا تسلسل کے ساتھ، اگرچہ وقفے وقفے سے، شائع ہوتے رہنا کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں۔ اس اضطرابی کیفیت کا اظہار مدیر نے اپنے اداریے میں بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''الحمدللہ ثالث کو کوئی مالی دشواری درپیش نہیں، میری ٹیم بھی تندہی سے کام کرتی ہے، لیکن جب جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے تو دل اچاٹ ہو گیا۔ کئی مہینے اسی حال میں گزر گئے۔ مجھے تو وقتی سکون آ گیا، مگر میرے اندر کا صحافی بے قرار رہا۔ آخرکار میں نے پھر سے یاروں کے تیر کھانے کے لیے میدان میں قدم رکھ دیا۔'' کتاب میں شامل تخلیقات کا آغاز طارق متین کی حمد سے ہوتا ہے۔ کیا ہی شستہ اور دھلا دھلا لہجہ ہے! مدیر کے انتخاب کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ گوشۂ طارق متین میں شامل مضامین ان کی شاعرانہ بصیرت پر مضبوط دلالت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تسلیم عارف کا لیا گیا انٹرویو طارق متین کی ہمہ جہت خوبیوں کا کامیاب احاطہ کرتا ہے۔ مصاحبہ کرنے والے کے یہاں تجسس اور کرید کی حس نے کئی مخفی گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ دیگر عنوانات کے تحت شعر و نثر کی معیاری تخلیقات حسبِ سابق موجود ہیں۔ خورشید اکبر اور ارشد عبدالحمید کو ایک ہی شمارے میں پڑھنا ایک

نئے تخلیقی تجربے سے گزرنے کے مترادف ہے۔خیال کے جلال و جمال کی یہ ہم آہنگی اپنی مثال آپ ہے۔ **ڈاکٹر رونق شہری (دھنباد)**

◄ ● ►

- مجھے پہلی بار ثالث کا شمارہ بذریعہ ڈاک موصول ہوا...... شکریہ...... جو تاثرات فخر الدین عارفی صاحب نے بیان کیا ہے میں بھی صد فی صد ان سے متفق ہوں۔ آپ کا دل بھی پروفیسر جابر حسین سے ملتا ہے۔انہوں نے بھی اپنا رسالہ ''دوآبا'' بند کرنیکا ارادہ کرلیا تھا لیکن کسی نا کسی وجہ سے اپنے ذوق کی تسکین کیلئے اسے دوبارہ جاری کردیا اسی طرح آپ نے ثالث کو جاری رکھتے ہوئے گوشہ طارق متین پیش کر کے اردو فورم مونگیر کے رکن، اپنے دوست اور شہرت یافتہ شاعر کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ **اسحاق اثر (پٹنہ)**

◄ ● ►

- 'ثالث' کا تازہ و مشترکہ شمارہ نمبر ۳۱ سے ۳۴ بابت جون ۲۰۲۴ تا جولائی ۲۰۲۵ میرے سامنے ہے۔سرورق پر طارق متین کی تصویر دیکھ کر جی بھر آیا۔میں انہیں انکی ادبی شناخت کی وجہ سے تو جانتا ہی تھا، ۲۰۰۷ سے ۲۰۱۰ تک بیگوسرائے میں ڈی۔ایس۔پی کے عہدے پر فائز رہنے کی وجہ سے ان کی قرابتیں بھی ملیں۔انہوں نے اپنے گاؤں لکھمنیا میں ایک شاندار مشاعرہ برپا کیا تھا جس میں شرکت کا موقع مجھے بھی ملا تھا۔موصوف کی اخلاق مندی کا میں آج بھی قائل ہوں۔شاعری میں ان کا مقام ثابت شدہ ہے۔ایسی شخصیت پر اتنا وقیع گوشہ مرتب کر کے آپ نے قدردانی کی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے۔آج جب کہ ہر کس و ناکس انا پرستی میں محو ہے، کسی ہم عصر فنکار کو یاد کرنا بہت بڑی بات ہے۔کہتے ہیں اردو والے آنکھ بند ہوتے ہی سامنے والے کو بھلانے میں لگ جاتے ہیں۔اس کتابی سلسلے میں آپ نے موصوف کے کارناموں کو محفوظ کر کے اعلا ادبی صحافت کا حق ادا کر دیا ہے۔ صاحبِ گوشہ کی شخصیت اور ان کے فن پر عمدہ مضامین حاصل کرنے کی دوران قلم کاروں کا تعاون حاصل کرنے میں آپ کو خاصہ وقت لگا ہوگا۔مضمون نگار حضرات نے بھی حقیقت پسندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہترین مضامین رقم کیے ہیں جن کے

مطالعہ سے موصوف کی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔قارئین یقیناً مستفید ہوں گے۔

دیگر مضامین کی بات کریں تو عین تابش کی شاعری کے حوالے سے لکھا گیا ڈاکٹر زین رامش کا مضمون تنقیدی نوعیت کا ہے جو کافی محنت سے لکھا گیا ہے۔محترمہ رشیدہ منصوری نے اقبال حسن آزاد کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کو اجاگر کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے۔ڈاکٹر گلاب سنگھ نے شکیل الرحمٰن کی جمالیات پر بھرپور مضمون تحریر کیا ہے جو موصوف پر لکھے گئے صدہا مضامین کے تسلسل میں ہے۔یوں تو سبھی افسانے منتخب ہیں لیکن مردم گزیدہ نے واقعی متاثر کیا۔ہر روز نظر کے سامنے آنے والے واقعہ کو اس طرح افسانہ بنایا جا سکتا ہے، یہ فنکاری پر دال ہے۔کتوں کے بیچ گھرے آدمی کی نفسیات، اس صورتِ حال میں کتوں کی نفسیات اور پھر پڑھتے وقت قاری کی نفسیات، سب اس طرح الگ الگ سطح پر کام کرتی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل معلوم پڑتا ہے کہ کون سگ گزیدہ ہونے والا ہے اور کس کے مردم گزیدہ ہونے کے امکانات ہیں۔اس شش و پنج سے افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے افسانے کو باہر نکال کر قاری کو راحت دی ہے۔تنویر احمد تماپوری ہمیشہ کی طرح لیکھ سے ہٹ کر کچھ پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔اقبال حسن آزاد نے دس تبصرے لکھے ہیں۔فن اور فن کار کا مختصر تعارف عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد، منصور خوشتر، رونق شہری، بینام گیلانی اور محترمہ فصیحی کے لکھے تبصرے بھی بیش قیمت ہیں۔گلستانِ ادب پر ناچیز کے تبصرے کو بھی الگ عنوان کے تحت شایع کیا گیا ہے۔شکر گزار ہوں۔

یہ شمارہ اجمالی طور پر وقیع ہے جسے پکی جلد میں محفوظ کر کے رکھے جانے کی امید کرتا ہوں۔توقع ہے کہ آپ اسی جنون سے اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں گے اور نئے جھنڈے گاڑیں گے۔

مرغوب اثر فاطمی (گیا)

◀ ● ▶

- کتابی سلسلہ ''ثالث'' کا تازہ شمارہ ایک دلکش ادبی دستاویز ہے، جس میں طارق متین کی شاعری اور زندگی کے حوالے سے تفصیلی مضامین شامل ہیں۔شمارے کا آغاز مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے جاندار اداریے سے ہوتا ہے، جس

میں اردو زبان کی اہمیت اور طارق متین کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ گوشہ طارق متین میں شامل مضامین طارق متین کی شاعری اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے:

میری خانہ خرابی میں ہے میرا عشق روشن — سو اپنے آپ کو برباد رکھنا چاہتا ہوں
مجھے وحشت نے وہ اعجاز بخشا ہے کہ خود کو — در و دیوار سے آزاد رکھنا چاہتا ہوں

شمارے میں شامل افسانے اور مضامین بھی اپنی جگہ دلچسپ ہیں۔ ثالث کی پوری ٹیم کو مبارک باد۔ یہ شمارہ اردو ادب میں ایک مثبت اضافہ ثابت ہوگا۔

طارق شبنم (شری نگر)

●

● ڈاکٹر اقبال حسن آزاد صاحب نے کچھ عرصہ قبل یہ خوش خبری دی تھی کہ ثالث دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔ اس موقر اور معیاری ادبی رسالے کی اشاعتِ نو کی خبر ہی دل کو مسرّت سے بھر دینے کے لیے کافی تھی کہ اس شمارے کی فہرست میں اپنی نظم کا عنوان نظر آ گیا جس سے میری خوشی دوبالا ہو گئی۔ خوشی میں مزید اضافہ ہو گیا جب مکتوبات کے حصے میں اپنا پیغام بھی نظر آیا، نیز قلم کاروں کی فہرست میں اپنی تصویر دیکھی، تو یہ لمحہ میرے لیے مزید مسرّت کا باعث بن گیا۔ اقبال حسن آزاد صاحب نہ صرف ایک متحرک اور فعال قلم کار ہیں بلکہ ان کی شخصیت بھی اسی جوش و جذبے کی آئینہ دار ہے۔ اکثر احباب سے یہ بات سننے میں آتی ہے کہ گوشے یا خصوصی نمبر شائع کرنے کے لیے مدیران مالی تعاون چاہتے ہیں، مگر اقبال حسن آزاد صاحب نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ حالیہ عرصے میں ثالث کے جو شمارے شائع ہوئے ہیں۔ خواہ غضنفر سر پر شائع ہونے والا ضخیم نمبر ہو، شوکت حیات پر خصوصی اشاعت ہو یا اب طارق متین پر شائع کیا گیا گوشہ۔ یہ سب اس بات کا روشن ثبوت ہیں کہ وہ خالصتاً اردو زبان و ادب سے محبت کے جذبے کے تحت قلم کاروں کے وقار اور مقام میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ خدمتِ ادب دراصل خراجِ تحسین اور خراجِ عقیدت کی وہ صورت ہے جس سے بہتر مثال مشکل ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اقبال حسن آزاد

صاحب کو مزید حوصلہ، استقامت اور توانائی عطا فرمائے اور ثالث کو ترقی، دوام اور قبولِ عام سے ہم کنار فرمائے۔ میرے قلم کو بھی اعتبار بخشنے، میری تخلیقات کو ثالث جیسے معتبر ادبی رسالے میں شائع کرنے پر شکرگزار ہوں۔ یہ اعتماد میرے لیے باعثِ افتخار بھی ہے اور مزید بہتر لکھنے کی تحریک بھی۔ بہت شکریہ۔

ڈاکٹر رمیشا قمر (گلبرگہ)

◆ ● ◆

- ثالث کا تازہ شمارہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ دل کی گہرائیوں سے شکریہ۔ خصوصی طور پر ناچیز کے حوالے سے ڈاکٹر زین رامش کے مضمون کی اشاعت کے لئے آپ دونوں کا بیحد ممنون و مشکور ہوں۔

یہ شمارہ گوشۂ طارق متین کی شمولیت کے سبب تخصیص کے ساتھ پرکشش اور قابل مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ آئندہ کسی شمارے کو راشد طراز کے لئے بھی مختص کیا جائے گا۔ ایک بار پھر بہت شکریہ۔ والسلام **عین تابش (گیا)**

◆ ● ◆

- سہ ماہی ''ثالث'' مونگیر کا تازہ شمارہ جلد نمبر ۱۲، شمارہ ۳۴۔۳۱ فی الوقت میرے پیش نظر ہے۔ پروفیسر اقبال حسن آزاد، ثالث آفاق صالح اور نشاط پروین کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ رسالہ ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس شمارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس شمارے میں مرحوم طارق متین پر ایک خصوصی گوشہ بھی اس میں شامل ہے، یہ گوشہ کافی اہم ہے اور اس میں طارق متین کے تعلق سے سیر حاصل مواد شامل کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں طارق متین کی ایک حمد پاک صفحہ نمبر ۸ پر شریک اشاعت ہے۔ اس کے بعد گوشۂ طارق متین میں سب سے پہلے ڈاکٹر تسلیم عارف کا طارق متین سے لیا گیا ایک انٹرویو شامل اشاعت ہے جو ان کی زندگی میں ۲۰۱۲ء میں لیا گیا تھا جب وہ پٹنہ میں مقیم ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ صفدر امام قادری کا ایک تاثراتی مضمون ''یادیں'' کے کالم میں شامل ہے۔ عنوان ہے ''بجھتے بجھتے بجھ گیا طارق چراغ آرزو'' اس مضمون کے بعد طارق متین کے تعلق سے پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر منظر اعجاز، اقبال حسن

آزاد، ڈاکٹر شہزاد انجم برہانی، ڈاکٹر تسلیم عارف، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین اور پروفیسر صفدر امام قادری کا مزید ایک مضمون شامل ہے۔ ان کے علاوہ ظفر کمالی کی چند رباعیاں شامل ہیں، جن میں ''اعتراف'' کے عنوان سے مرحوم طارق متین کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازآں ادارے کی جانب سے طارق متین کی بیس منتخب غزلیں شائع کی گئیں ہیں۔

اپنے اداریہ میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے بہت درد کے ساتھ رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں تعطل کا قصّہ بیان کیا ہے اور انتہاء عقیدت ومحبت کے ساتھ طارق متین کے سلسلے میں خاص گوشہ کی اشاعت کا جواز پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اندر کے اس صحافی کے دوبارہ بیدار ہونے کا بھی قصّہ بیان کیا ہے جو کسی وجہ سے کچھ وقت کے لیے سو گیا تھا۔ **فخر الدین عارفی**، (**پٹنہ**)

◄◄ ● ►►

اقبال حسن آزاد

کی

تنقیدی کتاب

نثری اصناف ادب

اور طنز و مزاح کی روایت

منظرِ عام پر

ثالث کے منتخب افسانے

۱۔ جیرے کی روانگی	علی اکبر ناطق (پاکستان)	ثالث،شمارہ نمبر-۱
۲۔پانچ روپے کا متروک نوٹ	محمد حامد سراج (پاکستان)	ثالث،شمارہ نمبر-۱
۳۔پکڑ	وحید احمد قمر (جرمنی)	ثالث،شمارہ نمبر-۱
۴۔شبانہ کا شوہر	نورالعین ساحرہ (USA)	ثالث،شمارہ نمبر-۱
۵۔یوڈیم سالا	نعیم بیگ (پاکستان)	ثالث،شمارہ نمبر-۱
۶۔ڈھکنے	اقبال حسن خان (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۷۔تین انچ کا سورما	قاضی طاہر حیدر (USA)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۸۔آٹھواں سمندر	قرب عباس (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۹۔افواہ	ابرار مجیب (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۱۰۔بے درماں	سلمیٰ جیلانی (نیوزی لینڈ)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۱۱۔بوڑھا اور سمندر	طلعت زہرا (کناڈا)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۱۲۔گڑ کی ڈلی	امین صدرالدین بھایانی (USA)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۱۳۔کھیل	فرحین جمال (بیلجیم)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۱۴۔انجام کار	نوشابہ خاتون (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۲
۱۵۔الہ دین کی چارپائی	علی اکبر ناطق (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۱۶۔ابوپاری	ڈاکٹر نگہت نسیم (آسٹریلیا)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۱۷۔کہنی کی چوٹ	دلشاد نسیم (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۱۸۔مامتا	وحید قمر (جرمنی)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۱۹۔نرتکی	شاہین کاظمی (سوئٹزرلینڈ)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۲۰۔سانپ	نورالعین ساحرہ (USA)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۲۱۔یاجوج ماجوج	ڈاکٹر افشاں ملک (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۲۲۔کینچوا	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۳

۲۳۔طاہرہ سنو	سیمیں کرن (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۳
۲۴۔ہماری کہانی کا ثانوی کردار	ابن آس محمد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۲۵۔امتیاز	عامر ابراہیم (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۲۶۔شرط	طلعت زہرا (کناڈا)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۲۷۔ہارمون	قمر سبزواری (دبئی)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۲۸۔لی شوئی کی گلیوں میں	سلمیٰ جیلانی (نیوزی لینڈ)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۲۹۔گڑیا	ارشد علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۳۰۔کمینی	غزالہ پرویز (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۴
۳۱۔مارگزیدہ	محمد حامد سراج (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۲۔آواز سے بچھڑی ہوئی چیخ	یوسف عزیز زاہد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۳۔ڈولی	پیغام آفاقی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۴۔ڈیپارچر لاؤنج	نعیم بیگ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۵۔جہاں سے سلسلہ ٹوٹا	انجم قدوائی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۶۔برف کی عورت	شاہین کاظمی (سوئٹزرلینڈ)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۷۔کشمکش	نسترن احسن فتیحی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۸۔پتلیاں	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۳۹۔خلا	امین بھایانی (USA)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۴۰۔مٹھی بھر مٹی	الیاس دانش (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۴۱۔بارش کے لیے دعا	محمد جمیل اختر (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۵
۴۲۔آدھا عشق	ممتاز رفیق (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۶
۴۳۔آلو قیمہ	ڈاکٹر نگہت نسیم (آسٹریلیا)	ثالث شمارہ نمبر-۶
۴۴۔کیمیا	م۔ص۔ایمن (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۶
۴۵۔انکاؤنٹر	محمد علم اللہ (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۶
۴۶۔گشتی	معظم شاہ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۷
۴۷۔بددعا کرنے والے	سلیم سرفراز (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۷

۴۸۔ چھام چھاپ	سیمیں درانی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۷
۴۹۔ ہے تو یہیں کہیں	ثمینہ سید (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۷
۵۰۔ تحفہ	عتیق رحمان (شارجہ)	ثالث شمارہ نمبر-۸
۵۱۔ کچھ حقیقت کچھ فسانہ۔	عطاءالرحمان خاکی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۸
۵۲۔ غریب آباد	سید کامی شاہ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۸
۵۳۔ گرہن گاتھا	فارحہ ارشد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۸

فکشن نمبر

۵۴۔ سفرنامہ حیرت آباد	حسین الحق (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۵۵۔ سولہ کا پہاڑا	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۵۶۔ ہوم لیس	قمر سبزواری (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۵۷۔ نوحہ گر	فیصل سعید (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۵۸۔ دی لاسٹ کس	ھما فلک (جرمنی)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۵۹۔ برگد	جاوید انور (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۰۔ اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے	فارحہ ارشد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۱۔ ایک جنگ اور	شاہد جمیل (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۲۔ انو	صفدر امام قادری (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۳۔ کھڑکیاں کھول دو	مہ جبیں آصف (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۴۔ گورغریباں	ڈاکٹر افشاں ملک (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۵۔ کال بیلیا	نسترن احسن فتیحی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۹-۱۰
۶۶۔ ساز زندگی	قیصر نذیر خاور (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۶۷۔ ان ٹیوشن	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۶۸۔ وہ ایک لمحہ	شمسہ نجم (یو۔ایس۔اے)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۶۹۔ فصیل ذات	اسماء حسن (ہانگ کانگ)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۷۰۔ نصیب کی بات	خالد قیوم تنولی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۷۱۔ فیتا	خاقان ساجد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱

۷۲۔محبت بھی بدلتی ہے	عشرت ظہیر(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۷۳۔بدن میں ڈھلا چاند	جوادحسنین بشر(پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۷۴۔ایک الجھی ہوئی کہانی	محمد جمیل اختر(پاکستان)	ثالث،شمارہ نمبر-۱۱
۷۵۔قلی گاڑی	اویناش امن(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۱
۷۶۔آخری گجرا	محمد جاوید انور(پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۲
۷۷۔اندمال	ناصر بغدادی(کنیڈا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۲
۷۸۔لہرلہر سمندر	نجمہ محمود(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۲
۷۹۔چڑیاں	محمد الیاس گوندل(پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۲
۸۰۔آشرواد	احمد عرفان(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۲
۸۱۔ریپ سنسکرتی	شموئل احمد(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۳
۸۲۔سوٹھا	معظم شاہ(پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۳
۸۳۔دروپدی جاگ اٹھی	رینو بہل(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۳
۸۴۔جادوگر	اقبال حسن آزاد(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۳
۸۵۔ناگہانی	حسین الحق(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
۸۶۔پلاسٹک کے ببوئے	فرحین جمال(بیلجیئم)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
۸۷۔دا۔جی	گل ارباب(پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
۸۸۔ایک مزدور کی موت	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
۸۹۔اپنا شہر	بلال مختار(آسٹیریا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
۹۰۔بھیڑیے	نیاز اختر(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
۹۱۔کیا بھروسہ ہے زندگانی کا	نشاط پروین(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۴
(عالمی خواتین نمبر)		
۹۲۔خلا	نیلم احمد بشیر(پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۹۳۔یہ عجیب عورتیں	نسترن احسن فتیحی(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۹۴۔بوڑھی پڑوسن کا موبائل	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۹۵۔دونینان	رینو بہل(انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶

۹۶۔گنگا بہتی کیوں ہو؟	انجم قدوائی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۹۷۔فاتح عالم	قمر جمالی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۹۸۔محبوبہ	ثمینہ سید (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۹۹۔بے بی اماں	فریدہ انصاری (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۰۔رشتوں کی دیمک	سلمیٰ جیلانی (نیوزی لینڈ)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۱۔سیلمون فش	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۲۔پیار، پیاز اور پیلا ربن	شاہین کاظمی (سوئٹزر لینڈ)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۳۔آدھی خودکشی	فارحہ ارشد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۴۔زرمینے	ھما فلک (جرمنی)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۵۔طوائف کہانی	موناشہزاد (البرٹا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۶۔ادھوری عورت	گل ارباب (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۷۔اعتراف	قرۃ العین حیدر راٹھور (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۸۔انجام	فرحین جمال (بیلجیئم)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۰۹۔پانچویں بوتل	صائمہ نفیس (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۰۔پکھیرو	نوشابہ خاتون (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۱۔اشواسن	سرفراز جہاں (یو۔ایس۔اے)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۲۔نیلا پردہ گلابی کناری	صفیہ شاہد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۳۔خصوصی اجازت نامہ	روبینہ فیصل (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۴۔واپسی	نشاط پروین (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۵۔شکستہ خواب	فرحین خالد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۶۔مایا	ناہید طاہر (ریاض)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۷۔زرد خواب	صوفیہ کاشف (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۸۔گڑیا میلی ہو جائے گی	صبیحہ تزئین (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۱۹۔قلاش	فرزانہ روحی اسلم (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶
۱۲۰۔زخمی پرندہ	شوبی زہرا نقوی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۱۵-۱۶

۱۲۱۔ دوبوری عزت	ابصار فاطمہ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۱۵–۱۶
۱۲۲۔ بیم ورجا	فاطمہ عثمان زاہد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۱۵–۱۶
۱۲۳۔ وائرس	تنویر احمد تماپوری (ریاض، سعودی عرب)	ثالث شمارہ نمبر–۱۷
۱۲۴۔ کھڑکی میں اگا وجود	زویا حسن (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۱۷
۱۲۵۔ رفاقت	آسیہ رئیس خان (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۷
۱۲۶۔ سوروپے کا نوٹ	تاج الدین محمد (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۷
۱۲۷۔ شور	نشاط پروین (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۷
۱۲۸۔ یوسا	خاقان ساجد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۱۸
۱۲۹۔ مداوا نہیں کوئی	خالد قیوم تنولی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۱۸
۱۳۰۔ کپاس کا کتا	ربیعہ سلیم (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۱۸
۱۳۱۔ سمندر پر جھاگ	ڈاکٹر صوفیہ شیریں (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۸
۱۳۲۔ مور کے آنسو	شموئل احمد (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۹
۱۳۳۔ پنجڑا	سلیم سرفراز (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۹
۱۳۴۔ گرگٹ	ڈاکٹر شاہد جمیل (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۱۹
۱۳۵۔ کٹوا	شموئل احمد (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰
۱۳۶۔ محبت ایک عام واقعہ	شاکر انور (شارجہ)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰
۱۳۷۔ چنبے دی بوٹی	شاہین کاظمی (سوئٹزرلینڈ)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰
۱۳۸۔ حکایت در حکایت	اقبال حسن آزاد (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰
۱۳۹۔ بارگاہ خداوندی	قرب عباس (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰
۱۴۰۔ میلی عورت	ڈاکٹر شکیل احمد خان (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰
۱۴۱۔ خلا	نوشابہ خاتون (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر–۲۰

عالمی افسانہ نمبر

۱۴۲۔ بار زیست	محمد جاوید انور (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳–۲۶
۱۴۳۔ تازہ ہوا کے شور میں	حسن امام (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳–۲۶
۱۴۴۔ کووڈ کے ماتم دار	ذکیہ مشہدی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳–۲۶

۱۴۵۔ادھورے	ھما فلک (جرمنی)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۴۶۔کھیپ	شاہین کاظمی (سوئٹزرلینڈ)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۴۷۔رکشہ والا	اقبال حسن آزاد (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۴۸۔افسانہ ہائے خواب	سید کامی شاہ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۴۹۔سرنگ کے راستے	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۰۔اندھیرے میں	دلشاد نسیم (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۱۔ایک دوپہر	شاکر انور (شارجہ)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۲۔تم	احسان قاسمی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۳۔درپردہ	عشرت ظہیر (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۴۔عکس برعکس	شفقت محمود (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۵۔مقدس سکہ	شاہد محمود (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۶۔تحفوں کی تھیلی	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۷۔سرنگ کی دوسری طرف	کوثر جمال (بیلجیئم)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۸۔دنانیر بلوچ	فارحہ ارشد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۵۹۔تعویذ	م۔ص۔ایمن (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۰۔ریختہ	ریحان کوثر (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۱۔نیلوفر، ایفر ووتی اور ایک خواب	معظم شاہ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۲۔مجھے گھر نہیں جانا	سارا احمد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۳۔مٹی کی چڑیاں	شہریار قاضی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۴۔خسارہ	سلیم سرفراز (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۵۔دو پیاسے	رفیع حیدر انجم (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۶۔ڈیٹینشن کیمپ	مقصود حسن (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۷۔باغی	گل ارباب (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۸۔بندھن کا بوجھ	ثمینہ سید (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶
۱۶۹۔درد جب حد سے گزرتا ہے	اقبال مٹ (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر ۲۳-۲۶

۱۷۰۔ بڑے گھر کی بہو	نشاط پروین (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۱۔ گمشدہ آوازوں کا تعاقب	زویا حسن (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۲۔ لاش نامہ	رویندر جوگلیکر (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۳۔ سونے کا پیالہ	طارق شبنم (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۴۔ بلورین	راجہ یوسف (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۵۔ یوٹوپیا	امین کنجاہی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۶۔ ٹائم ٹیبل	آسیہ رئیس خان (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۷۔ فریب	نعیم یاد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر۲۳-۲۶
۱۷۸۔ ہونہہ، مسلمان	ڈاکٹر منظر اعجاز (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۲۷
۱۷۹۔ عورت کا نشہ	اقبال حسن آزاد (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۲۷
۱۸۰۔ پاگل	عطاءاللہ عالی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۲۷
۱۸۱۔ قبلہ رخ	بش احمد (آسٹریلیا)	ثالث شمارہ نمبر-۲۷
۱۸۲۔ آخری خواہش	نجمہ ثاقب (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر-۲۷
۱۸۳۔ ایک جھوٹی کہانی	محمد یحییٰ ابراہیم (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر-۲۷
۱۸۴۔ جنم دن مبارک	تنویر احمد تماپوری (ریاض، سعودی)	ثالث شمارہ نمبر۳۱-۳۴
۱۸۵۔ خدا اب ابابیل نہیں بھیجتا	ھما فلک (جرمنی)	ثالث شمارہ نمبر۳۱-۳۴
۱۸۶۔ بے چہرگی کا نوحہ	یوسف عزیز زاہد (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر۳۵-۳۸
۱۸۷۔ نیم کے سائے میں	خالدہ نسیم (کینیڈا)	ثالث شمارہ نمبر۳۵-۳۸
۱۸۸۔ دھن پریت ساڈے	سبین علی (پاکستان)	ثالث شمارہ نمبر۳۵-۳۸
۱۸۹۔ سپریم لیڈر کا جوتا	اشعر نجمی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۳۵-۳۸
۱۹۰۔ عبرت سرا	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی (انڈیا)	ثالث شمارہ نمبر۳۵-۳۸
۱۹۱۔ آخری امید	نشاط پروین	ثالث شمارہ نمبر۳۵-۳۸